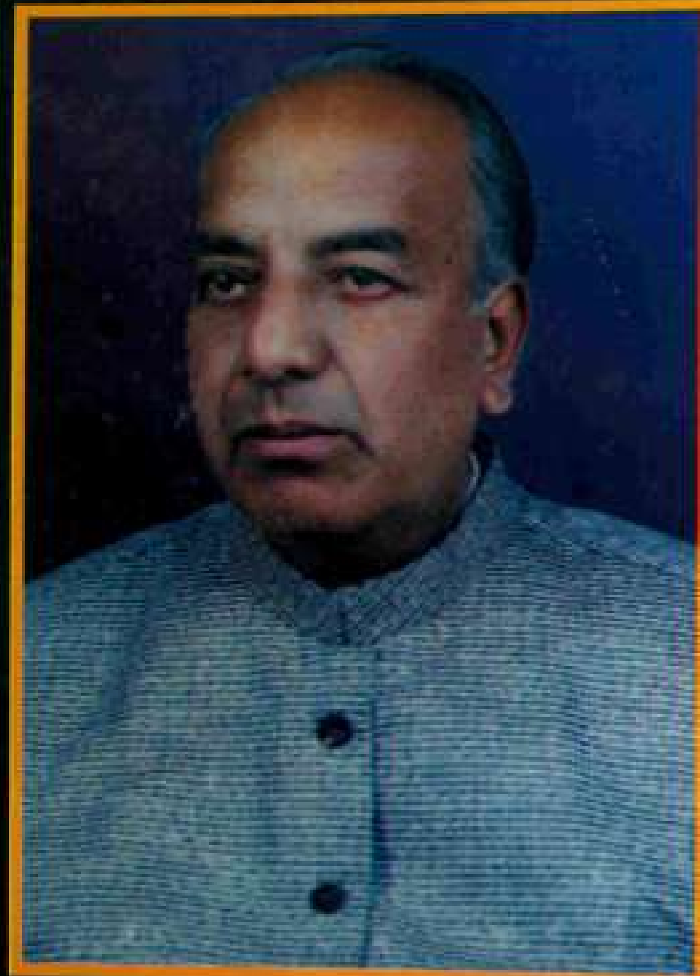

نور احمد میرٹھی

شخصیاتِ میرٹھ

نور احمد میرٹھی

ادارہ فکرِ نو کراچی

شخصیاتِ میرٹھ

نور احمد میرٹھی

شخصیات میرٹھ

نور احمد میرٹھی

ادارہ فکرِ نو

۳۵/بی، ۸/۱۱، ۷، کورنگی، کراچی ۷۴۹۰۰

جملہ حقوق بحق فرزانہ نور محفوظ ہیں

نام کتاب:............شخصیات میرٹھ

تالیف:.........نور احمد میرٹھی

سرورق:.........عبدالرحمٰن عبد

کمپوزنگ:.........العائشہ کمپوزنگ سینٹر، کراچی

سن اشاعت:.........۲۰۰۳ء

قیمت:.........چار سو روپے

زیر اہتمام

ادارۂ فکرِ نو

۳۵/بی، ۸/۱۱، ۷، کورنگی

کراچی ۷۴۹۰۰

فون: ۵۰۶۲۸۹۸

بہ تعاون

تنظیم احباب میرٹھ، کراچی

انتساب

محترم حکیم سیف الدین احمد

محترم اشرف علی زبیری

محترم مظہر یوسف

محترمہ صابرہ تانبجانی

محترم نور الٰہی میرٹھ والے

محترم افضال منیف

اور

اراکین تنظیم احباب میرٹھ کے نام

نور احمد میرٹھی

حسنِ ترتیب

نمبر شمار	عنوان	تحریر	صفحہ نمبر
۱۔	انتساب	نور احمد میرٹھی	۵
۲۔	پیش لفظ	زیڈ۔اے۔نظامی	۷
۳۔	شخصیاتِ میرٹھ	خالد علیگ	۱۰
۴۔	ادب پرور ماحول	ڈاکٹر جمیل جالبی	۱۱
۵۔	شخصیاتِ میرٹھ	راغب مرادآبادی	۱۲
۶۔	شخصیاتِ میرٹھ۔۔۔اک نظر	نور احمد میرٹھی	۱۳
۷۔	نور کا اعجاز	ڈاکٹر یوسف جاوید	۲۰
۸۔	میرٹھ سے نسبت کے امیں	عزم بہزاد	۲۱
۹۔	ترجمانِ میرٹھ	انور جاوید ہاشمی	۲۲
۱۰۔	عظمتوں کا سفر	تاریخ کے اوراق سے	۲۳
۱۱۔	میرٹھ: چند یادگار مقامات	--------	۳۲
۱۲۔	فہرست شخصیاتِ میرٹھ	--------	۴۶
۱۳۔	کتابیات	--------	۲۹۵
۱۴۔	ضمیمہ		

پیش لفظ

زیڈ۔اے۔نظامی

چانسلر

سرسید یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی، کراچی

برصغیر کے مختلف علاقے اپنا تہذیبی، تاریخی، علمی اور ادبی پس منظر رکھتے ہیں جن میں شمالی ہند کا شہر میرٹھ اپنے محل وقوع و خدمات کے حوالے سے تاریخ ہند میں بہت نمایاں ہے بلکہ کئی اعتبار سے اس شہر کو تاریخی اہمیت و فضیلت حاصل ہے۔

آزادیٔ ہند کی جدوجہد ہو یا قیام پاکستان کی تحریک، اس شہر بے مثال کے باشندوں نے ہر موقع پر رہنمائی کا فریضہ بھی ادا کیا اور ایثار و قربانی سے وہ تاریخ رقم کی جو باب تاریخ برصغیر پاک و ہند کا روشن باب ہے۔

میرٹھ اپنے تاریخی منظر میں ایک قدیم شہر ہے۔ علمی اعتبار سے یہاں کے باشندوں کی خدمات قابل قدر ہیں۔ تعلیم اور شعر و ادب اس شہر کی مٹی میں شامل ہیں، سیاست میں میرٹھ کو نمایاں مقام حاصل ہوا۔ فنونِ لطیفہ کی اس شہر نے بڑی خدمت کی، اسلامی علوم سے یہاں کے باشندوں کی قلبی وابستگی رہی، منصوبہ بندی اور انتظامی شعبہ میں یہاں کے باکمال لوگوں نے گہرے نقوش بنائے، یہاں کے ہنرمندوں نے اپنی فنی دسترس کا خوب مظاہرہ کیا۔ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ میرٹھ کے شہریوں نے تاریخ کے مختلف ادوار اور زندگی کی تمام ضرورتوں کو بہ طریق احسن نہایت دانشمندی سے پورا کیا ہے۔

ان تمام خدمات کے باوصف میرٹھ کے حوالے سے ایسی کوئی کاوش منظر عام پر نہیں آئی تھی جو میرٹھ کی تاریخ سے روشناس کرائے اور وہاں کے مشاہیر و صاحبان فضل و کمال کی خدمات کو محفوظ کرلے۔ تقسیم ہند کے بعد جب آبادیاں منقسم ہوگئیں تو یہ کام اور مشکل ہوگیا۔ ہرچند کہ جی

محفلوں میں یہ موضوعِ گفتگو رہا مگر کوئی عملی پیش رفت نہ ہو سکی۔ ہجرت کی نصف صدی مکمل ہونے کے بعد یہ خیال خواب ہو گیا تھا چونکہ اچھی خاصی تعداد میں ہم وطن دنیا سے ہی ہجرت کر گئے۔

قدرت نے جناب نور احمد میرٹھی کو اس خدمت کے لئے منتخب کر لیا۔ انہوں نے تقریباً سترہ سال مسلسل محنت کی۔ ان کی تگ و دو اس امر کی عکاس تھی کہ وہ پورے اخلاص، انہماک اور خداداد صلاحیتوں کے ساتھ محوِ سفر ہیں۔ انہوں نے میرٹھ کی تاریخ پر بھی کام کیا اور شعرائے میرٹھ پر بھی...... پھر اس سے بڑھ کر انہوں نے میرٹھ کے مشاہیر اور میرٹھ کی شخصیات پر بھی دل جمعی کے ساتھ اپنی توجہ مرکوز رکھی، چھ سو سے زائد قدیم و جدید شعراء کا تذکرہ اور انتخاب کلام یکجا کرنا، مشاہیر میرٹھ کی خدمات کا احاطہ کرنا اور میرٹھ سے تعلق رکھنے والی مختلف شعبہ ہائے زندگی کی نمایاں شخصیات کے حالات مرتب کرنا، آسان کام نہیں تھا لیکن نور احمد میرٹھی صاحب کی سابقہ کتب اور جانکاہی کو دیکھتے ہوئے یہ یقین ضرور تھا کہ وہ یہ منزل دشوار بھی سر کر لیں گے۔ مجھے خوشی ہے کہ آج وہ پھر سرخرو ہیں۔ انہوں نے ان کتب کے ذریعے نہ صرف میرٹھ سے متعلق شخصیات کو یکجا کیا ہے بلکہ ان کی ہمہ گیر خدمات سے استفادے کا موقع بھی فراہم کیا ہے۔

تذکرہ شعرائے میرٹھ، مشاہیرِ میرٹھ اور شخصیات میرٹھ کے مطالعے سے قارئین کو اندازہ ہوگا کہ میرٹھ کی زرخیز مٹی سے کیسے کیسے گوہر نایاب ابھرے اور اپنے فکر و عمل سے کس طرح کتابِ زیست کے روشن باب لکھ گئے۔ ان شخصیات کا فیض محض میرٹھ ہی کی حدود میں نہیں رہا بلکہ برصغیر کے تمام حصوں کے لوگ ان سے فیض یاب ہوئے بلکہ یہ کہنا بھی مبالغہ نہیں ہوگا کہ ان شخصیات نے برصغیر کے باشندوں کی رہنمائی کا فریضہ ادا کیا۔ تحریک پاکستان میں میرٹھ کے زعماء کی خدمات بہت واضح ہیں۔ پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد میرٹھ سے بھی بڑی تعداد میں مسلمان پاکستان آئے اور انہوں نے پاکستان کی تعمیر و ترقی میں کلیدی کردار ادا کیا اور آج بھی وہ اپنے وطن کی ترقی و خوشحالی اور استحکام کے لئے مختلف شعبہ ہائے زندگی میں سرگرمِ عمل ہیں۔ ان لوگوں کی گرانقدر خدمات کا نور احمد میرٹھی صاحب کی کتب احاطہ کرتی ہیں۔

ان کتب کی تکمیل و اشاعت پر میں جناب نور احمد میرٹھی کو خلوص دل سے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ مجھے اُمید ہے کہ آگہی یہ کاوشیں تاریخ ادب کا حصہ بنیں گی اور آنے والی نسلوں پر ان کے آبائی وطن کے خدوخال واضح رہیں گے جو ان کے لئے فخر کا باعث بھی بنیں گے۔ (انشاء اللہ)

شخصیاتِ میرٹھ

خالد علیگ

گنجینۂ علم و ادبیاتِ میرٹھ
آئینۂ حسن ذاتیاتِ میرٹھ
کیف وکم جملہ صاحبانِ دانش
تصنیف لطیف شخصیاتِ میرٹھ

اردو مقروض سرزمینِ میرٹھ کی تھی
یہ قرض ہوا بدستِ نور احمد بے باق
موصوف کی شخصیاتِ میرٹھ کے طفیل
روشن ہوئے علم کے ہنر کے آفاق

ادب پرور ماحول

ڈاکٹر جمیل جالبی

میرٹھ میں میری اور سلیم احمد کی ملاقات ہوئی۔ ہم دونوں فرسٹ ایئر کے طالب علم تھے اور ادب کی دنیا میں کچھ کر گزرنے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ دن رات یہی اوڑھنا بچھونا تھا۔ یہی موضوعِ سخن تھا اور یہی مقصدِ زندگی تھا۔ ہم دونوں نئی نئی کتابیں پڑھتے' تبادلہ خیال کرتے اور گھنٹوں انہی مسائل میں گم رہتے تھے۔ سلیم احمد اس وقت میرٹھ کے نوجوان شعراء میں سب سے ممتاز تھے۔ ہنر تخلص کرتے تھے اور اقبال کے رنگ میں شعر کہتے تھے ....

اس زمانے میں سلیم احمد اور میں بے قرار روحوں کی طرح' سارے میرٹھ کے گلی کوچوں میں گھومتے پھرتے تھے۔ میرٹھ کالج کے ہوسٹل سے بھیا وحید الدین کی لال کوٹھی تک' وہاں سے بیگم پل' خیر نگر' کمبوہ دروازہ' رشید چائے والے کی دکان' کبھی کوٹھی جنت نشان کی طرف' کبھی نواب اسماعیل خان کی کوٹھی کی طرف' کبھی رزمی صدیقی کے ہاں پرو افیاض علی' جہاں لیلیٰ مجنوں والے ماسٹر روپی سے ملاقات ہوتی اور اکثر بھیسالی گراؤنڈ اور نادر علی بلڈنگ' جہاں حکیم فرخ آبادی کا مطب تھا اور جہاں سلیم احمد کا گھر بھی تھا۔ کبھی پی پٹ بازار یا دلی بازار سے ہوتے ہوئے گزری سے گزرتے قاری محمد یونس کے گھر۔ اس تمام عرصے میں کسی نہ کسی ادبی موضوع پر گفتگو ہوتی رہتی اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ ہم جلد ہی کائنات کے رازہائے سربستہ دریافت کرلیں گے۔ اسی اثناء میں کام کے منصوبے بنتے' نئی تحریروں پر بات ہوتی۔

گرمیوں کے موسم میں ہم جہاں سے گزرتے چنبیلی' موتیا اور بیلے کی خوشبوؤں سے گلی کوچے مہکے ہوتے۔ چاندنی راتوں میں رات کی رانی کی مہک قدم قدم پر تازہ دم کرتی۔ یہ خوشبوئیں آج بھی مشامِ جاں کو معطر کئے ہوئے ہیں۔ ادب اور شعر و شاعری اس شہر کی روح میں اس طرح شامل تھے جس طرح زر پرستی آج ہماری روح میں شامل ہے۔ اس ادب پرور ماحول اور اسی تخلیقی فضا کا اثر تھا کہ فرزندانِ میرٹھ نے اردو ادب میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے کہ آج ان کے نام تاریخِ ادب کا حصہ ہیں۔

الکائی' ص 11 تا 13

شخصیاتِ میرٹھ ---- اک نظر

میرٹھ بھارت کے موجودہ صوبہ اتر پردیش کا ایک قدیم تاریخی شہر ہے۔ پہلے اسے میراشٹر بھی کہا جاتا تھا اور عشق آباد بھی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کا آغاز اسی شہر سے ہوا جس نے پورے ملک کے حریت پسندوں کے جذبات کی ترجمانی کا اعلان کیا۔ میرٹھ اور اس کے قرب و جوار کے شہریوں نے اس معرکہ میں بیش بہا قربانیاں دے کر تاریخ ہند کا سنہری باب رقم کیا، جس کا نتیجہ نوے سال بعد آزادی کی صورت میں ملا۔ تحریک آزادی سے تحریکِ پاکستان اور پھر آزادیٔ ہند و قیام پاکستان اور نوزائیدہ مسلم مملکت پاکستان کے استحکام، تعمیرو ترقی اور خوشحالی کی جدوجہد میں میرٹھ سے وابستہ شخصیات نے بہترین صلاحیتوں کے ساتھ بے لوث خدمت کی ہے۔

سیاسی تحریکوں میں باشندگانِ میرٹھ نے گہرے شعور اور دانش مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فعال کردار ادا کیا۔ مسلم زعماء میں نواب وقارالملک مولوی محمد مشتاق حسین، نواب محمد اسماعیل خاں اور نواب سر محمد یامین خاں کی خدمات نے میرٹھ کو امتیاز بخشا۔ بھارت میں بھی متعدد فرزندانِ میرٹھ نے ذمہ دارانہ حیثیت میں خدمات انجام دیں جن میں سابق صدر فخرالدین اور چرن سنگھ نمایاں ہیں۔ پاکستان میں جن شخصیات نے حکومتی فرائض سنبھالے، ان میں نواب سر محمد یامین خاں، مسرت حسین زبیری، سردار امیر اعظم، فیروز قیصر، عبدالوحید خاں اور افضال مدیف شامل ہیں۔

میرٹھ کے امراء اور رؤساء نے دل سوزی و دردمندی اور ایثار سے تاریخ کا باب رقم کیا۔ کئی صدی پہلے کے رؤساء، نواب خیر اندیش خاں، نواب اسعد اللہ خاں، نواب مبارک علی خاں، نواب ابو محمد خاں، نواب احمد اللہ خاں اور نواب بہادر خاں کے تذکرے مشہور ہیں۔ ماضی قریب پر نظر ڈالیں تو شیخ الٰہی بخش، خان بہادر شیخ بشیر الدین، نواب محمد اسحاق خاں، نواب محمد اسماعیل خاں، خان بہادر شیخ عبدالکریم، نواب منصب علی خاں، نواب جمشید احمد خاں، بھیا احسان الحق، شیخ غلام محی الدین اور خان بہادر حاجی شیخ وجیہ الدین کے نام اپنی تابنا کی کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔

شخصیاتِ میرٹھ

راغب مراد آبادی

کیسے ہو احاطۂ جہاتِ میرٹھ
بے حد ہے وسیع کائناتِ میرٹھ
راغبؔ! یہ بھی ہے نور احمد کا کمال
شہکارِ ادب ہے ''شخصیاتِ میرٹھ''

دین سے گہری وابستگی اس شہر کی مٹی میں شامل ہے۔ صوفیا، علماء و مشائخ کے علم و فضل اور کردار و عمل کے نقوش بہت تابندہ ہیں۔ دینی موضوعات کے حوالے متعدد کتب کے مصنفین مولانا بدر عالم مہاجر مدنیؒ، مولانا عبدالسمیع بیدلؒ، مولانا عاشق الٰہیؒ، مولانا قاضی زین العابدین سجادؒ اور مولانا ڈاکٹر فضل الرحمٰن انصاریؒ کے اسماء گرامی اہمیت کے حامل ہیں، جن کی تصانیف نے رہنمائی کا فریضہ انجام دیا۔ مختلف موضوعات کے حوالے سے ہونے والے تصنیفی و تالیفی کام کی تفصیل تذکرہ شعرائے میرٹھ کے دیباچے میں دیکھی جاسکتی ہے۔ میرٹھ کے علماء میں شیخ العالم حضرت مولانا عبدالحقؒ ایک جید بزرگ تھے۔ ان کے شاگردوں میں مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا انور شاہ کشمیریؒ اور مولانا سید حسین احمد مدنیؒ جیسے اکابر علماء شامل ہیں۔ دیگر ممتاز و معروف علماء کرام میں مولانا بدر عالمؒ، شیخ الحدیث مولانا سید فخر الدینؒ، مولانا مفتی کفایت اللہ، مولانا شاہ عبدالعلیم صدیقیؒ، مولانا محمود الحق صدیقیؒ، مولانا قاضی زین العابدین سجادؒ، مولانا حامد علی قریشیؒ، مولانا مفتی حکیم محمد اسحاق، مولانا نذیر احمد جندی، مولانا حکیم محمد مصطفیٰ، مولانا شاہ احمد نورانی اور مولانا ڈاکٹر فضل الرحمٰن انصاریؒ شامل ہیں۔ ان بزرگوں نے مدارس قائم کئے۔ درس و تدریس اور تبلیغی تسلسل کو قائم رکھا اور مسلمانوں کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیا۔ مولانا شاہ احمد نورانی نے پاکستان میں ہر اہم تحریک میں قیادت کا فریضہ انجام دیتے ہوئے قوم کی رہبری کی۔ اسی طرح صوفیائے کرام کی خدمات سے بھی صرفِ نظر ممکن نہیں ہے۔ اللہ کے ان ولیوں نے تعلیم و تربیت کا اہتمام کیا جس سے بڑی تعداد میں خلقِ خدا فیض یاب ہوئی۔ شہری آج بھی ان کی درگاہوں پر بلا امتیاز مذہب و ملت، عقیدت و احترام کے ساتھ جاتے ہیں۔ ان بزرگوں میں حضرت شاہ پیرؒ بہت معروف ہیں جن کے مزار کے ساتھ ایک بڑا تاریخی قبرستان بھی ہے۔

اردو کی نشوونما اور فروغ میں میرٹھ کی کئی شخصیات کا قابلِ قدر حصہ ہے۔ ان میں مولوی محمد اسماعیل میرٹھی سرفہرست ہیں۔ جن کی مرتب کردہ درسی کتب تہائی صدی سے زیادہ عرصہ ہندوستان کے طول و عرض میں داخلِ نصاب رہیں۔ بچوں کے ادب اور نیچرل شاعری کے حوالے سے ان کا کوئی ہمسر نہیں ہے۔ غلام مولیٰ قلق تلمیذ مرزا غالب نے انگریزی منظومات کو اردو میں منتقل کرنے میں اولیت حاصل کی، جس کی اتباع ان کے ہمعصر مولوی محمد اسماعیل میرٹھی نے بھی کی۔ یہ تراجم زبان و بیان اور اصلی متن سے قریب تر ہونے کی وجہ سے نہایت

اہم تسلیم کئے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر حسن الدین احمد نے اپنی اہم تصنیف ''انگریزی شاعری کے منظوم ترجموں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ'' میں ان تراجم کی افادیت و اہمیت پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

میرٹھ میں تحریر کردہ تذکرے طبقاتِ سخن مولفہ غلام محی الدین عشق و مبتلا، گلشنِ بیخار مولفہ نواب محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ اور بہارستان ناز مولفہ حکیم فصیح الدین رنج خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اپنے تحقیقی مقالے ''اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری'' میں ان تذکروں کا تجزیہ کرتے ہوئے اہم قرار دیا ہے۔ ''بہارستان ناز'' شاعرات کا اولین تذکرہ ہے۔ ان کے علاوہ ''مراۃ الشعراء'' کو بھی پذیرائی حاصل ہوئی۔ یہ دو جلدوں پر مشتمل ہے اور اس کے مصنف مولوی محمد یحییٰ تنہا ہیں۔ اس کتاب کے بارے میں ممتاز محقق مالک رام کی رائے ہے کہ اگر اردو کی سو بہترین کتب کا انتخاب کیا جائے تو یہ کتاب اس میں شامل ہوگی۔ مولانا محمد یحییٰ تنہا ہی کی تصنیف ''سیر المصنفین'' دو جلدوں میں منظرِ عام پر آچکی ہے۔ ان کے علاوہ بھی میرٹھ سے وابستہ کئی ادیبوں نے تذکرے ترتیب دیئے جن میں ''خندۂ گل'' مولفہ عبدالباری آسی الدنی، ''تذکرۃ الخواتین'' مولفہ عبدالباری آسی اور راقم کا مرتبہ غیر مسلم نعت نگار شعراء کا عالمی تذکرہ ''بہر زماں بہر زباں صلی اللہ علیہ وسلم'' شامل ہیں۔ ''تذکرۃ الشعراء'' مولفہ معین الحق بصیر کاظمی اور ''تذکرۂ اردو'' مولفہ شرف الدین سرور کے علاوہ ہنری ولیم ابراہام کا تذکرہ ''کہکشاں'' تحتِ طباعت ہیں۔ اسی طرح شعراء کے کلیات اور شعری مجموعے کثرت سے شائع ہوئے اور یہ سلسلہ ہنوز قائم ہے۔ ان مجموعوں کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ شعراء کرام کو تمام اصناف پر قدرت حاصل ہے۔

اس شہرِ علم کے افراد کی نثر میں بھی اہم تصانیف موجود ہیں جو ان کے وسعتِ علم اور گہرے مشاہدات و تجربات کی عکاسی کرتی ہیں۔ تاریخ، تحقیق اور تنقید میں بابائے اردو مولوی عبدالحق کے علاوہ پروفیسر خلیق احمد نظامی، ڈاکٹر جمیل جالبی، پروفیسر کرار حسین، ڈاکٹر شوکت سبزواری، مولوی محمد یحییٰ تنہا، سید قدرت نقوی، ڈاکٹر نجم الاسلام، سلیم احمد، احمد ہمدانی اور شمیم احمد معروف و معتبر ہیں۔ ان حضرات کو تحقیق و تنقید میں جو مقام حاصل ہے، صاحبانِ فکر و نظر اس کے معترف ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخ اردو ادب اس اعتبار سے منفرد ہے کہ اس کی کئی ضخیم جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ اس کی جامعیت کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف محترم

نے تنہا وہ کام کر دکھایا ہے جو بڑے اداروں سے بھی ممکن نہیں ہوا۔ دوسرے متعدد موضوعات پر مولوی چراغ علی، اختر حمید خاں، انتظار حسین، ڈاکٹر رضی الدین احمد، ڈاکٹر سید زاہد علی واسطی، ڈاکٹر امیر اللہ شاہین، افتخار احمد عدنی، خورشید وارثی، ڈاکٹر رفعت سروش، ڈاکٹر جلال انجم اور ڈاکٹر مقصود حسن کی کتب قابلِ مطالعہ ہیں۔

فکشن میں انتظار حسین کا نام ایک دبستان کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ ڈاکٹر حسن منظر، علی امام نقوی، نور العین علی اور ڈاکٹر سعدیہ نسیم بھی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ تاریخی ناول نگاری میں صادق سردھنوی کو شہرت حاصل ہوئی۔ طویل کہانی میں علیم الحق حقی اپنی شناخت تسلیم کرا چکے ہیں۔ ان کی تقریباً پچاس کتب شائع ہو چکی ہیں جن میں ''عشق کا عین''، ''فی سبیل اللہ'' اور ''اماوس کا دیا'' کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے ہیں۔

شعری و نثری تراجم میں غلام مولیٰ قلق، مولوی محمد اسماعیل میرٹھی، ڈاکٹر جمیل جالبی، پروفیسر حسن عسکری، مولانا عبدالباری آسی، مولوی محمد یحییٰ تنہا، حکیم مقرب حسین، انتظار حسین، ڈاکٹر نجم الاسلام اور ڈاکٹر انور زاہدی کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ ان صاحبانِ قلم نے عالمی اور علاقائی زبانوں کے ادب کو سلیس انداز میں مہارت کے ساتھ اردو میں منتقل کیا ہے جس کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ڈرامے کے شعبہ میں آغا ناصر، سلیم احمد اور ڈاکٹر رفعت سروش کی بیش بہا خدمات ہیں۔ آغا ناصر اور ڈاکٹر رفعت سروش کے ڈراموں کے مجموعے بھی شائع ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر رفعت سروش کے منظوم ڈرامے بہت پسند کئے گئے۔ شخصی خاکوں کے حوالے سے اختر حامد خاں کی کئی کتابیں منظرِ عام پر آئی ہیں۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، ڈاکٹر سید زاہد علی واسطی، انتظار حسین اور اختر حمید خاں کے سفرنامے بڑی قدر سے دیکھے گئے ہیں۔

فنِ عروض و علم معانی و بیان پر بھی میرٹھ کے صاحبانِ علم و فضل کی گہری نظر رہی۔ ان حضرات میں بابائے اردو مولوی عبدالحق، سید قدرت نقوی، احسان دانش اور بھگوان چند بھٹناگر کی خدمات یاد رکھی جائیں گی۔ لغت نویسی میں ڈاکٹر جمیل جالبی، سید قدرت نقوی، اطہر ہاپوڑی، احسان دانش، مولانا عبدالباری آسی، قاضی زین العابدین سجاد اور فرانسس کالکیب کوین فراسو، سوانحی ادب میں ظ۔ انصاری اور پروفیسر خلیق احمد نظامی، لسانیات میں ڈاکٹر شوکت سبزواری، ڈاکٹر امیر اللہ شاہین، سید قدرت نقوی اور احسان دانش کے نام قدر و منزلت کے حامل ہیں۔

مصوری، موسیقی، خطاطی، اداکاری، فوٹوگرافی اور قوالی سے وابستہ افراد نے بھی اپنے اپنے شعبوں میں ناموری حاصل کر کے اپنے وطن کا نام روشن کیا۔ فوٹوگرافی میں ایس۔ محمود کو ملک گیر شہرت حاصل ہوئی۔ قائد اعظم کے علاوہ مسلم اکابر اور کانگریسی زعماء کی یادگار تصاویر بنانے کا انہیں اعزاز حاصل ہے۔ بیشتر قائدین اور حکمرانوں نے ان کے اسٹوڈیو میں آ کر تصویریں بنوائیں۔ مصوری میں ان کے والد نظیر حسین کو بین الاقوامی شہرت ملی۔ انہوں نے لندن میں منعقدہ عالمی نمائشوں میں گولڈ میڈل حاصل کئے۔ دیگر مصوروں میں یعقوب، مظہر خاں، پارہ اور ارون مالا کے علاوہ پاکستان میں صغیر احمد معروف مصور ہیں۔ فنِ خطاطی میں رقیہ بیگم نے نام حاصل کیا۔ موسیقی میں استاد مزداق خاں، استاد شریف خاں، مدھو سرن گپتا، حبیب الرحمن، استاد شمو خاں، استاد کریم الدین، پروفیسر ایس۔ این۔ رائے، رمیش ورما، استاد کاکل، شنکر لال، رفیع الدین، پنڈت رگھو یر شرن، استاد بنے خاں، مودھا بالکی اور پرشورام، قوالی میں کلن خاں، فرید خاں اور فاروق احمد خاں رئیس احمد خاں نیازی، اداکاری میں بینا کماری، سید کمال، صولت حسین، کے۔ ایل۔ سنگھ، اندریہ رمن رستوگی، خالدہ ریاست اور عائشہ خان، فلمی نغمہ نگاری میں نخشب جارچوی اور مظفر وارثی نمایاں شخصیات ہیں۔ اسپورٹس میں اصلاح الدین میرٹھ کا فخر ہیں۔

فنونِ لطیفہ اور علم و ادب کے علاوہ زندگی کے دوسرے حصوں پر نظر ڈالی جائے تو ان میں بھی ہم وطنوں کی محنت کی داد دینی پڑتی ہے۔ تجارت میں خان بہادر حاجی شیخ وجیہ الدین، منشی نادر علی، سیٹھ شیتل پرشاد جین، اشرف علی زبیری، حشمت مجمی، حاجی شیخ رشید احمد، زین العابدین انصاری، اور سید محمد سلیم، طب میں حکیم فصیح الدین رنج، حکیم مقرب حسین، حکیم بلدیو سہائے، ڈاکٹر بھوپال سنگھ، حکیم فرخ آبادی، حکیم جمشید احمد خاں، ڈاکٹر سید زاہد علی واسطی اور حکیم سیف الدین احمد، سول سروس میں جی۔ اے۔ مدنی، ڈاکٹر جمیل جالبی، افتخار احمد عدنی، سید مظفر احمد ضیا، سید احمد، ڈاکٹر خاور جمیل اور اسلم۔ آر۔ خاں، بینکنگ میں شاہد حسن صدیقی اور سرفراز حسین عابدی، اکاؤنٹنسی میں فیروز قیصر اور افضال منیف، مینجمنٹ میں ہارون احمد زبیری، قاضی محمد اویس اور محمد حسین زبیری، منصوبہ بندی میں مسرت حسین زبیری، زیڈ۔ اے۔ نظامی اور ناظم حسین صدیقی، تعلیمی ماہرین اور دانشوروں میں ڈاکٹر سر ضیاء الدین، پروفیسر کرار حسین، ڈاکٹر جمیل جالبی، خان بہادر مولوی محمد بشیر الدین، پروفیسر خلیق احمد نظامی،

ڈاکٹر عترت حسین زبیری، کرنل ٹی۔ ایف۔ اوڈول، ڈاکٹر نجم الاسلام، پروفیسر مدن موہن، ڈاکٹر امیر اللہ شاہین، ڈاکٹر خالد حسین خاں، پروفیسر ڈاکٹر رضی الدین احمد صدیقی، شیخ رؤف الحسن صدیقی، ڈاکٹر مقصود حسن، ڈاکٹر نزہت اکرام، ڈاکٹر راحت ابرار، پروفیسر سعید احمد رفیق، پروفیسر حبیب الرحمٰن صدیقی اور ڈاکٹر سعدیہ نسیم معروف ہیں۔

میرٹھ کے صحافیوں نے قلم کی حرمت کو قائم رکھتے ہوئے حق وصداقت کو پیش کیا۔ نہ کسی طاقت سے مرعوب ہوئے اور نہ ہی حرص وطمع کے اسیر۔ ان باضمیر اور صاحبِ ظرف حضرات میں سید جمیل الدین ہجر کا نام بہت نمایاں ہے۔ جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد آخری مغل تاجدار پر جو مقدمہ قائم ہوا اس میں ان کو بھی شامل کیا گیا۔ سید جمیل الدین ہجر نے قید وبند کی صعوبتیں خندہ پیشانی سے برداشت کیں۔ دوسرے اہم صحافیوں میں محمد عثمان فارقلیط، خواجہ غلام الثقلین، ظ۔ انصاری اور محمد صلاح الدین کسی تعارف کی محتاج نہیں ہیں۔ یہ امر بھی قابلِ تحسین ہے کہ انہوں نے یہ مقام اپنی خداداد ذہانت اور محنت سے حاصل کیا۔ یہ سب مدیر بھی رہے۔ ظ۔ انصاری کے کاٹ دار اداریوں کا مجموعہ ''کانٹوں کی زبان'' شائع ہو چکا ہے۔ تاریخِ صحافت ان حضرات پر فخر کر سکتی ہے۔

میرٹھ کی خواتین نے بھی اپنے ذمہ دارانہ طرزِ عمل سے قوم کی فلاح و بہبود کے لیے انتھک کوششیں کیں۔ ان کے شب و روز گواہ ہیں کہ اپنی قوم کے بہتر مستقبل کے لیے انہوں نے ہر دستیاب آسائش کو نظر انداز کیا۔ بیگم شمرو تو سردھنہ کی کرتا دھرتا تھیں ہی مگر دوسری خواتین میں عزیز النساء بیگم کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نے سر سید احمد خاں کی تربیت اس انداز سے کی کہ ان کے عظیم بیٹے نے وہ کردار ادا کیا جس نے تاریخ کا رخ موڑ دیا۔ نواب محمد اسماعیل خاں کی اہلیہ اشرف زمانی بیگم نے اپنے ہمسفر کے دوش بدوش تحریکوں میں حصہ لیا۔ بیگم محمد شریف کو بابائے اردو نے انجمن ترقی اردو پاکستان کی خواتین شاخ کا سربراہ مقرر کیا۔ کملا چودھری نے رکنِ اسمبلی اور وزیر کی حیثیت سے فرائض انجام دیے۔ ان کے علاوہ زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی خواتین کا کردار فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ رابعہ نہاں، نور العین علی، ڈاکٹر سعدیہ نسیم، ڈاکٹر نزہت اکرام، مہر نگار تیموری، صبیحہ صبا، فہمیدہ ریاض، رقیہ بیگم، ڈاکٹر فریدہ احمد، گیتا نجلی، ساجدہ زیدی، ماہ طلعت زاہدی، فاطمہ زیدی، ثروت، مسرت، حور اور خورشید اقبال حیا اپنے اپنے شعبوں میں قابلِ ذکر ہیں۔

میں معترف ہوں کہ یہ جائزہ مکمل نہیں ہے تقسیم ہند کے بعد دنیا کے مختلف ممالک میں پھیلے ہوئے لوگوں تک رسائی ممکن نہیں اور پھر اب تو ہندوستان سے بھی رابطہ مشکل ہو گیا ہے۔ یہ امر میرے لیے باعثِ طمانیت ہے کہ میں نے اپنی کوششوں میں کمی نہیں کی اور کسی حد تک تذکرہ شعرائے میرٹھ، مشاہیر میرٹھ اور شخصیاتِ میرٹھ کے مطالعے سے اس مردم خیز زمین کے بارے میں آگاہی ہو جائے گی جو علم و دانش کا ایک اہم مرکز رہی ہے اور جس کے ذکر کے بغیر برصغیر کی کوئی تاریخ مکمل نہیں ہوگی۔

زیرِ نظر کتاب میں وہ اہم شخصیات شامل ہیں جنہوں نے مختلف شعبہ ہائے زندگی میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں یا اب بھی محوِ سفر ہیں اور جن کو متعلقہ شعبہ میں نظر انداز کرنا ممکن نہیں ہے۔

نور کا اعجاز

ڈاکٹر یوسف جاوید

اٹھایا جب بھی ہے شانوں پہ اس نے رختِ سفر
قدم بھی کر کے رہے سر یہ کارِ مشکل تر

شکستِ وقت شکستِ بنائے مجبوری
ابھارتی رہی یوں قدر اس کی بے قدری

قلم بدست جو ہے نور اب برائے عمل
اسی سے دیکھے گا میرٹھ کا آج تاج محل

ہیں آج بھی وہ مسلّم بہ فیضِ فکر و نظر
ہیں آج بھی وہ قوی شخصیاتِ علم و ہنر

انھی سے برصغیر آج ہے محیطِ نور
کہ خیرگی کو اجاگر ہوا ہے شعلۂ طور

نہ کیوں ہو غلغلہ اس تذکرہ نویسی کا
کہ خونِ دل بھی ہے حیراں اس عرق ریزی کا

خدا کا شکر ہے میرٹھ کو بخش دیا اعزاز
چھلک رہا ہے ہمہ رنگ نور کا اعجاز

میرٹھ سے نسبت کے امیں

عزم بہزاد

عہدِ حاضر میں کہاں شرحِ روایت کے امیں
قصۂ ماضی کے راوی علم و حکمت کے امیں

منصبِ گویائی پر فائز جہالت کا غرور
کنجِ تنہائی میں چپ حرف و حکایت کے امیں

تلخئ باطن زباں تک آ گئی لفظوں کے ساتھ
اب کہاں ڈھونڈیں وہ لہجے کی حلاوت کے امیں

''وہ تو یہ کہیے کہ ہے ہم پر دعاؤں کی بہار
ورنہ کب ملتے ہمیں پھولوں کی نکہت کے امیں

اک انھیں کو دیکھئے ، یہ نور احمد میرٹھی
انکسار و عاجزی کی جاں ، شرافت کے امیں

محوِ اذکارِ بزرگاں صرفِ تحریر و خطاب
دل پہ جو قبضہ جما لے اس محبت کے امیں

شخصیاتِ شہرِ میرٹھ کو مکمل کر چکے
جو امانت تھی قلم کی ، اس امانت کے امیں

یوں تو میرٹھ کے بزرگوں پر کبھی نے بات کی
نور احمد ہو گئے میرٹھ سے نسبت کے امیں''

ترجمانِ میرٹھ

انور جاوید ہاشمی

وہ" اذکار و افکار" ہو یا کہ" نورِ سخن" ہاشمی
جہد و سعیٔ مسلسل سمجھتے سرِ انجمن ہاشمی

نور احمد کراچی میں ہیں اہلِ میرٹھ کے اک ترجماں
ان کی تالیفِ منظوم "بہرِ زماں و بہرِ زباں"

جالبی ہوں نظامی ہوں کرار یا کہ حسن عسکری
نو ر احمد نے ہم کو بتایا کہ ہیں یہ بھی میرٹھی

ذکرِ میرٹھ ہو یا کہ مشاہیرِ میرٹھ کے اہلِ سخن
ذکر ان کا کیا نور نے بے شبہ بر سرِ انجمن

ان کی خدمات کے معترف ہیں کراچی کے اہلِ قلم
یہ الگ بات ہے کہ قصیدہ کسی نے کیا نہ رقم

نیک و مخلص انہیں اجنبی و شناسا بھی نے کہا
جو کتب ان کی دیکھے، کہے گا یہی مرحبا، مرحبا

عظمتوں کا سفر

(تاریخ کے اوراق سے)

مسلم لیگ کے پہلے آنریری سیکریٹری

۳۰ر دسمبر ۱۹۰۶ء کو ڈھاکہ میں مسلم اکابر کا ایک اہم اجلاس ہوا۔ اس اجلاس میں مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا۔ اس تاریخی اجلاس کی صدارت نواب وقار الملک نے فرمائی۔ اجلاس میں نواب صاحب کو ہی پہلا آنریری سیکریٹری مقرر کیا گیا۔ مسلم لیگ کا دستور العمل جاری کرنے کا اعزاز بھی نواب صاحب کو حاصل ہے۔ واضح رہے کہ نواب صاحب کا اولین خطبہ صدارت بھی ایک اہم تاریخی دستاویز ہے۔

پہلے ہندوستانی ڈی۔ ایس۔ پی

اسلام اللہ خاں بن احمد اللہ خاں بن نواب مبارک علی خاں بن نواب فرحت اندیش خاں پہلے ہندوستانی تھے جس نے ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس کے عہدہ تک ترقی پائی اور نواب کا خطاب حاصل کیا۔

(تاریخ کمبوہ، ص ۳۷۹)

الفاظ قرآنی کی انسائیکلوپیڈیا مرتب کرنے والے پہلے شخص

الفاظ قرآنی کی مختصر انسائیکلوپیڈیا مرتب کرنے کا شرف مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی کو حاصل ہے جو ۱۳۷۳ھ میں طبع ہوئی۔ موصوف میرٹھ کے شہر قاضی بھی تھے۔

شاعرات کے اولین تذکرہ نگار

شاعرات کے اولین تذکرہ نگار حکیم فصیح الدین رنج میرٹھی ہیں۔ ان کا مرتبہ تذکرہ ''بہارستان ناز'' پہلی بار ۱۸۶۴ء میں مطبع دار العلوم میرٹھ سے منظر عام پر آیا۔ ایک سال بعد ہی اس کا دوسرا اور ۱۸۸۲ء میں تیسرا ایڈیشن زیور طباعت سے آراستہ ہوا۔ چند سال قبل اس کا ایک ایڈیشن لاہور سے بھی طبع ہوا ہے۔

(حکیم فصیح الدین رنج میرٹھی)

کلامِ غالب کے پہلے ناقد

کلامِ غالب کے پہلے ناقد مرزا رحیم بیگ رحیم میرٹھی ہیں۔ انھوں نے مرزا غالب کی ''قاطعِ برہان'' کے جواب میں ''ساطعِ برہان'' لکھی جو مرزا کی زندگی ہی میں مطبع ہاشمی میرٹھ سے ۱۲۸۳ھ میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب اہمیت کی حامل ہے۔

کلامِ غالب کے پہلے شرح نگار

مولانا احمد حسن شوکت میرٹھی کو کلامِ غالب کی شرح کرنے کی افضلیت حاصل ہے۔ یہ شرح کمیاب ہے۔ مولانا امداد صابری نے تاریخِ صحافتِ اردو میں مولانا شوکت میرٹھی کے رسالے ''شحنۂ ہند'' کے یکم دسمبر ۱۸۹۳ء سے شرح کے نمونے بھی نقل کیے ہیں۔

(تاریخ صحافت اردو، جلد سوم)

سب سے زیادہ پڑھا جانیوالا میلاد

ممتاز شاعر صوفی محمد اکبر وارثی کا ''میلادِ اکبر'' برصغیر میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا میلاد ہے۔ اس کی اتباع میں کئی میلاد لکھے گئے مگر ان کو اتنی ہمہ گیر مقبولیت حاصل نہیں ہوئی۔

گلشنِ بیخار کی انفرادیت

اردو شعراء کے تذکروں میں ''گلشنِ بیخار'' کو انفرادیت حاصل ہے۔ ''تاریخِ اردو ادب'' کے مصنف رام بابو سکسینہ نے اسے ایک مبسوط اور مشہور تصنیف قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ''ہمارے نزدیک یہ پہلا تذکرہ ہے جس میں انصاف اور آزادی کے ساتھ اشعار کی تنقید کی گئی ہے۔'' یہ تذکرہ ۱۲۵۰ھ میں مکمل ہوا اور تین سال بعد ممتاز صحافی مولوی محمد باقر کی نگرانی میں شائع ہوا۔ چھ سال بعد اس کا دوسرا ایڈیشن منظرِ عام پر آیا۔ بعد ازاں ۱۸۷۳ء میں لکھنؤ میں طبع ہوا۔ اس فارسی تذکرے کا اردو ترجمہ محمد احسان الحق فاروقی نے کیا ہے جو اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی نے شائع کیا ہے۔

قدیم تاریخی میلہ

میرٹھ کی شہرت کا ایک سبب یہاں منعقد ہونے والا عظیم الشان تاریخی میلہ نوچندی ہے۔ جو ہر سال منعقد ہوتا ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ ہندوستان کا قدیم میلہ ہے جس کا آغاز رامائن کے زمانے سے ہوا۔ اس میلہ میں بلا امتیاز مذہب و ملت پورے ملک سے لوگ شریک ہوتے ہیں۔

(میراشہر مانس)

ہندوستان کے قومی نعرہ کے خالق

سبھاش چندر بوس کی آزاد ہند فوج کے لیے ایک ایسے نعرے کی ضرورت تھی جو ہندوستان کے سیکولر تشخص کو نمایاں کرے۔ اس آزاد فوج کے ایک سپاہی عابد حسین صفرانی نے ''جے ہند'' کا نعرہ پیش کیا جسے متفقہ طور پر پسند کیا گیا۔ آج یہ بھارت کا قومی نعرہ ہے۔ عابد حسین صفرانی سرزمین میرٹھ کے فرزند تھے۔

آئی۔ ایل۔ او (بھارت) کے پہلے مسلم ممبر

حبیب حسن خاں متحدہ ہندوستان میں اقوام متحدہ کی تنظیم آئی۔ ایل۔ او کی انڈین برانچ میں متعین ہونے والے پہلے مسلمان ممبر تھے۔

(تاریخ کمبوہ، ص ۳۸۲)

آر۔ سی۔ ڈی کے پہلے جنرل سیکریٹری

۱۹۶۴ء میں علاقائی تعاون برائے ترقی کے پہلے جنرل سیکریٹری مسرت حسین زبیری منتخب ہوئے۔ یہ تنظیم پاکستان، ایران اور ترکی پر مشتمل تھی۔ زبیری صاحب کو جرمنی کی حکومت نے اپنا سب سے بڑا ایوارڈ **KNIGHT COMMANDER'S CROSS** اور حکومتِ ایران نے اپنا اہم ایوارڈ ''نشانِ ہمایوں'' دیا۔ حکومتِ پاکستان نے اپنے بڑے اعزازات، ہلالِ قائداعظم، ستارۂ پاکستان اور ستارۂ قائداعظم سے نوازا۔

کمبوہوں میں پہلے وکیل

حکیم بو علی خاں کمبوہوں میں سب سے پہلے وکیل تھے۔ ان کے صاحبزادے امجد علی خاں ڈپٹی کلکٹر رہے اور پوتے حامد علی خاں کمبوہوں میں سب سے پہلے بیرسٹر ہوئے۔

(تاریخ کمبوہ، ص ۳۸۰)

قائد اعظم کا نکاح پڑھانے کا اعزاز

مولانا نذیر احمد خجندی مسلم لیگ کے فعال رکن تھے۔ آپ کو قائد اعظم محمد علی جناح کا رتی بائی سے نکاح پڑھانے کا اعزاز حاصل ہے۔

(عظمتوں کے چراغ)

تاریخ اُردو ادب

اردو ادب کی جامع، مفصل اور مستند تاریخ لکھنے کا اعزاز ممتاز و معروف دانشور اور ماہر تعلیم ڈاکٹر جمیل جالبی کو حاصل ہے، جس کی تین ضخیم جلدیں نہایت اہتمام سے شائع ہو چکی ہیں۔

جنگ آزادی کی منظوم تاریخ

جنگِ آزادی ہند کی منظوم تاریخ معروف شاعر ساغر نظامی نے لکھی ہے۔ ''مشعلِ آزادی'' کے عنوان سے یہ دو جلدوں میں پایہ تکمیل کو پہنچی اور ۱۹۶۷ء میں دہلی سے شائع ہوئی۔ بھارت کی حکومت نے ۱۹۶۹ء میں انہیں اپنا اعلیٰ قومی اعزاز ''پدم بھوشن'' دیا۔

راجشاہی یونیورسٹی کے پہلے وائس چانسلر

راجشاہی یونیورسٹی کا قیام ۱۹۵۳ء میں عمل میں آیا۔ ڈاکٹر عترت حسین زبیری یونیورسٹی کے پہلے وائس چانسلر بنائے گئے۔

میرٹھ آبزرور

۱۸۳۰ء میں مسٹر سیم ویل گرین وے نے شمالی ہند کے سب سے پہلے مطبع واقع کانپور کی شاخ میرٹھ میں قائم کی جو اس دور میں انگریزوں کی تعداد کا مرکز اور بہت بڑی چھاؤنی تھا۔ یہیں سے ایک سال بعد میرٹھ آبزرور کا اجراء عمل میں آیا۔ اخبار کی اشاعت کے بعد کانپور کے اس پریس کی شاخ کا نام آبزرور پریس رکھ دیا گیا۔ میرٹھ آبزرور پہلے بھی نکلتا تھا، مگر اس کی حیثیت محض قلمی اخبار کی تھی، اس کے مرتب کیپٹن ٹیوکیٹ تھے اور اس کی مقبولیت کا سبب کیپٹن کیمپ بل کا وہ کالم تھا، جس میں وہ فوجی معاملات و حالات کا تجزیہ کرتے تھے۔ کچھ عرصہ تک حکومت کو اس قلمی اخبار کا کچھ پتہ نہ چل سکا، جب علم ہوا تو اس نے ایڈیٹر کو میرٹھ سے تبدیل کر دیا، لیکن میرٹھ آبزرور بدستور نکلتا رہا۔ کیپٹن ٹیوکیٹ کے فرائض مسٹر کوپ نے سنبھال لئے، جو گوناگوں صلاحیتوں کے مالک تھے اور بعد ازاں دہلی گزٹ اور لاہور کرانیکل کے ایڈیٹر بنائے گئے۔

''اخبار نویسی کی مختصر ترین تاریخ'' ، ص ۱۳۹

مصنف ایم۔ ایس۔ ناز

شمالی ہند کا پہلا انگریزی رسالہ

۱۸۳۵ء میں آبزرور پریس سے ایک ماہوار رسالہ بھی جاری ہوا۔ یہ میرٹھ یونیورسل میگزین تھا اور مم کی عرفیت سے مشہور ہوا۔ یہ شمالی ہند کا پہلا انگریزی رسالہ تھا، مگر زیادہ عرصہ اپنی اشاعت بحال نہ رکھ سکا اور بند ہو گیا۔

''اخبار نویسی کی مختصر ترین تاریخ'' ، ص ۱۳۹

مصنف ایم۔ ایس۔ ناز

دہلی ایڈورٹائزر

۱۸۳۸ء میں میرٹھ سے دہلی ایڈورٹائزر نکلا۔ دہلی بینک کے ڈائریکٹر مسٹر کوپنگ اس کے مالک تھے۔ ابتداء میں یہ اخبار ہفت وار شائع ہوتا تھا، ۱۸۵۲ء میں یہ روزنامہ بن گیا، تقریباً چار سال بعد دہلی ایڈورٹائزر، انڈین ٹائمز میں تبدیل ہو کر اپنے وقت کا مشہور اخبار

بن گیا۔

''اخبار نویسی کی مختصر ترین تاریخ'' ص ۱۴۲

مصنف ایم۔ ایس۔ ناز

سب سے اہم اخبار

۱۸۴۶ء میں موفصلائٹ پریس کے نام سے ایک چھاپہ خانہ میرٹھ میں قائم ہوا۔ آگے چل کر اسی نام کا ایک اخبار بھی نکلنے لگا جس کے ایڈیٹر میجر تھامس تھے۔ در اصل موفصلائٹ نام کے ایک ادبی رسالہ کا سب سے پہلے کلکتہ سے اجراء ہوا تھا۔ یہ اخبار اس کی شاخ تھا جو بہت جلد ترقی کر کے سارے شمالی ہند پر چھا گیا اور اس علاقے کا سب سے اچھا اخبار بن گیا۔

''ہندستانی اخبار نویسی''

مصنف محمد عتیق صدیقی

دور بھ میں اوزان متعارف کرانے والے پہلے فرد

پروفیسر حبیب الرحمٰن صدیقی وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے دُور بھ میں حصہ نظم کی داخل کتب میں اوزان سے طلباء کو روشناس کرایا۔

(دور بھ اُردو شاعری)

سب سے زیادہ تاریخی ناول نگار

سب سے زیادہ تاریخی ناول صادق حسین صدیقی نے لکھے جن کو علمی دنیا میں صادق سردھنوی کے نام سے شہرت حاصل ہے۔ انہوں نے ایک سو بیس سے زائد کتابیں لکھیں جن میں اسّی سے زیادہ تاریخی ناول ہیں۔

سب سے زیادہ گول کرنے والا کھلاڑی

پاکستان کی قومی ہاکی ٹیم کے ممتاز کھلاڑی اصلاح الدین کو انفرادی طور پر بین الاقوامی ہاکی میچز میں سب سے زیادہ یعنی ایک سو ستر گول کرنے کا امتیاز حاصل ہے۔

شعبہ فلسفہ جامعہ بلوچستان کے پہلے چیئرمین

۱۹۸۷ء میں بلوچستان یونیورسٹی کوئٹہ میں شعبہ فلسفہ قائم ہوا جس کے بانی پروفیسر سعید احمد رفیق ہیں۔ آپ ہی اس شعبہ کے پہلے چیئرمین بنائے گئے۔

پاکستان میں بھارت کے پہلے سفیر

پنڈت سری ستارام تقسیم ہند کے بعد پاکستان میں بھارت کے پہلے سفیر مقرر ہوئے۔

(میرا شہر ماس، ص ۳۳۷)

سرسید یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی کے پہلے چانسلر

جدید علوم و فنون کی تدریس و تعلیم کے حوالے سے پاکستان میں سرسید یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی کراچی کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ اس یونیورسٹی کے پہلے چانسلر محترم زیڈ۔ اے۔ نظامی ہیں۔ موصوف کی قیادت و رہنمائی میں یونیورسٹی تیزی کیساتھ ترقی کی منازل طے کر رہی ہے۔

ڈاکٹر ضیاءالدین میڈیکل یونیورسٹی کے پہلے چانسلر

ممتاز دانشور اور ماہر تعلیم ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد سے منسوب ڈاکٹر ضیاء الدین میڈیکل یونیورسٹی کراچی میں ۱۹۹۵ء میں قائم ہوئی۔ ڈاکٹر ضیاء الدین احمد مرحوم کی صاحبزادی محترمہ ڈاکٹر اعجاز فاطمہ کے فرزند ڈاکٹر عاصم اس یونیورسٹی کے پہلے چانسلر ہیں جن کے انہماک اور دلچسپی سے یونیورسٹی ارتقائی منازل طے کر رہی ہے۔

میرٹھ
چند یادگار مقامات

مقبرہ حضرت شاہ پیر رحمۃ اللہ علیہ

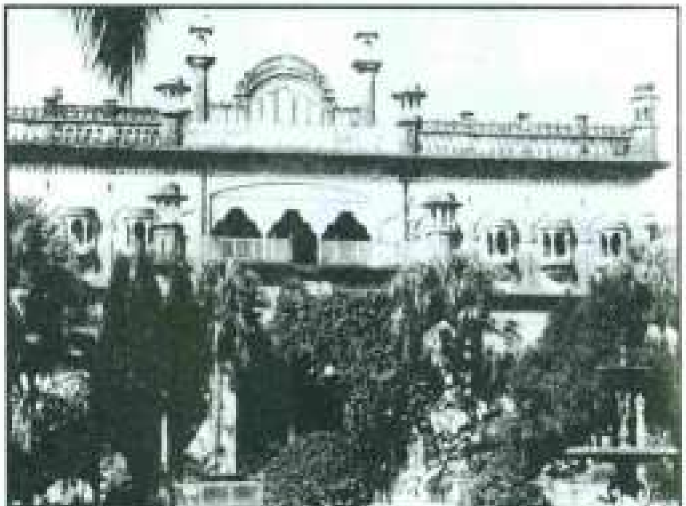

مصطفیٰ کاسل: سامنے کا منظر

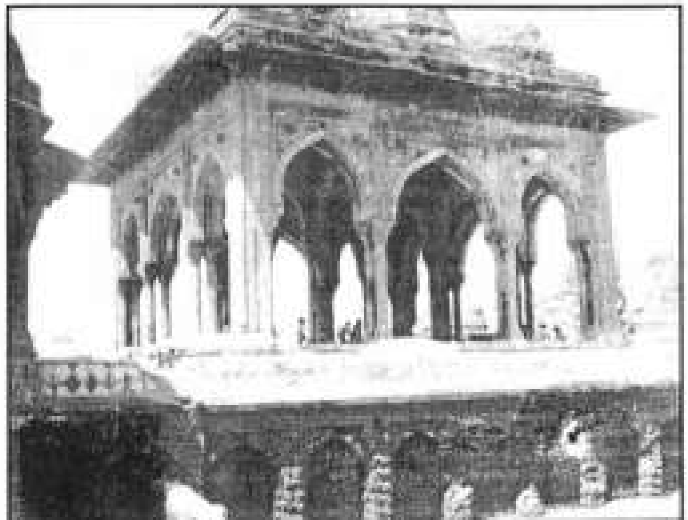

مقبرہ ابو محمد خاں

خیر نگر دروازہ

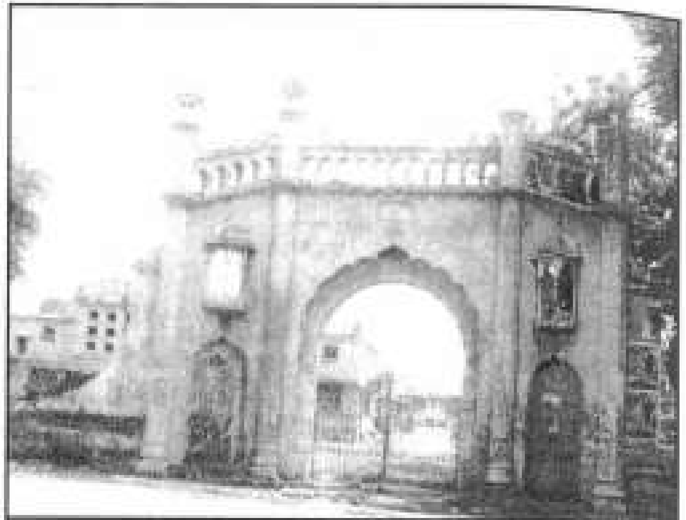

فیض عام کالج کا مرکزی دروازہ

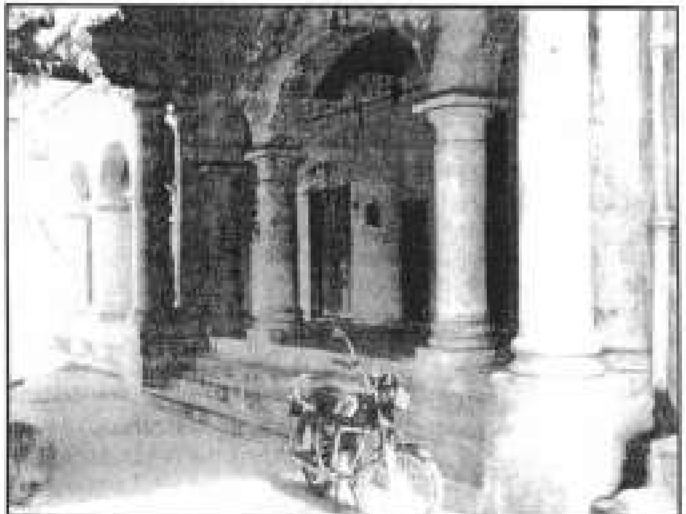

محمد میر کی کوٹھی

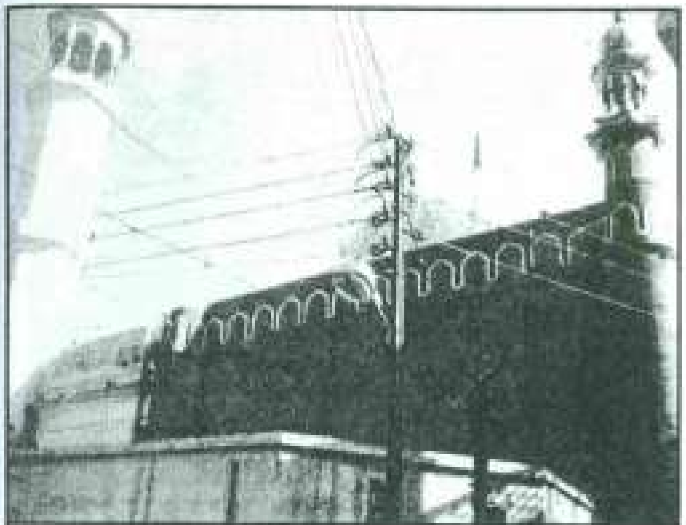

جامع مسجد

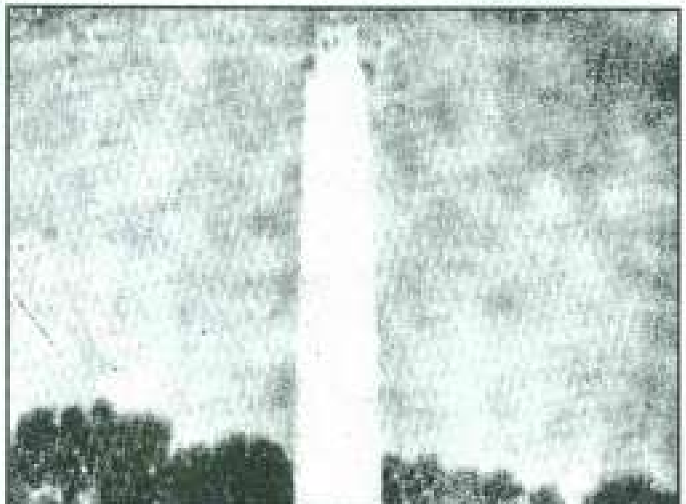

اشوک کی لاٹ

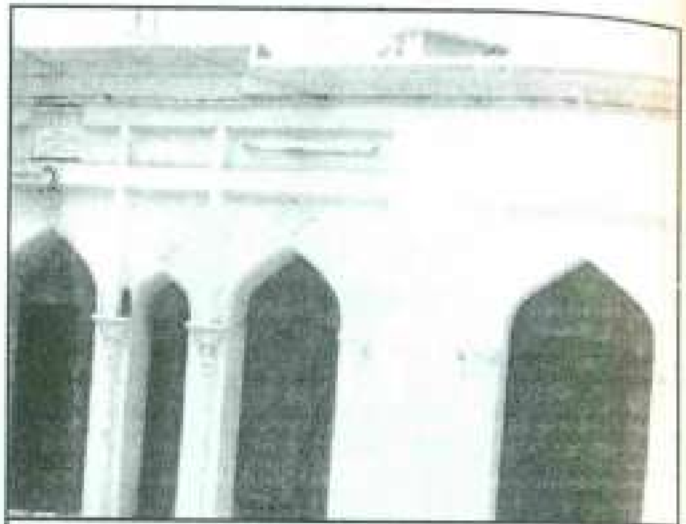

مسجد محمد میر

مزار حضرت شاہ پیر رحمۃ اللہ علیہ

شاہ پیر دروازہ

عید گاہ

مقبرہ محمد ابراہیم شاہ، انچولی

جامع مسجد تحصیل کا عقبی حصہ

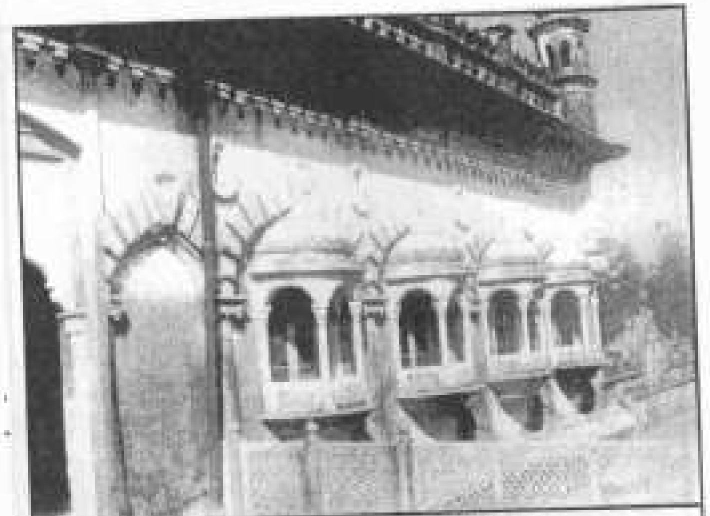

مصطفیٰ کاسل: بالائی منزل کا منظر

حضرت بالے میاں کا مزار

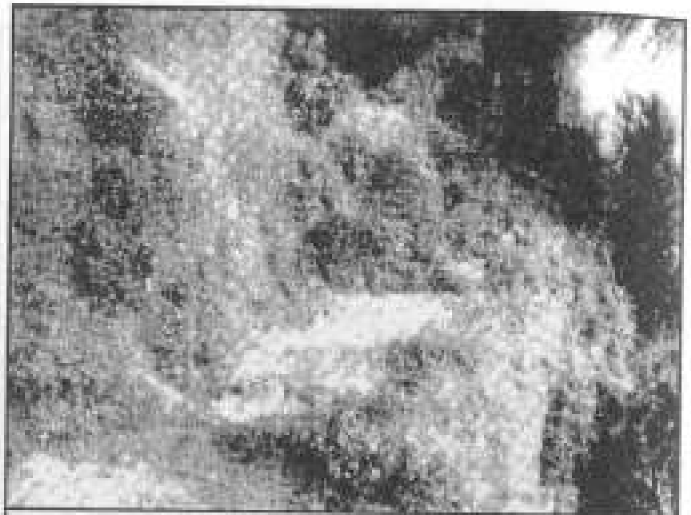

ہستناپور کا قدیم ترین ٹیلہ کھدائی کے بعد

مصطفیٰ کاسل: باغ کا منظر

اسپورٹس اسٹیڈیم

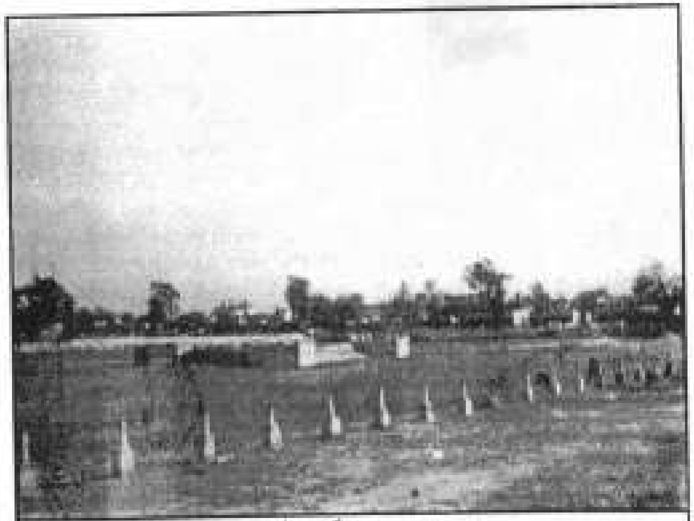

سورج کنڈ

مزار سید کریم الدین شاہ، انچولی

نوچنڈی دیوی کا تاریخی مندر

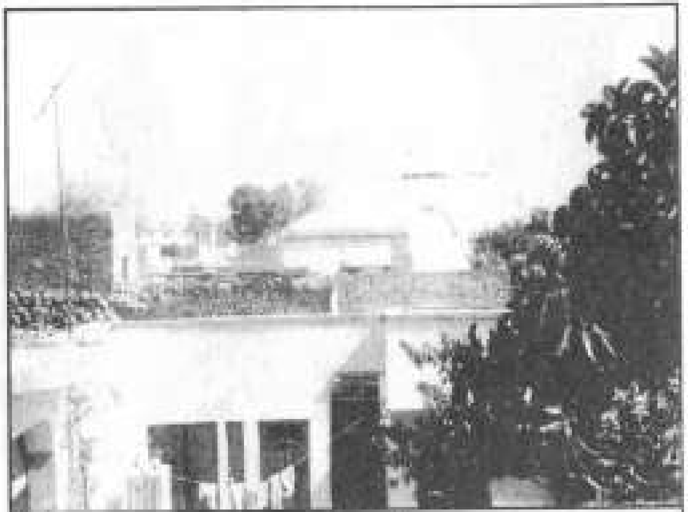

انچولی میں واقع بڑے محل کا مغربی حصہ

کھانڈ تالاب انچولی

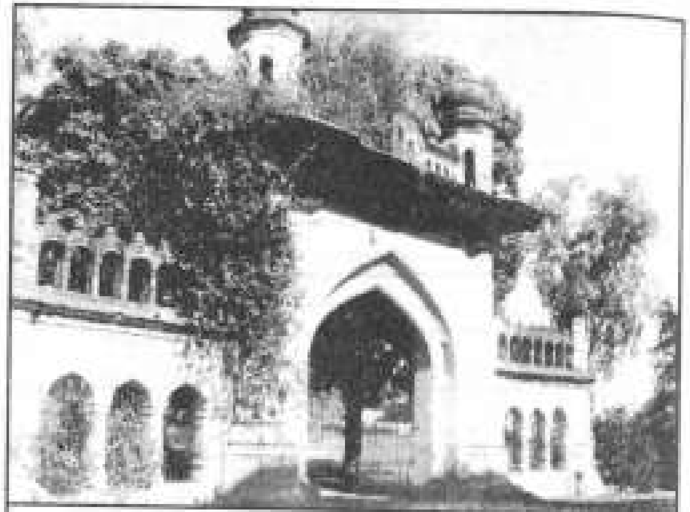

مصطفیٰ کاسل کا دروازہ

میرٹھ کے نو دروازوں میں سے ایک ”شاہ پیر دروازہ“

نمبر شمار	اسمائے گرامی	صفحہ نمبر
۱۔	مولوی سید آفتاب حسن	۵۱
۲۔	بھیا احسان الحق	۵۲
۳۔	نواب احمد سعید چھتاری	۵۳
۴۔	خان بہادر حکیم احمد شجاع	۵۴
۵۔	اختر احمد خاں	۶۰
۶۔	سید اختر الاسلام	۶۲
۷۔	اختر حامد خاں	۶۳
۸۔	اسلم الرحمٰن خاں	۶۶
۹۔	اشرف علی زبیری	۶۸
۱۰۔	افتخار احمد عدنی	۷۱
۱۱۔	افضال منیف	۸۰
۱۲۔	اقبال حسن صدیقی	۸۴
۱۳۔	اکرام احمد خاں	۸۶
۱۴۔	سردار امیر اعظم	۸۸
۱۵۔	بابو برج ناتھ مغل	۹۰
۱۶۔	حافظ بشیر احمد غازی آبادی	۹۱
۱۷۔	ڈاکٹر بھوپال سنگھ	۹۲
۱۸۔	کرنل ٹی۔ ایف۔ اوڈوئل	۹۳
۱۹۔	جاوید برکی	۹۴
۲۰۔	ڈاکٹر جلال انجم	۹۵
۲۱۔	حکیم جمشید احمد خاں	۹۶

۲۲۔	مولانا حامد علی قریشی	۹۸
۲۳۔	پروفیسر حبیب الرحمٰن	۱۰۱
۲۴۔	منشی حکیم الدین	۱۰۵
۲۵۔	خالد وریاست	۱۰۷
۲۶۔	ڈاکٹر خاور جمیل	۱۰۹
۲۷۔	خورشید وارثی	۱۱۳
۲۸۔	ڈاکٹر راحت ابرار	۱۱۷
۲۹۔	رائے بہادر لالہ راموبخ دیال	۱۱۹
۳۰۔	خان بہادر حاجی رشید احمد	۱۲۰
۳۱۔	ڈاکٹر رفاقت شیر خاں	۱۲۲
۳۲۔	رقیہ بیگم	۱۲۳
۳۳۔	ریاست اللہ خاں	۱۲۴
۳۴۔	مولانا ریاض الحسن	۱۲۶
۳۵۔	منشی ریاض الدین	۱۲۷
۳۶۔	پروفیسر ڈاکٹر رضی الدین احمد	۱۲۹
۳۷۔	میر زاہد حسین	۱۳۰
۳۸۔	زین العابدین انصاری	۱۳۱
۳۹۔	قاضی زین العابدین سجاد	۱۳۳
۴۰۔	سرفراز حسین عابدی	۱۳۵
۴۱۔	پروفیسر سعید احمد رفیق	۱۳۷
۴۲۔	سید احمد	۱۴۱
۴۳۔	ڈاکٹر شاہد حسن صدیقی	۱۴۳
۴۴۔	مولانا شرف الدین	۱۴۶
۴۵۔	استاد شریف خاں	۱۴۷

۴۶	شکیل عدنان	۱۴۸
۴۷۔	شمیم احمد	۱۵۰
۴۸۔	صوفی شہاب الدین	۱۵۷
۴۹۔	شیر علی خاں	۱۵۸
۵۰۔	صادق حسین سردھنوی	۱۶۰
۵۱۔	صغیر احمد	۱۶۳
۵۲۔	حکیم طالب احمد	۱۶۷
۵۳۔	طالب حامد خاں	۱۶۸
۵۴۔	میر عابد حسین	۱۷۱
۵۵۔	مولانا شاہ عارف اللہ قادری	۱۷۲
۵۶۔	عائشہ خان	۱۷۴
۵۷۔	حافظ عبدالرحیم	۱۷۵
۵۸۔	عبدالوحید خاں	۱۷۷
۵۹۔	عزیز النساء بیگم	۱۷۸
۶۰۔	پروفیسر ڈاکٹر عقیلہ کیانی	۱۸۲
۶۱۔	علی امام نقوی	۱۸۴
۶۲۔	عنایت شیر خاں	۱۸۵
۶۳۔	غلام احمد مدنی	۱۸۷
۶۴۔	خواجہ غلام الثقلین	۱۹۱
۶۵۔	حافظ غلام رسول	۱۹۳
۶۶۔	شیخ غلام محی الدین	۱۹۴
۶۷۔	فاروق احمد رئیس احمد نظامی	۱۹۵
۶۸۔	فتح محمد خان	۱۹۷
۶۹۔	حکیم فخر الدین	۱۹۹

۷۰۔	حافظ فرید الدین الوجیہہ	۲۰۱
۷۱۔	فضل احمد صدیقی	۲۰۳
۷۲۔	مولانا حافظ فہیم الدین احمد	۲۰۵
۷۳۔	فیروز قیصر	۲۰۷
۷۴۔	قسیم الدین پاشا	۲۰۹
۷۵۔	کرامت شیر خاں	۲۱۱
۷۶۔	مولانا مفتی کفایت اللہ	۲۱۳
۷۷۔	مولانا محمد ادریس	۲۱۵
۷۸۔	مولانا حکیم محمد اسحاق	۲۱۷
۷۹۔	محمد اسلام علوی	۲۱۹
۸۰۔	محمد اقبال عابد	۲۲۱
۸۱۔	محمد اکرم زبیری	۲۲۲
۸۲۔	محمد امداد احمد زبیری	۲۲۳
۸۳۔	قاضی محمد اویس	۲۲۷
۸۴۔	محمد حسین زبیری	۲۲۹
۸۵۔	سید محمد سلیم	۲۳۱
۸۶۔	سید محمد فضل	۲۳۳
۸۷۔	مولانا حکیم محمد مصطفی	۲۳۵
۸۸۔	مولانا محمود الحق صدیقی	۲۳۷
۸۹۔	سید محمود حسن اشرف	۲۳۸
۹۰۔	شیخ مدار بخش	۲۳۰
۹۱۔	پروفیسر مدن موہن	۲۳۱
۹۲۔	پروفیسر مسعود حسن	۲۳۲
۹۳۔	مسعود حسین	۲۳۳

۹۴۔ مصباح الاسلام فاروقی ---------------------------- ۴۳۷
۹۵۔ مظہر یوسف ---------------------------- ۴۳۹
۹۶۔ کرنل مقبول حسن قریشی ---------------------------- ۴۵۳
۹۷۔ ڈاکٹر مقصود حسن ---------------------------- ۴۵۴
۹۸۔ منشی ممتاز علی ---------------------------- ۴۵۵
۹۹۔ ڈاکٹر سید مظفر حسن ---------------------------- ۴۵۷
۱۰۰۔ ناظم حسین صدیقی ---------------------------- ۴۶۱
۱۰۱۔ ڈاکٹر نجم الاسلام ---------------------------- ۴۶۴
۱۰۲۔ مولانا نذیر احمد نجدی ---------------------------- ۴۷۱
۱۰۳۔ نواب الحسن آفاقی ---------------------------- ۴۷۳
۱۰۴۔ نواب حسین زبیری ---------------------------- ۴۷۵
۱۰۵۔ وجاہت شیر خاں ---------------------------- ۴۷۶
۱۰۶۔ خان بہادر حاجی وجیہ الدین ---------------------------- ۴۷۹
۱۰۷۔ وحید الدین احمد ---------------------------- ۴۸۱
۱۰۸۔ وزیر علی ---------------------------- ۴۸۲
۱۰۹۔ وقار احمد زبیری ---------------------------- ۴۸۴
۱۱۰۔ ہارون احمد زبیری ---------------------------- ۴۸۶
۱۱۱۔ ڈاکٹر فریدہ احمد ---------------------------- ۴۸۸
۱۱۲۔ نور احمد میرٹھی (مولف کتاب) ---------------------------- ۴۹۰

مولوی سید آفتاب حسین

مولوی سید آفتاب حسین کے خاندان کا تعلق پتھن ہیڑی ضلع بجنور کے زمین داروں میں سے ہے۔ سادات پتھن ہیڑی سادات بارہ کی شاخ ہے جو موضع سنبھل ہیڑہ سے نکلی ہے۔

مولوی سید آفتاب حسین کے والد سید غازی الدین حسن تھے۔ آپ پتھن ہیڑی میں پیدا ہوئے اور تعلیم حاصل کرنے کے لئے میرپور پہنچے۔ وہاں مدرسہ جعفریہ میں داخلہ لیا۔ وہاں سے کچھ کتابیں پڑھنے کے بعد میرٹھ آگئے۔ میرٹھ میں مدرسہ منصبیہ میں تعلیم پائی۔ میرٹھ سے پھر لاہور تشریف لے گئے اور وہاں پنجاب یونی ورسٹی میں مولوی فاضل کا امتحان دیا اور پورے پنجاب میں اول آئے۔ نواب سید سلطان صاحب کی کوشش سے عربک ہائی اسکول میں مدرس مقرر ہوئے۔ کشمیری دروازے میں قیام کیا اور وہیں سکونت اختیار کی۔ آپ عربک اسکول میں عربی پڑھاتے تھے۔

مولانا امداد صابری نے تحریر کیا ہے کہ "مولوی صاحب نہایت سیدھی سادھی وضع سے رہتے تھے۔ انتہائی ذہین 'ذکی' متین 'خلیق' منکسر مزاج' عابد و متقی انسان تھے۔ آپ نے ایک مسجد اور دینی مدرسہ قائم کیا۔ آپ انجمن شیعہ الصفا دہلی کے بانیوں میں تھے۔ شرعی ڈاڑھی گورا بھبھوکا رنگ اور قد درمیانہ تھا۔ جبہ اور بہت ڈھیلا پائجامہ پہنتے تھے۔ سر پر عمامہ ہوتا تھا۔"

ایک مرتبہ مولوی سید آفتاب حسین مشہور شاعر حضرت مرتضیٰ حسین بیاں میرٹھی سے ملنے گئے۔ جب آپ مکان پر پہنچے تو آواز دی۔ بیان صاحب نے پوچھا کہ کون ہے؟ جواب میں مولوی صاحب نے کہا "آفتاب"۔ بیان صاحب نے کہا مغرب کے بعد آفتاب کیسا؟ مولوی صاحب نے فرمایا "مرتضیٰ کے واسطے رجعت کی ہے۔" اس ایک واقعہ سے آپ کی حاضر جوابی کا اندازہ ہوتا ہے۔

مولوی سید آفتاب حسین صاحب بہترین دانا تھے۔ مطالعہ کا بے حد شوق تھا۔ اکثر راتیں جاگنے میں گزار دیتے تھے۔ آپ نے ۱۳۲۱ھ میں دہلی میں انتقال فرمایا۔ درگاہ پنجہ شریف میں تدفین ہوئی۔ خزینۃ التواریخ میں آپ کا یہ قطعہ تاریخ وفات درج ہے:

چو رحلت نمود آفتاب حسینم   محدث خوش اعمال و پاکیزہ طینت
شنیدم تاریخ ہجری زہاتف   کہ پنہاں شد آفتاب ہدایت ۱۳۲۱ھ

مولوی صاحب نے اپنی یادگار دو صاحبزادے جناب مولانا سید محمد اور سید حسن چھوڑے۔ مولانا سید محمد صاحب عربک اسکول میں پڑھانے کے بعد دہلی کالج میں پروفیسر مقرر ہوئے۔ بعد میں پاکستان ہجرت کی اور کراچی میں سکونت اختیار کی۔

دلی کی یادگار ہستیاں، ص ۹۸

بھیا احسان الحق

بھیا احسان الحق کا تعلق میرٹھ کے ایک نہایت معتبر مخیر اور صاحب ثروت خاندان سے تھا۔ وہ لال کورتی اسٹیٹ میرٹھ کے حافظ عبدالکریم صاحب کے نواسے اور خان بہادر وحید الدین کے بھانجے اور داماد تھے۔ ان کے والد شیخ سبحان بخش نے بعد میں دہلی میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ وہاں ان کا شمار بااثر افراد میں ہوتا تھا۔ شیخ صاحب دہلی میونسپل کمیٹی کے ممبر اور آنریری مجسٹریٹ رہے۔

امراء اور رؤساء کی اولادوں کی طرح بھیا احسان الحق کی تعلیم و تربیت اہتمام سے ہوئی۔ اپنے وقت کے مقتدر علماء کے زیر سایہ اپنے گھر پر ہی انہوں نے علوم و فنون پر دسترس حاصل کی اور درس نظامی کی تکمیل کی۔ انگریزی زبان و ادب پر مکمل عبور رکھتے تھے۔ انگریزی میں بڑے بڑے گریجویٹس سے بدرجہا بہتر استعداد رکھتے تھے۔ چارٹرڈ اکاؤنٹنسی کا امتحان بھی پاس کر چکے تھے۔ وسیع المطالعہ شخص تھے۔ آپ کا ذاتی کتب خانہ بھی شاندار تھا۔ جس میں عربی فارسی اردو اور انگریزی کی ہزار ہا نایاب کتب تھیں۔ اچھے ناقد بھی تھے۔ خواجہ حسن نظامی کی رائے ہے کہ ان کی نظر کتاب یا زیر بحث چیز کے حسن و قبح پر بہت گہری جاتی ہے اور کبھی کھوٹے کھرے کے پرکھنے میں ناکامی نہیں ہوتی۔ وہ اردو زبان کے سب سے پہلے نقاد ہیں جنہوں نے تحریروں کے عیب و ہنر کو اصلیت کی شان سے دکھانا شروع کیا ورنہ پہلے صرف تعریف کے نام پر ریویو و تنقید تھا۔

بھیا احسان الحق نے رسائل کی طرف بھی توجہ رکھی۔ ۱۹۱۳ء میں توحید کے نام سے ایک ہفت روزہ جاری کیا۔ اس کے بند ہونے کے بعد آپ نے رسالہ اسوۂ حسنہ نکالا۔ جس کی اشاعت تین ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ پھر ملا واحدی کے ساتھ سردار دیوان سنگھ مفتون کا روزنامہ ۱۹۱۹ء میں خریدا۔ انوار ہاشمی کے تعاون سے دین و دنیا دہلی سے جاری کیا۔

بھیا احسان الحق وقار اور وضعداری کے امین تھے۔ مولانا امداد صابری نے لکھا ہے کہ بھیا انتہائی وضعدار اور خوددار انسان تھے۔ طمع و لالچ سے ان کو بیر تھا۔ قول اور معاملہ کے بڑے پکے تھے اور ان پر سختی سے قائم رہتے تھے۔ خواہ ان کو کتنا ہی بڑا نقصان کیوں نہ اٹھانا پڑے۔

۱۹۴۷ء کے ہنگامی دور میں آپ کے خاندان کو سخت پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ آپ کے صاحبزادے شبلی مسلم لیگ نیشنل گارڈز کے پرجوش کارکن تھے۔ تقسیم ہند کے اعلان کے بعد دہلی پولیس نے انہیں گرفتار کر کے جیل بھیج دیا۔ حکام نے بہت سختی کی۔ پھر وہ اپنی بیگم کے ساتھ پاکستان آ گئے۔ مگر تندرست نہ ہو سکے۔ اعصابی طور پر بہت کمزور ہو چکے تھے۔ پاکستان میں قائداعظم کے انتقال کی خبر سن کر اللہ کو پیارے ہو گئے۔ بھیا احسان الحق بھی ترک سکونت کر کے پاکستان آ چکے تھے۔

آپ نے کئی کتابیں لکھیں مگر وہ چھپ نہ سکیں۔ اس طرح ان کی زندگی کا یہ رخ پردہ اخفا میں ہی رہا۔

تاریخ صحافت اردو، جلد پنجم ص ۳۲۱ تا ۳۲۷

نواب احمد سعید خاں چھتاری

ضلع میرٹھ میں جن اہم اکابرین نے پہلا سانس لیا ان میں ممتاز رہنما نواب احمد سعید خاں چھتاری بھی شامل ہیں۔ نواب صاحب یو۔پی کے بڑے زمیندار اور مشہور سیاستدان تھے۔ انہوں نے اہم مناصب پر رہتے ہوئے بھی خدمت کو اپنا نصب العین بنائے رکھا۔ نواب چھتاری کی تاریخ ولادت مالک رام نے تذکرہ ماہ و سال میں ماہنامہ "ادیب" جنوری/مارچ ۱۹۹۱ء کے حوالے سے ۱۲ جنوری ۱۸۸۹ء اور سید قاسم محمود نے ۱۲ جون ۱۸۸۹ء تحریر کی ہے۔ آپ کی ولادت باغپت ضلع میرٹھ میں ہوئی۔

نواب احمد سعید خاں چھتاری کے اجداد ہندو راجپوت تھے جنہوں نے شاہجہاں کے عہد میں اسلام قبول کیا۔ آپ کی زرعی جائداد چھتاری ضلع علی گڑھ میں تھی۔ نواب صاحب نے ایم۔اے۔او کالج علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۱۲ء میں اسپیشل مجسٹریٹ کی حیثیت سے آپ کا تقرر ہوا۔ آپ یو۔پی کی صوبائی حکومت میں وزیر داخلہ بھی رہے۔ نواب چھتاری نے ۱۹۲۳ء میں آل انڈیا مسلم راجپوت کانگریس کی صدارت کی۔ پھر آل انڈیا مسلم لیگ میں شامل ہو گئے اور مسلم لیگ کونسل کے رکن منتخب ہوئے۔ اکتوبر ۱۹۳۷ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ لکھنؤ میں شرکت کی۔ ۱۹۲۳ء سے یو۔پی کی صوبائی اسمبلی کے بلامقابلہ رکن منتخب ہوتے رہے۔ ۱۹۳۵ء میں گورنر جنرل کی ایگزیکٹو کونسل کے رکن مقرر ہوئے۔ ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۱ء میں گول میز کانفرنس میں بھی شریک رہے۔ ۱۹۳۲ء سے ۱۹۴۱ء تک بوائے اسکاؤٹ ایسوسی ایشن کے چیف کمشنر رہے۔ ۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۶ء تک حیدر آباد دکن کی وزارت عظمیٰ پر فائز رہے۔ نومبر ۱۹۴۷ء میں ہندوستان اور حیدر آباد کے باہمی تعلقات کے مذاکرات میں نظام دکن کی نمائندگی کی لیکن قاسم رضوی کی "اتحاد المسلمین" کے ہنگاموں کی وجہ سے مستعفی ہو گئے۔

نواب صاحب قیام پاکستان کے بعد بھارت کی راجیہ سبھا کے رکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۶۵ء میں سیدنا طاہر سیف الدین کے انتقال کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے چانسلر مقرر ہوئے۔ آپ نظام حیدر آباد دکن کے چیف ٹرسٹی بھی تھے۔ قائداعظم کے معتمد ساتھی کی حیثیت سے بھی نمایاں مقام رکھتے تھے۔ ۹۳ سال کی عمر میں ۲ جنوری ۱۹۸۲ء کو علی گڑھ میں آپ کا انتقال ہوا۔

اپنی متحرک و فعال شخصیت اور خدمات کے حوالے سے نواب احمد سعید خاں چھتاری ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

انسائیکلوپیڈیا پاکستانیکا ص ۱۶۱

حکیم احمد شجاع

خان بہادر حکیم احمد شجاع

حکیم احمد شجاع کے جد امجد عبدالمجید انصاری فاتح سندھ کے ساتھ ہندوستان آئے تھے۔ ان کا مزار ملتان کے قریب تلبنہ میں ہے۔ خان بہادر حکیم احمد شجاع یکم صفر ۱۳۱۱ھ کو ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوئے جس کا سرمایۂ امتیاز طبابت ہے۔ آپ کے والد ماجد حکیم شجاع الدین محمد اپنے زمانے کے بہت بڑے طبیب، فلسفی اور ادیب تھے۔ سخن فہمی اور سخن گوئی دونوں میں کامل مہارت رکھتے تھے۔ ان کے مرثیوں کا مجموعہ "خزینۂ حزینہ" اور دیوان "داغ ہجراں" طبع ہوئے۔ حکیم احمد شجاع نے اس دور کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے "اس وقت پنجاب میں اردو شاعری ابھی طفولیت کے عالم میں تھی۔ مرزا ارشد گورمانی، میر فیض الحسن اور سید ناظر حسین ناظم کے دم قدم سے پنجاب کے دارالحکومت میں شاعری کا کچھ چرچا ہو چلا تھا۔ مولوی محمد حسین آزاد اور مولانا حالی انہیں ایام میں اردو شاعری کو ایک نئی روش پر چلانے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ ڈاکٹر لائیٹز جو اس زمانے میں محکمۂ تعلیم کے ڈائریکٹر تھے' ان انگریزوں میں سے تھے جو ہندوستانی علوم و فنون کی سرپرستی کا درجہ' نظم و نسق حکومت کے درجے سے کچھ کم نہ سمجھتے تھے۔ ان کی توجہ کی آبیاری سے پنجاب میں اردو کا باغ پھل پھول لا رہا تھا۔"

۱۸۹۶ء کے آخر میں جس وقت حکیم احمد شجاع کے والد نے جہان فانی سے رحلت کی' اس وقت ان کی عمر تقریباً ڈھائی برس کی تھی۔ حکیم شجاع الدین صاحب کے انتقال کے بعد بھی ان کا گھر علم و ادب کا مرکز بنا رہا۔ اس کی ایک بڑی وجہ حکیم احمد شجاع کے عم زاد بھائی حکیم شہباز دین کی مہمان نوازی، منکسر المزاجی اور زبان کی شیرینی تھی۔ ان کے مکان پر تقریباً روزانہ آنے والوں میں سر عبدالقادر، سر محمد اقبال، سر شہاب الدین، خواجہ رحیم بخش، خواجہ کریم بخش، خواجہ امیر بخش، خلیفہ نظام الدین، شیخ گلاب دین، مولوی احمد دین، مولوی محمد حسن، مولانا مفتی عبداللہ ٹونکی وغیرہ شامل تھے۔ اس پس منظر کو بیان کرنے کے بعد حکیم احمد شجاع تحریر فرماتے ہیں "میں نے مبداء فیاض کے کرم سے ایک ایسے گھرانے اور ایسے ماحول میں پرورش پائی جو علم و ادب کا گہوارہ اور فضل و کمال کا منبع تھا ---------- میں نے جو کچھ

مدرسے میں پڑھا ان سے بہت زیادہ ان بزرگوں کی صحبت میں سیکھا۔ علم و دانش کے موتی میں نے کتابوں سے جمع کئے' ان سے بہت زیادہ درخشاں اور آبدار جواہر میں نے ان لوگوں کی زبان سے لوٹے"۔

۱۹۰۰ء میں حکیم احمد شجاع کی والدہ کا انتقال ہوا۔ ان کی وفات کے بعد ان کی تعلیم و تربیت عم زاد بھائی اور بڑے بہنوئی حکیم امین الدین اور بڑی بہن کے زیر سایہ ہوئی۔ انہوں نے فارسی اور عربی کی تعلیم کے لئے مشہور مفسر مولانا شریف علی اور انگریزی ادب کی تعلیم کے لئے پروفیسر لیننگ بارن کی خدمات حاصل کیں۔ احمد شجاع صاحب پہلے ہی سے کچھ کم قابل نہ تھے' ان استادوں کی بدولت علم میں مزید اضافہ۔ آپ نے حافظہ بھی غیر معمولی پایا تھا۔ اس لئے مختلف علوم اور ادب کی مختلف اصناف پر قادر تھے انہوں نے لکھا ہے "ماں کی تربیت' بھائی کی محبت اور استاد کے صحیح طریقہ تعلیم کا ادھر یہ نتیجہ ہوا کہ عبادت کا شوق اور اللہ کے کلام پاک میں تدبر کا ذوق اس درجہ بڑھ گیا کہ مجھے جو لطف ان مشاغل میں آتا تھا' وہ کسی دوسری چیز سے حاصل نہ ہوتا تھا" وہ لکھتے ہیں کہ "میں اپنے والد کے پیرو مرشد خواجہ اللہ بخش تونسوی کی دعا سے پیدا ہوا اور میں نے بچپن ہی میں ان کے دست بابرکت پر بیعت کی۔" وہ اپنے مرشد سے گہری عقیدت و محبت رکھتے تھے۔

حکیم احمد شجاع صاحب نے چھٹی جماعت سے میٹرک تک ماڈل اسکول لاہور میں تعلیم پائی۔ ۱۹۰۹ء میں علی گڑھ کالج میں داخل ہوئے۔ ۱۹۱۱ء میں ایف۔ اے کا امتحان دے کر لاہور آئے اور گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوئے مگر یہاں علی گڑھ کے قیام کی یادوں نے بے چین کئے رکھا اور چند دوستوں کی باہمی مشاورت سے میرٹھ پہنچ کر میرٹھ کالج میں داخلہ لے لیا۔ میرٹھ کے قیام کے دوران انہوں نے ایک بڑا پرلطف وقت گزارا جس کی تفصیل حکیم احمد شجاع نے "خوں بہا" میں لکھی ہے وہ میرٹھ کے حوالے سے لکھتے ہیں "دلی اور میرٹھ کے شریف اور نجیب گھرانوں کی بولی جو یہ لوگ بولتے ہیں' میری زبان پر چڑھ گئی اور وہ شستہ اطوار جو ان لوگوں کی گھٹی میں پڑے تھے' میری طبیعت ثانی بن گئے۔" حکیم احمد شجاع ۱۹۱۳ء میں میرٹھ کالج میں انگریزی ادب اور تاریخ ہند کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے۔ لکھتے ہیں "اسی زمانے میں میرے بہنوئی دیوان سید محمد کا ارادہ حیدر آباد دکن جانے کا ہوا۔ خدا جانے انہیں کیا خیال آیا کہ انہوں نے مجھے ساتھ چلنے کو کہا۔ میری طبیعت بھی اس درس و تدریس کی زندگی سے کچھ اکتا گئی تھی' ان کے ساتھ چلنے کو تیار ہو گیا۔ کالج سے اتنے دن کی رخصت حاصل کرنا آسان نہ تھا۔ میرے نزدیک کسی مشکل کو رستے سے دور کرنے کے دو ہی طریقے ہیں یا انسان اس مشکل پر غالب آجائے یا وہ رستہ ہی چھوڑ دے۔ میں نے کالج کی ملازمت ترک کر دی۔" اپنے قیام میرٹھ کے بارے میں انہوں نے تحریر کیا ہے "علی گڑھ کالج کی خصوصیات علی گڑھ کے ساتھ ہیں لیکن اس زمانے میں میرٹھ کالج بھی اپنے کوائف کے اعتبار سے ایک نمایاں اور ممتاز حیثیت رکھتا تھا میرٹھ کالج کے اساتذہ کا علم و فضل' اس کے طلبہ کی رواداری اور علم دوستی' اس کی مجلس منتظمہ کے ارکان کی مربیانہ مروت اور معارف پروری نے اس کالج کو پنجاب اور یوپی کے ان طلبہ کا مرکز بنا رکھا تھا جو اکتساب علم کے لئے ایک علمی ماحول چاہتے تھے

اور جنہیں پڑھنے لکھنے کی مصروفیتوں کے لئے ایک گوشۂ عافیت درکار تھا۔" انہوں نے میرٹھ کے شہریوں کے طرزِ معاشرت اور عادات و اطوار کے بارے میں اپنا مشاہدہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔" میں نے ہندوستان کے اکثر شہر دیکھے ہیں اور ہندوستان کے مختلف صوبوں میں رہنے والوں سے میرے مراسم ہیں مگر جو فراخ دلی اور بردباری میں نے میرٹھ کے رہنے والوں میں دیکھی' کسی اور میں نہیں پائی جاتی۔ میں اس زمانے میں بھی میرٹھ کے اس مابہ الامتیاز پر غور کیا کرتا تھا اور اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ ہو نہ ہو میرٹھ کی جغرافیائی حیثیت نے اس کے باشندوں میں یہ خواص پیدا کر دیے ہیں۔ میرٹھ پنجاب' یوپی اور دلی کے صوبوں کا مرکزِ اتصال ہے اور لازمی ہے کہ یہاں کے لوگ ان تینوں صوبوں کے باشندوں کی آو بھگت میں تحمل اور تواضع سے کام لیں' جو لوگ تہذیب اور تمدن کے ایک ہی معیار پر ان تینوں صوبوں کے مختلف الطبائع اور مختلف السیر باشندوں کو پرکھتے ہیں۔ وہ اس قدر بردبار اور فراخ دل نہیں ہو سکتے جس قدر میرٹھ کے رہنے والے ہیں---------- میرٹھ کے رہنے والے جغرافیائی تعصب اور تمدنی مغائرت کے زہریلے اثرات سے مصئون اور مامون رہے اور انہوں نے کبھی دلی" پنجاب اور یو۔ پی کے رہنے والوں میں کوئی تمیز روا نہ رکھی' جس سے ایک کو دوسرے سے برتر یا کمتر ہونے کا احساس ہوتا۔ میرٹھ میں نہ تو ہم اجنبی نظر آتے تھے اور نہ ہمیں کوئی بیگانہ سمجھتا تھا۔"

حکیم احمد شجاع نے اپنے تقریباً" تمام شوق پورے کئے۔ میر فیض الحسن دہلوی سے بیڈمنٹن' ٹینس اور انڈور گیمز سیکھے۔ اپنے ماموں شہزادہ رحمل سے پنجہ کشی' کشتی' بنسری بجانا' مرغ' بٹیر اور پتنگ لڑانے میں مہارت حاصل کی۔ نواب شاہ پسند خان سے تلوار اور تیر چلانے' تیرنے اور کھانا پکانے کے فن بقدرِ صلاحیت سیکھے اور میرباز خان سے نیزہ بازی' گھوڑے اور اونٹ کی سواری سیکھی۔ طب سے تعلق تو خاندانی تھا۔ شاعر بھی اچھے تھے اور خوبصورت نثر نگار بھی۔ صحافت سے بھی تعلق قائم رکھا۔ ساحر تخلص فرماتے تھے۔

میرٹھ کالج سے بی۔ اے کرنے کے بعد وہاں استاد بھی رہے اور پھر فریدیہ ہائی اسکول پاک پتن کے نگران مقرر ہوئے۔ ۱۹۱۶ء میں احمد شجاع صاحب چیفس کالج لاہور میں استاد رہے۔ ۱۹۱۸ء میں اسلامیہ ہائی اسکول ہوشیار پور کے ہیڈ ماسٹر اور اس کے ایک سال بعد پنجاب حکومت کے محکمہ تشہیر کے اخبار روزنامہ "حق" کے مدیر بنے۔ ۱۹۱۹ء میں جلیانوالہ باغ کمیشن کے سرکاری ترجمان بھی رہے۔ ۱۹۲۰ء آپ کا تقرر اسمبلی کے مترجم کے طور پر ہوا۔ ۱۹۲۳ء سے ۱۹۴۷ء تک اسمبلی کے اسسٹنٹ سیکریٹری' ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۰ء تک ڈپٹی سیکریٹری اور ۱۹۵۱ء سے ۱۹۶۳ء تک سیکریٹری کی حیثیت سے فرائض انجام دیے۔ ۱۹۶۸ء سے تاحیات مجلس زبان دفتر کے سیکریٹری بھی رہے جو سردار عبدالرب نشتر کی گورنری کے دور میں قائم ہوئی تھی۔

حکیم احمد شجاع نے ایک کتاب " خوں بہا " بھی لکھی جو ۱۹۳۳ء میں لاہور سے شائع ہوئی۔ اس کتاب میں ان کے تحریر کردہ حالات زندگی اور ان کا کلام شامل ہے' نمونہ کلام:

غزل

کوئی چارا ہی نہیں عشق کی بیماری کا
یہ ہے اک سلسلہ انسان کی لاچاری کا

یوں گھٹانا تھا تو اتنا نہ بڑھایا ہوتا
سیکھتے کوئی سلیقہ تو ستم گاری کا

کھو گئے ایک ہی جلوے میں سرِ طور کلیم
کس کو دعویٰ ہے ترے سامنے ہشیاری کا

حشر میں ڈھونڈ رہی ہے تری رحمت مجھکو
یہ بھی اعجاز ہے اک میری گنہ گاری کا

ساحر اب بھی کہیں ملتا ہے تو میخانے میں
کس قدر پاس ہے اس رند کو خودداری کا

فاروق اعظم رضہ

عمر فاروق رضہ وہ آئینہ اطوارِ پیغمبرؐ
وہ جس کی ذات میں تھے منعکس انوارِ پیغمبرؐ
وہ جس کے ہاتھ میں تائیدِ ربانی کی سطوت تھی
وہ جس کا سینہ تھا گنجینۂ اسرارِ پیغمبرؐ

وہ جس کے عزم کے آگے فضائیں کانپ جاتی تھیں
وہ جس کی ایک جنبش سے فضائیں کانپ جاتی تھیں
وہ جس کی چشمِ خشم آلود کی اک برق پاشی سے
جفا کارانِ عالم کی جفائیں کانپ جاتی تھیں

وہ جس کے جوشِ ایماں سے ندا تکبیر کی گونجی
زمیں سے آسماں تک' آسماں سے عرشِ اعظم تک
صدائے باز گشت اس نعرۂ توحید کی اب تک
سنی جاتی ہے ہر صبح و مسا اکنافِ عالم تک

پرکھ اس مردِ حق کے عدل کی کچھ ایسی اچھی تھی
کہ دستور جہاں بانی اسی سانچے میں ڈھلتا تھا
خدا کا خوف کچھ ایسا رچا تھا اس کی فطرت میں
کہ اس کی ہر سیاست سے یہی پہلو نکلتا تھا

جلال اس بے نوائے بوریا ساماں کا ایسا تھا
کہ اس کو دیکھ کر خاقان و کسریٰ سہم جاتے تھے

قدم اس کا کبھی میدان میں بڑھ کر نہ رکتا تھا
کہ اس کے سامنے صحرا و دریا سہم جاتے تھے

دہل جاتے تھے سینے اس کی تکبیروں کی ہیبت سے
خوشا اس کا وہ ایمان میں سینہ سپر ہونا
سعادت سی سعادت ہے لکھا تھا اس کے ہاتھوں سے
نہالِ ملت بیضا کا بابرگ و ثمر ہونا

مساواتِ بشر کے باغ کی وہ آبیاری کی
کہ نخلِ آبروئے نوعِ انساں میں ثمر آیا
ہر اک فرعونِ بے ساماں کی بے سامانیاں جانچیں
پئے داد اس کے آگے جب کوئی بے بال و پر آیا

امیری میں فقیری اور فقیری میں شہنشاہی
امیرالمومنین فاروقِ اعظمؓ کی وراثت ہے
امیرِ قوم ہو کر رات دن خدمت رعایا کی
یہی اک مردِ مومن کی حکومت اور امارت ہے

عہدِ حاضر

عہدِ حاضر کی لڑکیوں سے کہو
نازنیں ، حوروش ، پری اندام
چندر مکھی اور چاند بی بی جی!
ان کی آغوش میں پلے وہ جواں
عصمت و عفت و حیا و وفا!
تیغ زن ، صف شکن ، عدوافگن
ہاں ! تمہاری نظر سے گر دیکھیں
تم کو آزادیاں میسر ہیں
تم تو ہو ہر فن طاق اور بیباک
پر کبھی تم نے اس پہ غور کیا

تم سے پہلے بھی لڑکیاں تھیں بہت
حسن میں ان کے شوخیاں تھیں بہت
دیش کی اپنی بیٹیاں تھیں بہت
خون میں جن کے گرمیاں تھیں بہت
ان کے گھر کی یہ لونڈیاں تھیں بہت
ہند میں ایسی رانیاں تھیں بہت
اگلے وقتوں میں ختنیاں تھیں بہت
پاؤں میں ان کے بیڑیاں تھیں بہت
بے ہنر تھیں وہ بے زباں تھیں بہت
گرچہ جاہل یہ بیبیاں تھیں بہت

تم سے آباد ایک گھر نہ ہوا ان سے آباد بستیاں تھیں بہت

متفرق اشعار

کس کی تلاش ہے کہ ہر اک رہ گذر کو میں
یوں دیکھتا ہوں جیسے کوئی چیز کھو گئی

کچھ آج کمائی کر کچھ ایسی جو کل کو چل کر کام آئے
یاں سب کچھ ہے تو کچھ بھی نہیں، واں کچھ بھی ملا تو سب کچھ ہے

ہیں خدمتِ خلق اور ذکرِ خدا دو کام فقط انسانوں کے
دکھ بانٹ کے اس کے بندوں کا وہ نام جپا تو سب کچھ ہے

فارسی کلام

رازِ ہستی

بیا تا تو گویم رازِ ہستی! کہ ہستی نیست غیر از مے پرستی!
تو عاقل را عاقل و فرزانہ دانی مگر بے ہوش ہستی گر نہ مستی!

حواس

حواس از نفس و ملک تا ذات حواسِ از حسن گلہائے بہار است
بہ آغوشت اگر بینم ہمہ یکست حواست از نصیبش شرمسارات

ماخذ: اردو ہما انسائیکلوپیڈیا پاکستانیکا

اختر احمد خاں

اختر احمد خاں

جناب امیر احمد خاں کے صاحبزادے اختر احمد خاں کی ولادت میرٹھ میں ۱۹۱۵ء میں ہوئی۔ اختر حمید صاحب' اختر حامد خاں اور اختر محمود خاں آپ کے بھائی ہیں۔ تین بہنیں ہیں جن میں سے ایک کا انتقال ہو چکا ہے۔

اختر احمد خاں کے بارے میں اختر حامد خاں نے لکھا ہے "دین کی طرف راغب' دنیا سے دلچسپی واجبی' تمام فرائض خوبی سے نبھائے' بچوں کی تعلیم' شادی اور کاروبار سے فارغ' معقول آمدنی' نماز کے پابند' شروع میں مذہب سے دور' علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سینئر' ممتاز ہاسٹل میں شہرت' شریر لڑکے پناہ مانگتے تھے۔ کھیل اور ورزش کا شوق' ہاکی اور کرکٹ پسندیدہ کھیل۔"

اختر احمد خاں ۱۹۴۱ء میں فوج میں شامل ہوئے۔ یہ جنگ عظیم کا زمانہ تھا۔ آسام میں کپتان رہے اور جنگ کے بعد جاپان اور جرمنی میں میجر رہے۔ قیام پاکستان کے بعد پاک فوج میں گرانقدر خدمات انجام دیں۔ ۱۹۵۲ء میں یوم آزادی کی پریڈ کی کمان کی۔ ۱۹۵۸ء میں ملک میں مارشل لا لگا تو آپ کو کراچی کا نگراں مقرر کیا گیا۔ اختر احمد خاں صاحب نے چیف کمشنر این۔ ایم۔ خان کے ساتھ مل کر کام کیا۔ اصول پسندی مزاج کا حصہ تھی لہٰذا کسی کرپشن میں ملوث نہیں ہوئے اور صاف گوئی کو شعار بنائے رکھا۔ ۱۹۶۹ء میں ۵۱ سال کی عمر میں فوج سے پینشن لے لی اور ڈیفنس سوسائٹی کراچی میں کرائے کے مکان میں رہائش اختیار کی۔ لفٹیننٹ کو آپریٹو کے سیکریٹری کی حیثیت سے ذمہ داریاں قبول کیں۔ ۱۹۷۱ء میں اختر حامد خاں سقوط ڈھاکہ کے بعد جب واپس آگئے تو دونوں بھائیوں نے مل کر تعمیرات کے کام میں ایک دوسرے سے تعاون کیا۔ یہ شراکت ۱۹۷۷ء تک جاری رہی۔

آپ عملی سیاست سے ہمیشہ دور رہے۔ اقتصادیات سے دلچسپی رکھتے تھے۔ مولانا روم اور علامہ اقبال کے کلام کو پسند کرتے تھے۔ اختر احمد خاں کے قریبی ساتھی میجر راجہ نواز' چودھری اوصاف علی' کرنل حکیم' کرنل شاہ محمد وغیرہ ایک ایک کر کے رخصت ہوئے۔ وقت پیری میں کرنل انعام اللہ خان ہی سے مختلف موضوعات پر تبادلہ خیال کر کے توانائی محسوس کرتے تھے۔

۲۲ جنوری ۱۹۹۳ء کی دوپہر کراچی میں اچانک انتقال کیا۔ آپ کی شادی سلطانہ بیگم سے ہوئی تھی جن سے آپ کی اولاد میں سلطان احمد خاں اور جلال احمد خاں کے علاوہ تین بیٹیاں ہیں اور یہ تینوں بہنیں امریکہ میں مقیم ہیں۔

ماخذ: نئے خاکے

انجمن ترقی اردو کراچی

سید اختر الاسلام

سید اختر الاسلام

"چند شناسا ادبی چہرے" جلال افسر سنبھلی کی ایک کتاب ہے جس میں انہوں نے مولوی عنایت رسول مطہر چاند پوری کے قابلِ فخر فرزند اور سید مظفر حسین ظہیر کے برادرِ خورد سید اختر الاسلام صاحب کا سراپا بتاتے ہوئے لکھا ہے "نحیف و ناتواں جسم' جسم کی مقدار سے زیادہ علم' چہرے سے نمایاں ذکاوت و علم اور تفکر و خلوص کے ملے جلے آثار' خوش کردار و خوش اطوار' بڑے بڑے کان' شیریں زبان شیریں بیان' گھنے ابرو' درمیانی آنکھیں' لمبا چہرہ' داڑھی مونچھ صاف' سنجیدہ و متین' بلا کے ذہین' بالوں کے بجائے چاندی کے تار' تجربات و مشاہدات سے مزین گندمی رنگت"۔ سید اختر الاسلام صاحب ادبی ماحول کے پروردہ ہیں۔ موصوف نے اردو تحریک کے فروغ' ادب کے استحکام اور بیباک صحافت کے ذریعہ اذہان کی نشوونما کے لئے خود کو وقف کر رکھا ہے۔ ہر اس مخلص کے لئے آپ کا دستِ تعاون دراز ہے جو مخلصانہ علمی و ادبی خدمات انجام دے رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان سے باہر بھی آپ کا کام و نام غیر مانوس نہیں ہے۔

سید اختر الاسلام صاحب کا آبائی وطن ضلع بجنور کا قصبہ جھالو ہے جو چاند پور کے قریب واقع ہے۔ یہاں یکم ستمبر ۱۹۳۶ء کو آپ کی ولادت ہوئی۔ والد مولوی عنایت رسول مطہر عربی' فارسی اور اردو میں کامل دسترس رکھتے تھے۔ زود گو شاعر بھی تھے اور سو سو اشعار پر مشتمل نقط اور بے نقط سلام اور چاربیت لکھنے میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ اس زمانے میں چاربیت کا کثرت سے رواج تھا۔ آج بھی ہندوستان کے مختلف علاقوں میں مطہر صاحب کے چاربیت شوق و ذوق سے سنے سنائے جاتے ہیں۔

سید اختر الاسلام صاحب والدین کے سایہ شفقت سے بچپن میں ہی محروم ہو گئے تھے۔ بڑے بھائی سید مظفر حسین ظہیر اپنے ساتھ میرٹھ لے آئے اور اپنے بھائی کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کیا۔ اختر صاحب نے ابتدائی تعلیم میونسپل اسکول ہتھیرا بو میں حاصل کی اور فیض عام انٹر کالج سے ہائی اسکول اور انٹر کے امتحانات پاس کئے۔ اپنے بھائی کا معاشی بار کم کرنے کے لئے کمپوزنگ کی طرف متوجہ ہوئے اور اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی کوشش کی۔ پریس میں کام کرنے کے دوران ہی آپ نے تحصیلِ علم کے جذبے کی

تکمیل کے لئے میرٹھ کالج میں بی۔اے کی تعلیم شروع کی اور ڈاکخانہ میں پوسٹ مین ہو گئے۔ ۱۹۵۷ء میں گریجویشن کیا۔ ادب سے موصوف کو شروع سے ہی لگاؤ تھا۔ اس لئے آپ نے ہندی ساہتیہ کار پریم چند کی رکنیت قبول کی اور باقاعدہ کہانیوں کی طرف متوجہ ہو گئے جو اخبارات و رسائل میں شائع بھی ہوئیں۔ ان کہانیوں کے ذریعے شہرت بھی ملی۔ اختر صاحب نے ادبی زندگی کا آغاز طنز و مزاح کے ایک انشائیے سے کیا تھا جو پہلے میرٹھ کالج میگزین میں چھپا اور بعد میں آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہوا۔ کیریئر کے انتخاب کے ضمن میں اختر صاحب نے ٹائپ اور شارٹ ہینڈ بھی سیکھا اور بہتر نوکری کی تلاش میں مختلف ملازمتوں کے لئے درخواستیں دیتے رہے۔ سب سے پہلی تقرری ریاستی محکمۂ خوراک و رسد میں مارکٹنگ انسپکٹر کی حیثیت سے ہوئی مگر یہ عارضی تھی۔ اس تگ و دو میں بھی تعلیم مکمل کرنے کے جذبے نے متحرک رکھا۔ ۱۹۶۳ء میں آپ نے بلونت راجپوت کالج سے انگریزی میں ایم۔اے کیا اور اس کے ساتھ ہی خود کو ملازمتوں کے چکر سے آزاد کراتے ہوئے صحافت میں داخل ہو گئے۔ آپ نے کئی صحافتی اداروں میں کام کیا۔ انگریزی اور اردو کی بہت سی کتب کو ہندی میں منتقل کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس دور میں آپ کی کہانیوں کا مجموعہ "اپانچل" ہندی میں منظرِ عام پر آیا۔ دہلی کے کئی اشاعتی اداروں میں رہ کر کئی قابلِ ذکر کتابوں کے تراجم اور ترتیب و تدوین میں اپنی خدمات پیش کیں جن میں "مضامین و مکاتیب علامہ اقبال" اور کلیاتِ اقبال نمایاں ہیں۔

۱۹۶۷ء میں سید اختر الاسلام کو ممتاز اسکالر اور ماہر تعلیم ڈاکٹر امیر اللہ شاہین صدر شعبۂ اردو' میرٹھ کالج نے اردو ادب میں ایم۔اے کرنے کا مشورہ دیا۔ شاہین صاحب ۵۷-۱۹۵۶ء میں آپ کے کلاس فیلو رہ چکے تھے۔ لہٰذا ان کا مشورہ قبول کرتے ہوئے اردو ادب میں ایم۔اے کرنے کے بعد ڈاکٹر شاہین کی رہنمائی میں پی۔ایچ۔ڈی کرنے کی غرض سے اپنا تحقیقی موضوع "اردو ادب میں تنقیدی اصطلاحوں کا جائزہ" رجسٹر کرایا۔ اس پر کچھ عرصہ کام بھی کیا لیکن ڈاکٹر شاہین کی رحلت کے باعث یہ کام جاری نہ رہ سکا۔

۱۹۷۵ء میں اختر صاحب کی ملاقات میرٹھ کالج کے صدر شعبۂ ہندی ڈاکٹر چندر بلند شرمی سے ہوئی جو "گرولوک سنستھان" کے بانی اور ماہنامہ "ر بھارتی" کے مدیر بھی تھے۔ جب ڈاکٹر چندر نے کھڑی بولی کی لغت "کروشبد کوش" ڈاکٹر ہرودار گی لال شرما اور ڈاکٹر چندر پرکاش ورما کی وساطت سے تیار کرانے کا بیڑا اٹھایا تو اس میں اختر صاحب کو خصوصی طور سے اس میں شامل کیا کہ لسانی اعتبار سے ش ق درست رہے' کیونکہ ہندی داں حضرات تلفظ پر زیادہ توجہ نہیں دیتے۔ ڈاکٹر چندر کی تحریک پر ہی اختر الاسلام صاحب نے ۱۹۷۸ء میں ہفت روزہ "میرٹھ میل" کا اجراء کیا جو آج تک پابندی کے ساتھ جاری ہے۔ یہ اخبار اردو ادب کی بے لوث خدمت کر رہا ہے۔ اردو تحریک کا نقیب بھی ہے۔ اختر صاحب کی ان خدمات کو پذیرائی بھی حاصل ہوئی ہے۔ "خادم الادب" اور "ساہتیہ شری" کے اعزازات اس کا ثبوت ہیں۔ آپ کرنڈ گرافکس' میرٹھ کے پروپرائٹر بھی ہیں۔

اختر حامد خاں

اختر حامد خاں

محلہ اندر کوٹ میرٹھ کے ایک دو منزلہ مکان میں جناب امیر احمد خاں رہائش پذیر تھے۔ وہ محکمہ پولیس میں کورٹ انسپکٹر کی حیثیت سے تعینات تھے۔ ان کے گھر اختر حامد خاں کی ولادت ۱۵ ستمبر ۱۹۲۱ء کو ہوئی۔ آپ معروف سماجی رہنما محترم اختر حمید خاں کے چھوٹے بھائی ہیں جن کو بین الاقوامی سطح پر پہچانا گیا۔

اختر حامد خاں نے ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔ ۱۹۳۳ء میں بلند شہر کے سرکاری اسکول میں داخل ہوئے۔ ۱۹۳۸ء میں میٹرک اور ۱۹۴۳ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی۔ایس۔سی کے امتحانات میں کامیابی حاصل کی۔ بعد میں انجینئرنگ میں داخلہ لیا مگر تعلیم جاری نہ رہ سکی۔ ۱۹۴۳ء میں کلکتہ چلے گئے جہاں اس وقت لوگ قحط کا شکار تھے۔ آپ نے وہاں ایس۔ایم حنیف کے ساتھ مل کر قحط زدہ لوگوں کی مدد کی۔ ۱۹۴۳ء سے ۱۹۴۶ء تک اپنے بڑے بھائی اختر حمید خاں کے ساتھ مل کر ایک کارخانہ چلایا۔ آپ نے ۱۹۴۴ء میں انگریزی ہفت وار رسالہ "ریذیڈنس" علی گڑھ سے جاری کیا۔ بعد میں یہ رسالہ ۱۹۴۶ء میں میرٹھ سے شائع ہوا۔

آپ خاکسار تحریک سے متاثر تھے۔ اس کے لئے کام کر رہے تھے کہ چند پڑھے لکھے لوگوں کا علامہ مشرقی سے بعض معاملات پر اختلاف ہوا۔ ان لوگوں میں پروفیسر کرار حسین اور اختر حمید صاحبان پیش پیش تھے۔ اپنے خیالات کی تشہیر کے لئے "ادارہ الامین" کے زیر اہتمام اردو ہفت روزہ "الامین" میرٹھ شائع کرنا شروع کیا۔ یہ پرچہ بہت مقبول ہوا۔ علامہ مشرقی ان حضرات کو منافقین میرٹھ کا نام دیتے تھے۔ یہ دراصل خاکسار تحریک کا ترقی پسند گروپ تھا۔ ۱۹۴۷ء تک اختر حامد خاں صاحب میرٹھ میں رہے۔ جون ۱۹۴۷ء میں دہلی منتقل ہوئے اور وہاں جامعہ ملیہ کے ثانوی مدرسہ میں سائنس پڑھانے لگے۔ اس وقت اختر حمید خاں مدرسہ کے نگراں تھے۔

اختر حامد خاں صاحب نے ۱۹۴۹ء میں پاکستان میں سکونت اختیار کی۔ یہاں کاشت کاری کی طرف رجحان رہا۔ ۱۹۵۳ء میں مشرقی پاکستان چلے گئے اور کومیلا کو سرگرمیوں کا مرکز بنایا۔ وہاں سقوط مشرقی

پاکستان یعنی ۱۹۷۱ء تک رہے۔ وہاں آپ نے مہاجر کوآپریٹیو کارخانہ قائم کیا جس میں تمیں مہاجر اور اسی بنگالی تھے۔ یہ تمام شیئر ہولڈر تھے۔ اس کارخانے میں زراعت سے متعلق آلات تیار کئے جاتے تھے اور فیبریکیشن کا بھی کام ہوتا تھا۔ یہ کارخانہ ۱۹۵۴ء میں صرف چھتیس روپے سے شروع کیا گیا تھا۔ ۱۹۷۱ء میں جب اسے چھوڑا تو اس وقت چھ لاکھ روپے سالانہ کی بچت تھی۔ وہاں آپ ایک ٹیکسٹائل مل میں منیجر بھی رہے۔

جون ۱۹۷۱ء میں موصوف کراچی آگئے۔ یہاں مکانات بنا کر فروخت کرنے اور پلاٹوں کی خرید و فروخت میں لگے رہے۔ ۱۹۸۰ء میں اورنگی پائلٹ پروجیکٹ شروع ہوا۔ اس کے ڈائریکٹر بڑے بھائی اختر حمید خاں صاحب تھے۔ اس پروجیکٹ میں ان کے معاون رہے۔ ۱۹۹۱ء میں بھائی صاحب سے اختلاف ہوا اور عملی طور پر کنارہ کشی اختیار کرلی مگر وابستگی قائم رکھی اور آج تک ہے۔

اختر حامد خاں صاحب کو لکھنے لکھانے کا شوق ابتدا ہی سے تھا۔ ۱۹۴۲ء میں باقاعدہ مضمون نگاری شروع کی۔ یکے بعد دیگرے آپ کے تیرہ مضامین "تعمیر نو" میں شائع ہوئے۔ ۱۹۴۶ء میں ان مضامین کو "ادارہ الامین" نے کتابی شکل میں شائع کیا۔ ویکلی خاکسار کلکتہ میں بھی لکھتے رہے۔ آپ کو خاکہ نگاری پر دسترس حاصل ہے۔ "چند خاکے" کے عنوان سے کتاب شائع ہوئی۔ پھر چند بزرگ: ۱۹۹۹ء اور نئے خاکے: ۱۹۹۹ء آپ کی مطبوعہ کتب ہیں۔ چند اہم شخصیات پر آپ کا مجموعہ مضامین "چند تبصرے" بھی شائع ہو چکا ہے۔

"گنگا جمنی میدان" بھی آپ کی اہم کتاب ہے جسے ۱۹۹۹ء میں سٹی پریس بک شاپ نے اہتمام سے شائع کیا ہے یہ کتاب ۳۳۵ صفحات پر مشتمل ہے۔

یہ ایک ناول ہے جو آج سے اکتالیس سال پہلے "ساقی" میں چھپا تھا۔ اس ناول کو بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھا گیا تھا۔ خود اختر حامد خاں فرماتے ہیں "میرے خیال میں یہ ناول خاصا اہم ہے اس میں ہندوستان کی تاریخ کے ایک پر آشوب دور کی سچی تصویر ہے ایک ایسے ماحول کا ذکر جو خواب و خیال بن چکا ہے۔ ان محرکات و عوامل کا تذکرہ جو مسلم امت کے دل کی دھڑکن تھے۔ تقسیم ہند کا اثر مسلم اقلیت پر کیا ہوا؟ اس کی ایک جھلک اور سب سے بڑی بات یہ کہ ناول آپ بیتی ہے اور جگ بیتی بھی" اس ناول کے دو ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔

آپ صوفی ازم پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ آج کل مطالعہ ہی واحد مصروفیت ہے۔ کراچی میں مقیم ہیں۔

اسلم۔ آر۔ خان

اسلم الرحمٰن خاں

محترم اسلم الرحمٰن خاں معروف بہ اسلم۔ آر۔ خاں ۱۸؍جون ۱۹۳۴ء کو میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد فضل الرحمٰن خاں مشہور زمیندار عبدالقادر کے بیٹے تھے۔ عبدالقادر صاحب نے ۱۸۹۶ء میں بیرسٹری کے امتحان میں کامیابی حاصل کی تھی۔ اس زمانے میں یہاں تک پہنچنا بہت مشکل ہوتا تھا۔ وہ ڈپٹی کلکٹر رہے اور ۱۹۲۷ء میں ریٹائر ہوئے۔ فضل الرحمٰن خاں کی میرٹھ اور بلند شہر میں کافی جائیداد اور زمین تھی۔

محترم اسلم الرحمٰن خاں نے ابتدائی تعلیم اپنے وطن میرٹھ میں حاصل کی۔ ۱۹۵۳ء میں فیض عام انٹر کالج میرٹھ سے میٹرک کیا اور پھر میرٹھ کالج سے ۱۹۵۶ء میں انٹر کے امتحان میں کامیاب ہوئے۔ ۱۹۶۰ء میں ترکِ سکونت کر کے پاکستان آ گئے۔ کراچی یونیورسٹی سے بی۔ اے کے بعد ایس۔ ایم۔ لا کالج سے ایل۔ ایل۔ بی کیا۔

خاں صاحب نے ۱۹۶۳ء میں جرمن ایئر لائنز لفتھانسہ میں شمولیت اختیار کر کے عملی زندگی کا آغاز کیا اور کراچی اور راولپنڈی میں خدمات انجام دیں۔ ۱۹۷۰ء میں قومی فضائی کمپنی پی۔ آئی۔ اے سے وابستہ ہو گئے۔ کراچی، بنکاک، روم اور پیرس میں تعینات رہے۔ ۱۹۸۰ء میں مارشل لا ریگولیشن کے تحت سبکدوش کر دیے گئے۔ جس کے بعد امریکہ چلے گئے۔ وہاں ۱۹۸۱ء سے ۱۹۸۵ء تک ہاسٹن میں ٹریول بزنس میں مصروف رہے۔ ۱۹۸۶ء میں آپ کی خدمات مصری فضائی کمپنی **ZAZ EGYPTIAN AIRLINE** نے حاصل کرلیں۔ اس وابستگی کو چار سال ہی ہوئے تھے کہ پاکستان میں مارشل لاء کے تحت سبکدوش کیے گئے سرکاری افراد کے معاملات کی چھان بین ہوئی اور اس کے لئے ایک ادارہ قائم ہوا۔ جس نے خاں صاحب کو بحال کر دیا اور آپ مصر سے پاکستان پہنچے اور ۱۹۹۰ء میں پی۔ آئی۔ اے میں سینئر جنرل منیجر کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ دو سال بعد قومی فضائی کمپنی کے ڈائریکٹر ہوئے۔ ۱۹۹۳ء میں مارکیٹنگ کے شعبہ کو سنبھالا۔ ۱۹۹۵ء سے تاحال پی۔ آئی۔ اے کے ذیلی ادارے پی۔ آئی۔ اے انویسٹمنٹ کے مینجنگ ڈائریکٹر کی حیثیت سے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

اسلم الرحمٰن خاں صاحب ایک متاثر کن شخصیت کے مالک ہیں۔ نہایت صاف گو ہیں۔ مصلحتوں کو خاطر میں نہیں لاتے۔ وقت کے پابند ہیں۔ معاملات میں کھرے ہیں۔ اپنے سے چھوٹوں سے بڑی شفقت سے پیش

آتے ہیں اور خیالات کے اظہار میں کسی رکھ رکھاؤ کے قائل نہیں ہیں۔ خاں صاحب کا ایک اہم وصف یہ ہے کہ اپنے ادارے کے مفادات کو اولیت دیتے ہیں۔

آپ کے بھائی افضل خاں نے بھی متحرک زندگی گذاری۔ ایک اور بھائی انور خاں تھے، یہ دونوں جہان فانی سے رخصت ہو چکے ہیں۔ تیسرے بھائی ضیاء الرحمٰن خاں ۱۹۵۷ء سے امریکہ میں ہیں۔ ۱۹۶۶ء میں اسلم خاں صاحب کی شادی محترمہ سیما بنت حلیم خاں صاحب سے ہوئی۔ سیما صاحبہ مشرقی مزاج رکھتی ہیں۔ پابند صوم و صلوٰۃ ہیں اور وظائف و اوراد بھی ان کے معمولات میں شامل ہیں۔ آپ کے دو بیٹے ہیں اور دونوں امریکہ میں تعلیم حاصل کر کے وہاں ذمہ دارانہ زندگی گزار رہے ہیں۔ وجیہ الرحمٰن خاں انفارمیشن ٹیکنالوجی سے متعلق اپنا ادارہ چلا رہے ہیں اور صبیح الرحمٰن کرافٹ فوڈ میں منیجر ہیں۔

خاں صاحب نے دنیا کے متعدد ممالک کا سفر کیا۔ دینی رجحان غالب ہے۔ اللہ رب العزت پر کامل یقین ان کی شخصیت کا جوہر ہے۔ پچیس سے زائد بار عمرے کی سعادت حاصل کر چکے ہیں۔ کتب بینی مشاغل میں شامل ہے۔ زمانہ طالب علمی میں کرکٹ کھیلتے رہے اور اب گالف پسندیدہ کھیل ہے۔ کراچی گالف کلب، کراچی سندھ کلب، کراچی جم خانہ اور اسلام آباد کلب کے رکن ہیں۔ ورلڈ لیڈر گالف کونسل (امریکہ) کے صرف آٹھ ممالک ممبر ہیں خاں صاحب کونسل میں پاکستان کی نمائندگی کرتے ہیں۔ پاکستان گالف فیڈریشن کے سینئر وائس پریذیڈنٹ بھی ہیں۔

۱۹۷۶ء میں اٹلی کی حکومت کی طرف سے صدر اٹلی نے اپنے ملک کے ایک بڑے ایوارڈ **CAVALLIERE** سے آپ کو نوازا ہے۔

اشرف زبیری

اشرف علی زبیری

اپنے گوناگوں اوصاف کے ساتھ جلوہ گر اشرف علی زبیری خدمتِ انسانی کا پیکر، خلوص و محبت کا سراپا اور دل سوزی و درد مندی کے حامل ایک ایسے شخص ہیں جن میں عجز و انکسار بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ عصرِ حاضر کی نفسا نفسی میں دوسروں کے کرب کو سمجھنا اور ان کے مسئلوں کو حل کرنے کی جستجو اور تڑپ میں ایثار کرنا ان کی ذات کا وہ جوہر ہے جو نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔

میرٹھ کی زبیری فیملی نے فکر و عمل کے چراغ روشن رکھنے میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ ماضی قریب میں نواب وقار الملک، مولانا عاشق الٰہی میرٹھی اور ڈاکٹر سر ضیاء الدین اس خاندان کے تابندہ ستارے رہے ہیں۔ ذرا پہلے دیکھیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ کیسے کیسے گوہر نایاب اس قبیلے کے ماتھے کا جھومر رہے ہیں۔ نواب خیر اندیش خاں، نواب سعد اللہ خاں، نواب احمد اللہ خاں اور نواب ابو محمد خاں کی تاریخی خدمات سے کون انکار کر سکتا ہے؟ اسی خاندان کی نمایاں شخصیات میں نواب اشارت علی خاں اور نواب وزارت علی خاں بھی قابل ذکر ہیں۔ نواب اشارت علی خاں، اشرف علی زبیری کے پرنانا اور نواب وزارت علی خاں نانا تھے۔ یہ دونوں عظیم المرتبت شخصیات قلم سے بھی گہری وابستگی رکھتی تھیں۔

حاجی مصطفےٰ علی خاں مرحوم خلف راغب علی خاں کی اولاد میں سات بیٹیاں اور تین بیٹے اشرف علی زبیری، راشد مصطفےٰ زبیری اور خالد مصطفےٰ زبیری ہیں۔ اشرف علی زبیری کمبوہ دروازہ میرٹھ کے اپنے آبائی مکان میں ۱۹۳۵ء میں پیدا ہوئے۔ تعلیم و تربیت کے دور ہی میں اس خاندان کے افراد نے ۱۹۵۱ء میں پاکستان ہجرت کی اور بھاولپور کے قصبہ حاصل پور میں سکونت اختیار کی۔ ۱۹۵۷ء میں کراچی منتقل ہو گئے۔ اشرف علی زبیری نے یہاں آجر دور کی حیثیت سے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ زبیری فیملی کی فلاح و بہبود کے لئے کچھ کر گزرنے کے عزم نے انہیں متحرک کیا۔ ۱۹۶۱ء میں نواب حسن زبیری صاحب کی رفاقت سے انہوں نے زبیری یوتھ ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھی۔ بزرگوں کی شفقت و رہنمائی نے ان کے عزائم کو دو چند کیا اور جلد ہی زبیری فیملی کی پہچان کرانے میں کامیاب ہو گئے۔ اسی دوران دسمبر ۱۹۶۳ء میں

کویت جانے کا موقع میسر آیا۔ آپ اپنے فرائض دوسرے ارکان کو سپرد کر کے تجارتی مقاصد کے تحت کویت چلے گئے۔ بانی جنرل سیکریٹری زبیری یوتھ ایسوسی ایشن کی حیثیت سے آپ کی خدمات یاد رکھی جائیں گی۔ آپ کی سیکریٹری شپ کے دور میں ڈاکٹر یاسین زبیری اور محمد حسین خان ایسوسی ایشن کے صدر رہے۔

کویت میں اشرف زبیری صاحب نے چھوٹے پیمانے پر تجارت شروع کی۔ وہاں ریسٹورنٹ کھولا، کیمیکل کی تجارت کی اور ہیوی کرینوں کا کاروبار کیا اور ترقی کی منزلیں طے کرتے ہوئے اپنی فرم کو مستحکم کیا جو اس وقت فوج کی غذائیات کی سپلائی کی ذمہ دار ہے۔ زبیری صاحب کا شمار کویت کے بڑے کنٹریکٹروں میں ہوتا ہے۔ موصوف کی دیانت سے عبارت پیشہ ورانہ خدمات کو اعلیٰ ترین حلقوں میں بھی احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ آپ کا نام "ہوز ہو" کے ۱۹۹۹ء کے ایڈیشن میں شامل کیا گیا ہے۔ زبیری صاحب کویت میں بھی فلاحی کام جاری رکھے ہوئے ہیں۔

اشرف زبیری صاحب نے ۱۹۶۳ء میں عراق کا سفر کیا اور وہاں باری تعالیٰ سے اس کے گھر کی زیارت و طواف کی دعا کی۔ یہ دعا بارگاہِ رب العزت میں قبول ہوئی اور صرف دو ماہ بعد ہی سعودی عرب جانا ہوا۔ جہاں عمرے کی سعادت حاصل ہوئی اور خانہ کعبہ کے اندر نوافل کی ادائیگی کا موقع ملا۔ امام حرم اور گورنر مکہ سے ملاقات ہوئی۔ یہ اعزاز عموماً سربراہانِ مملکت کو حاصل ہوتا ہے۔ اس سفر کے بعد متعدد بار عمرے کے لئے گئے اور دو بار حج بھی کیا۔ مختلف عرب ریاستوں کا دورہ کر چکے ہیں۔

اشرف علی زبیری اپنی اہلیہ اور بچوں کیساتھ

آپ کی شادی ۱۹۶۸ء میں امتیاز علی خاں کی نورِ نظر روشن امتیاز سے ہوگی۔ آپ کی اولاد میں راغب اشرف زبیری، عالیہ زبیری اور ضیاء اشرف زبیری عملی زندگی میں داخل ہو چکے ہیں۔ راغب اشرف کی شادی شبانہ خاں اور ضیاء اشرف کی شادی سارہ زبیری سے ہوئی ہے جبکہ عالیہ، حسن مصطفےٰ زبیری کی ہم سفر ہیں اور امریکا میں مقیم ہیں۔

محترم اشرف علی زبیری مشرقی اقدار کو عزیز رکھتے ہیں۔ روحانیت سے گہرا تعلق ہے اور اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کا شکر دوسروں کی خدمت کر کے ادا کرتے ہیں۔

جو تھا اسیرِ غم و یاس و حسرت و حرماں
بصد خلوص و وفا ان کے غم گسار ہیں ہم

افتخار احمد عدنی

افتخار احمد عدنی

قدرے دبتا ہوا قد، چھوٹی داڑھی، گندمی رنگ، لمبے بال، روشن آنکھوں پر چشمہ، کشادہ پیشانی، چال میں توازن، گفتگو میں نرمی، ٹھہراؤ اور آہستگی، عموماً سادہ لباس، مہمان نواز، شان و شوکت سے دور، صلاحیتوں کی قدر دان...... یہ ہیں خاندانِ شیفتہ کے درویش صفت فرد اور ممتاز مسلم رہنما نواب محمد اسمٰعیل خاں کے صاحبزادے جناب افتخار احمد عدنی جو ملک کے انتظامی اور علمی حلقوں میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ آپ نے پاکستان کی سول سروس میں رہ کر ملک کی قابلِ قدر خدمت کی اور وراثت میں ملے ہوئے قلم سے رشتے کو قائم رکھا۔

جناب افتخار احمد عدنی کی ولادت ۲۷ اپریل ۱۹۲۱ء کو میرٹھ میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیمی مراحل طے کرتے ہوئے فیض عام انٹر کالج پہنچے جہاں سے ۱۹۳۷ء میں میٹرک کیا۔ میرٹھ کالج سے ۱۹۴۲ء میں بی۔ اے اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ۱۹۴۴ء میں ایم۔ اے (فارسی) کے امتحانات میں کامیابی حاصل کی۔ مقابلے کے امتحانات میں شریک نہیں ہوئے اور بمبئی میں اپنے ماموں واحد محمود صاحب کی ایڈورٹائزنگ ایجنسی سے منسلک ہوئے۔ یہاں ترقی پسند مصنفین کے اجتماعات میں باقاعدگی سے شریک ہوتے رہے۔ بمبئی میں اپنے دو سالہ قیام کے دوران یعنی ۱۹۴۶ء سے ۱۹۴۸ء تک کے دوران عدنی صاحب کی ادبی زندگی کا آغاز ہوا اور ظ۔ انصاری صاحب سے گہرے تعلقات قائم ہوئے جو عمومی سطح کے کبھی نہیں رہے۔ اس کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ آپ نے اپنے مجموعۂ مضامین "اک محشرِ خیال" کا انتساب ظ۔ انصاری کے نام کیا ہے۔

جناب افتخار احمد عدنی نے ۱۹۴۸ء میں پاکستان ہجرت کی اور کراچی تشریف لائے۔ یہاں ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں کام کا آغاز کیا۔ اپنے بڑے بھائی جی۔ اے۔ مدنی کے اصرار پر سی۔ ایس۔ پی کے امتحان میں شریک ہوئے جس کی تربیت مشرقی پاکستان اور کینیڈا میں ہوئی۔ اس طرح ۱۹۵۰ء میں سول سروس آف پاکستان میں شامل ہوئے۔ دو سال بعد اسسٹنٹ کمشنر راولپنڈی کی حیثیت سے تقرر ہوا۔

سکھر اور میانوالی میں ایس۔ ڈی۔ ایم اور لاہور میں چیف سیکریٹری پنجاب کے دفتر میں انڈر سیکریٹری پولیٹیکل امپلو رہے۔ اس کے بعد ۱۹۵۶ء میں ڈیرہ غازی خاں میں ڈپٹی کمشنر کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ یہاں تین سالہ خدمات کے دوران پاک و ہند مشاعرہ کرایا جس میں برصغیر کے تمام اہم شعراء نے شرکت کی جن میں حضرت جگر مراد آبادی بھی تھے۔ یہاں سے پھر لاہور تبادلہ ہوا اور ایڈیشنل سیٹلمنٹ کمشنر مقرر ہوئے۔ اس عہدے پر دو سال رہے اور مہاجرین کی آبادکاری کے لئے یادگار خدمات انجام دیں۔ ۶۲-۱۹۶۱ء میں فنانس ڈیپارٹمنٹ میں ڈپٹی سیکریٹری بنائے گئے۔ ۱۹۶۲ء میں عدنی صاحب کا تقرر جوائنٹ رجسٹرار کوآپریٹیو سوسائٹیز ہوا۔ آپ ہی کی کوششوں سے پاکستان رائٹرز کوآپریٹیو سوسائٹی قائم ہوئی۔ ۶۳-۱۹۶۲ء میں غلام محمد بیراج میں ڈائریکٹر اور ۶۵-۱۹۶۳ء میں پلاننگ کمیشن میں ڈپٹی سیکریٹری ایڈمنسٹریشن رہے۔ او اینڈ ایم میں خدمات انجام دیں پھر فلڈ ریلیف کمشنر بنائے گئے اور مشرقی پاکستان سے آنے والوں کے مسائل کے حل میں مدد دی۔ مشرقی پاکستان کو چھوڑ کر جانے والے بنگالیوں کی جائداد کا انتظام کرنے والی کمیٹی کے چیئرمین بھی رہے۔ سیکریٹریٹ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ کراچی کے ڈائریکٹر رہنے کے بعد ۱۹۷۸ء سے آٹھ سال تک نیپا کراچی کے ڈائریکٹر رہے اور یہیں سے ۱۹۸۶ء میں وظیفہ یاب ہوئے۔ نیپا کو از سر نو منظم کر کے ایک مثالی ادارہ بنانے میں افتخار احمد عدنی صاحب نے دن رات کوششیں کیں۔ اس کی تعمیر و توسیع میں بھی ان کی مساعی شامل ہیں۔ اس ادارے نے اس حد تک ترقی کی کہ مختلف دوسرے اداروں میں بھی اس انداز کو اپنایا گیا۔ آپ نے یہاں ادبی و ثقافتی تقاریب کا اہتمام کر کے نیپا کو کراچی کا ایک اہم مرکز بنایا۔ اکثر عدنی دانشور، شعراء و ادباء یہاں قیام کو پسند کرتے ہیں۔ اسی دور میں آپ کو غالب کی فارسی غزلوں کا ترجمہ کرنے کا موقع ملا اور یہ کام آہستہ آہستہ آگے بڑھتا رہا۔

جناب افتخار احمد عدنی نے ملازمت سے سبکدوشی کے بعد "اک محشر خیال" کے عنوان سے اپنی پرانی تحریروں کو ۱۹۸۷ء میں شائع کیا۔ یہ کتاب ۲۲۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اپنے عزیز دوست ظ۔ انصاری کی غیر متوقع وفات سے متاثر ہو کر آپ نے اپنی یادداشتیں قلم بند کرنا شروع کیں جو ظ۔ انصاری کے علاوہ جوش ملیح آبادی، جگر مراد آبادی اور بابا ذہین شاہ تاجی سے متعلق ہیں۔ یہ سلسلہ مضامین ۱۹۹۱ء سے تقریباً تین سال تک ماہنامہ "قومی زبان" میں جاری رہا۔ اس دوران کچھ مضامین زندگی کے مختلف گوشوں پر غالب کے اشعار کے حیرت انگیز اطلاق کا تماشہ دیکھ کر لکھے جو ۱۹۹۵ء میں "غالب شناسی کے کرشمے" کے عنوان سے شائع ہوئے۔ ۲۳۲ صفحات پر محیط یہ کتاب غالبیات میں ایک اہم اضافہ ہے۔ "غالب کی فارسی غزلوں سے انتخاب ترجموں کے ساتھ" نہایت اہتمام سے شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب میں شامل غالب کی فارسی غزلوں کا اردو ترجمہ افتخار احمد عدنی اور انگریزی ترجمہ رالف رسل نے کیا ہے۔ یہ کتاب انجمن ترقی اردو پاکستان کے تعاون سے پاکستان رائٹرز کوآپریٹیو سوسائٹی نے شائع کی ہے۔ جناب عدنی کے فارسی اشعار غالب کے اردو منظوم تراجم اور غالب شناسی پر مشاہیر ادب کی چند آراء سے اقتباسات دیکھئے :

ڈاکٹر فرمان فتح پوری : عدنی صاحب کی ذہانت، محنت اور ان کی تخلیقی قوت اور غالب کے بارے میں ان کا مطالعہ ایک چھوٹے سے مضمون سے معلوم ہو جاتا ہے۔ میں ان کے اس چھوٹے سے مضمون کو پڑھ کر ان کی بصیرت کا قائل ہوا۔ میں یہ بات یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ انہوں نے غالب کو پوری طرح سے پڑھا ہے۔ میں یہ کہوں گا کہ غالب پر تحقیق کرنے والوں کے لئے عدنی صاحب نے نہایت عمدہ کوشش کی ہے۔

امجد اسلام امجد : اردو قارئین کی گذشتہ دو تین نسلیں آہستہ آہستہ شعری زبان کے فارسی پس منظر سے اس قدر بے گانہ ہو گئی ہیں کہ اب فارسی کا شعر بھی لاطینی محسوس ہوتا ہے۔ ایسے میں افتخار عدنی صاحب نے غالب کا فارسی غزلوں سے جو یہ خوبصورت انتخاب کیا ہے اور پھر اسے دو آتشہ بنانے کے لئے اس کا منظوم اردو ترجمہ بھی شائع کیا ہے تو یہ ایک بہت ہی مثبت اور خوش آئند اقدام ہے کہ اس کے توسط سے نہ صرف ہم غالب کی منتخب فارسی شاعری سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں بلکہ اس ٹوٹے ہوئے رشتہ کی بازیافت کی خواہش بھی دلوں میں پیدا ہوتی ہے جسے جوڑنے سے بہت سی ایسی پرانی چیزیں ہمیں زیادہ بہتر اور صاف نظر آ سکتی ہیں جن کا بہت گہرا تعلق اکیسویں صدی میں مسلمان ممالک کے باہمی تعلق اور اشتراک عمل سے بھی ہے۔

احمد ہمدانی : جہاں تک "غالب شناسی کے کرشمے" کا تعلق ہے تو میرے خیال میں اس کی بڑی خوبی تو یہ ہے کہ اس میں غالب شناسی بھی ہے اور تصوف سے آگاہی بھی۔ عدنی صاحب کی تصوف پر گہری نظر ہے اس لئے انہوں نے نہایت خوبصورت انداز میں اس مشکل موضوع کو بیان کیا ہے۔ تصوف اور فلسفے میں بڑا فرق ہے۔ اس کتاب کی خصوصیت یہی ہے کہ غالب کی جو دو خصوصیات تصوف اور شاعری ہیں، یہ دونوں اس کتاب میں موجود ہیں۔ نہ صرف کتاب میں موجود ہیں بلکہ عدنی صاحب کی زندگی کا حصہ بھی ہیں۔

پروفیسر سحر انصاری : میں نے عدنی صاحب کے سلسلے میں سب سے زیادہ یہ بات محسوس کی ہے کہ انہوں نے صرف ترجمہ ہی نہیں کیا بلکہ ترجمانی کا ایک پہلو بھی رکھا ہے۔ جس سے ایک نئی بحث سامنے آتی ہے۔ عدنی صاحب نے تخلیقی انداز میں کلام غالب کا فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ اس کی بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ وہ ترجمے میں لب و لہجہ اور مزاج کو غالب سے قریب تر رکھتے ہیں۔ اسے پڑھتے ہوئے یہ محسوس نہیں ہوتا کہ یہ ترجمہ ہے بلکہ وہ لسانی کیفیت جو غالب کے اپنے کلام میں ملتی ہے۔ اس کو باقی رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

شخصیات سے متعلق جناب افتخار احمد عدنی کے مضامین کا مجموعہ "رنگا رنگ بزم آرائیاں" اور غالب کے فارسی کلام کا اردو منظوم ترجمہ "نقش ہائے رنگ رنگ" زیر اشاعت ہیں۔ آپ کی دو کتابوں کے

علاوہ حمد و حمدیت : اہینِ شاہ تاجی "افکارِ پریشاں : ایم۔ آر۔ کیانی 'ایک جج ہنس بھی سکتا ہے : ایم۔ آر۔ کیانی 'سات سمندر پار : اختر ریاض الدین 'جمیل الدین عالی کی نثر نگاری : عبدالعزیز ساحر 'کہتے ہیں جس کو عشق : نجم الانوار الحق 'تاریخ مشغلۂ لاحاصل : جمیل الدین عالی اور پھول کی زبان : نجم الانوار الحق شائع کی ہیں۔ انگریزی کی دس سے زائد کتب بھی یہ ادارہ شائع کر چکا ہے۔

آپ تین بھائی اور چھ بہنیں ہیں۔ بی۔ اے۔ مدنی اور ٹی۔ اے۔ خاں کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ بہنوں میں اشفاق زمانی زوجہ اختر محمد خاں (دولت پور ضلع بلند شہر کے رئیس)' آفاق زمانی زوجہ نواب احمد قریشی' ارجمند زمانی رفیعہ زوجہ ملک بشیر احمد' اختر زمانی رضیہ زوجہ خواجہ مشتاق الٰہی' اعجاز زمانی عطیہ زوجہ شجاعت حسن خاں اور اقبال زمانی زوجہ محمد شفیع جنجوعہ ہیں۔ مدنی صاحب کی شادی ۱۹۴۳ء میں خالہ زاد بہن وحید النساء بیگم سے ہوئی۔ جن کے بطن سے دو لڑکے خالد افتخار اور عمر افتخار اور ایک بیٹی فاطمہ اشرف ہوئے۔ خالد افتخار انتقال کر چکے ہیں۔

کلامِ غالب (فارسی)

حمد

اے بہ خلد و ملا خوئی تو ہنگامہ زا
باہمہ در گفتگو' بے ہمہ با ماجرا

شاہد حسن ترا در روش دلبری
طرہ پر خم صفات' موئے میاں ماسوا

دیدہ وراں راکند دید تو بینش فزوں
از نگہ تیز رو گشتہ نگہ تو تیا

آب تہ جوشش بروز خون سکندر ہدر
جاں نپذیری بہ ہیچ نقد خضر ناروا

بزم ترا شمع و گل خستگی بوتراب
ساز ترا زیر و بم واقعہ کربلا

خلد بہ غالب سپار زانکہ دراں روضہ در
نیک بود عندلیب خاصہ نو آئیں نوا

اردو ترجمہ

ہو وہ خلد یا ملا' خو تری ہنگامہ زا
سب سے تری گفتگو' امر میں سب سے جدا

شاہدِ حسنِ ازل تیری عجب دلبری
طرۂ صفاتِ قدیم' موئے کمر ماسوا

بینشِ دیدہ وراں دید سے تیری فزوں
تیز نگاہی سے ہے ان کی نظر تو تیا

آبِ بقا کے قریں' خون سکندر ہدر
ہدیۂ جاں ناپسند' نقد خضر ناروا

شمع تری بزم کی خستگی بوتراب
نغمہ ترے ساز کا واقعۂ کربلا

زیبِ چمن کے لئے' خلد میں غالب کو رکھ
چاہیے اک عندلیب اس میں خوش آئیں نوا

نعت

حق جلوہ گر ز طرز بیان محمدؐ است
آرے کلام حق بزبان محمدؐ است

آئینہ دار پرتو مہر است آفتاب
شان حق آشکار ز شان محمدؐ است

تیر قضا ہر آئینہ در ترکشِ حق است
اما کشاد آں ز کمانِ محمد است

دانی اگر معنیٔ لولاک وا رسی
خود ہر چہ از حق است ازان محمد است

ہر کس قسم بدانچہ عزیز است میخورد
سوگند کردگار بجانِ محمد است

واعظ حدیث سایہ طوبیٰ فرو گزار
کاینجا سخن ز سروِ روان محمد است

بنگر دو نیمہ گشتن ماہ تمام را
کاں نیمہ جنبشے ز بنان محمد است

در خود ز نقش مہر نبوت سخن رود
آں نیز نامور ز نشان محمد است

غالب ثنائے خواجہ بیزداں گزاشتیم
کاں ذات پاک مرتبہ دان محمد است

اردو ترجمہ

جلوہ ہے حق کا طرزِ بیانِ محمدی
ہاں ہے کلامِ حق بزبانِ محمدی

سورج کی روشنی کا ہے آئینہ دار چاند
شانِ خدا کا عکس ہے شانِ محمدی

ترکش میں حق کے تیرِ قضا ہے نہاں مگر
پرواز اس کی ہے بکمانِ محمدی

اس کے سوا ہے معنیٔ لولاک اور کیا
آیات حق ہیں جملہ نشانِ محمدی

کھاتے ہیں سب اسی کی قسم جو عزیز ہو
سوگند ہے خدا کی بجانِ محمدی

واعظ بیان سایۂ طوبیٰ نہ کر جہاں
ہو گفتگوئے سروِ روانِ محمدی

دو ٹکڑے ہوتا چاند کا کیا چیز ہے مگر
اک جنبشِ خفیف بنانِ محمدی

ہے افتخارِ مہر نبوت بھی کہ وہ
معروف ہے بطورِ نشانِ محمدی

غالب ثنائے خواجہ کو یزداں پہ چھوڑ دے
ہے بس وہی تو مرتبہ دانِ محمدی

غزل

تا ز دیوانم کہ سرمست سخن خواہد شدن
این مے از قحط خریدارے کہن خواہد شدن

کوکبم را در عدم اوج قبولے بودہ است
شہرتِ شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن

ہم سواد صفحۂ مشک سودہ خواہد بیختن
ہم ز دود آہم ناف آہوئے ختن خواہد شدن

مطرب از شعرم بہ ہر بزمے کہ خواہد زد نوا
چاکہا انجار جیب پیرہن خواہد شدن

حرف حرفم در مذاق فتنہ جا خواہد گرفت
دستگاہ ناز شیخ و برہمن خواہد شدن

بے چہ می گویم اگر این است وضع روزگار
دفتر اشعار باب سو ختن خواہد شدن

ورنہ ہر حرف غالب بیہودہ ام میخانہ
ناز دیو انم کہ سرمست سخن خواہد شدن

اردو ترجمہ

ہے کوئی جو ہو مرے دیوان سے مستِ سخن
کاہوں کے قحط سے ہو جائے گی یہ مے کہن

میرے کوکب کو عدم میں . تھا عجب اوجِ قبول
بعد میرے ہو گا مشہورِ جہاں میرا سخن

کم نہ ہو گی مشک سے خوشبو مری تحریر کی
جب دواتِ کلک ہو گی نافِ آہوئے ختن

مطربانِ خوش نوا چھیڑیں گے جب میری غزل
چاک ہو جائیں گے ہر محفل میں کتنے پیرہن

وہ مذاق فتنہ ہو گا استعاروں میں مرے
میرا ہر ایک شعر ہو گا نازِ شیخ و برہمن

کیا کہا میں نے ا نہ جانے کب یہ وضعِ روزگار
دفترِ اشعار کو ٹھہرائے وقفِ سوختن

میرے ہر اک حرف کی = میں ہے غالب میکدہ
ہے کوئی جو ہو میرے دیوان سے مستِ سخن

رباعی

فارسی

گر ذوق سخن بدہر آئین بودے
دیوان مرا شہرت پروین بودے
غالب اگر این فن سخن دین بودے
ان دین را ایزدی کتاب این بودے

اردو ترجمہ

ہاں ذوق سے عالم جو فروزاں ہوتا
ہر شعر مرا نیرِ تاباں ہوتا
اشعار پہ ایمان جو لاتی مخلوق
غالب مرا دیوان ہی قرآں ہوتا

ماخذ : غالب شناسی کے کرشمے

نواب اسماعیل خان روڈ کراچی

محمد افضال منیف

افضال منیف

ممتاز ماہر اقتصادیات و منصوبہ بندی، علم دوست، ہر شخص کی خدمت کے لیے ہمہ وقت تیار اور سراپا اخلاص و ایثار محترم افضال منیف کے نام و کام سے کوئی بے خبر نہ ہوگا۔ آپ ہر دل عزیز سماجی کارکن بھی ہیں اور متعدد مالیاتی، علمی، سماجی، تعلیمی اور ثقافتی اداروں سے ذمہ دارانہ حیثیت سے منسلک ہیں۔ یہ دیکھ کر حیرت بھی ہوتی ہے کہ اتنی مختلف جہتوں میں کام کرتے ہوئے بھی چہرے پر تھکن یا ناگواری کا کوئی تاثر نہیں ملتا۔

محترم افضال منیف ۱۰ ستمبر ۱۹۳۶ء کو اپنے ننہیال قصبہ شیرکوٹ تحصیل دھامپور ضلع بجنور (یو۔پی) میں پیدا ہوئے۔ آپ کے نانا شیخ صبغت اللہ ضلع بجنور کی معروف شخصیت اور شیرکوٹ کے رئیس و جاگیردار تھے۔ آپ کے والد محترم الحاج محمد حنیف نے اٹاوہ اور علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی اور صنعت و تجارت کے پیشے سے منسلک رہے۔ میرٹھ میں بیگم برج کے قریب وہ قیام پذیر تھے۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران کاروباری ضروریات کے تحت پہلے دلی اور پھر کلکتہ منتقل ہوئے۔ ان کی اولاد میں چھ بیٹے محمد افضال منیف، افضل منیف، محسن منیف، عاصم منیف، کاظم منیف اور ہاشم منیف کے علاوہ چار بیٹیاں ممتاز جہاں، اعجاز رضوان، نگار مرزائی اور رعنا شمیم ہیں۔ افضال منیف صاحب کے دادا ڈاکٹر عبدالطیف یو۔پی میں سول سرجن تھے۔

آپ نے ابتدائی تعلیم شیرکوٹ، دھامپور، علی گڑھ اور بریلی کے علاوہ فیض عام ہائی اسکول میرٹھ سے حاصل کی۔ پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد اپنے والدین کے ہمراہ ستمبر ۱۹۴۸ء میں نقلِ مکانی کی اور کراچی میں سکونت اختیار کی۔ اسی سال سٹی کمرشل ہائی اسکول میں نویں کلاس میں داخل ہوئے اور یہیں سے میٹرک کیا۔ بعد ازاں گورنمنٹ کالج آف کامرس اینڈ اکنامکس میں داخلہ لیا اور ۱۹۵۴ء میں کراچی یونیورسٹی سے بی۔کام کرنے کے بعد ایم۔کام، ایل۔ایل۔بی میں داخل ہوئے۔ ۱۹۵۶ء میں کراچی یونیورسٹی سے ایم۔کام کی سند حاصل کی اور اسی سال یونیسکو کی عالمی کانفرنس میں پاکستان کی نمائندگی کا

اعزاز حاصل کیا۔ ۱۹۵۸ء میں چارٹرڈ اکاؤنٹینسی کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۶۱ء میں جب انسٹی ٹیوٹ آف چارٹرڈ اکاؤنٹینٹس قائم ہوا تو اس کے ایسوسی ایٹ ممبر بنے اور سادرن ریجنل کمیٹی کے ممبر اور بعد ازاں اس کے پہلے اعزازی سیکریٹری اور اس کے بعد چیئرمین منتخب ہوئے۔ اسی سال اکاؤنٹ اور آڈٹ کے پیشے سے منسلک ہوئے اور خود اپنا دفتر منیف اینڈ کمپنی چارٹرڈ اینڈ آڈیٹرز کے نام سے کراچی میں قائم کیا۔ آج تک موصوف اسی پیشے سے متعلق ہیں۔

افضال منیف صاحب کی پیشہ ورانہ تنظیموں سے وابستگی آپ کے اپنے پیشے سے مخلص ہونے کا ثبوت ہے۔ آپ ۱۹۶۳ء میں انسٹی ٹیوٹ کی نیشنل کونسل کے ممبر منتخب ہوئے اور مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ ۱۹۶۸ء میں انسٹی ٹیوٹ کی ایجوکیشن کمیٹی کے چیئرمین ہوئے۔ اس عہدے پر مسلسل بیس سال تک خدمات انجام دیں۔ ۱۹۶۵ء میں انسٹی ٹیوٹ آف بزنس ایڈمنسٹریشن (I B A) کراچی کے اعزازی لیکچرار مقرر ہوئے اور اس حیثیت میں کئی سال تک اعزازی طور پر تدریسی خدمات انجام دیں۔ اس دوران آپ کراچی یونیورسٹی، انسٹی ٹیوٹ آف چارٹرڈ اکاؤنٹینٹس آف پاکستان، انسٹی ٹیوٹ آف بزنس ایڈمنسٹریشن اور متعدد پیشہ ورانہ اداروں کے ممتحن اور ہیڈ ممتحن رہے اور ان اداروں کی تعلیمی کمیٹیوں سے منسلک رہے۔ کراچی یونیورسٹی کے کامرس اور بزنس ایڈمنسٹریشن کے شعبوں کے بورڈ آف گورنرز کے ممبر رہے اور مختلف عہدوں پر کام کیا۔ ۱۹۶۸ء میں پاکستان کی نمائندگی کرتے ہوئے پیرس میں تیسری عالمی کانفرنس برائے اکاؤنٹینٹس میں شریک ہوئے۔ اسی سال ساؤتھ ایشین فیڈریشن آف اکاؤنٹنٹس (S A F A) میں اپنے ملک کے نمائندے کی حیثیت سے شرکت کی اور اس کی متعدد کمیٹیوں کے لیے منتخب ہوئے۔ ایجوکیشن کمیٹی کے چیئرمین رہے۔ انسٹی ٹیوٹ آف کاسٹ اینڈ مینجمنٹ اکاؤنٹنٹس اور اسی ادارے کے چارٹرڈ اکاؤنٹینٹس کی مشترکہ کمیٹیوں میں مختلف عہدوں پر خدمات انجام دیں۔ افضال منیف صاحب نے ان خدمات کے دوران نیپال، سری لنکا اور ہندوستان وغیرہ میں متعدد کانفرنسوں اور سیمیناروں میں اپنے وطن کی نمائندگی کا فریضہ انجام دیا اور مقالات پڑھے، جن کو پذیرائی حاصل ہوئی۔

۱۹۶۸ء میں اپنی آڈٹ فرم کی ایک شاخ لاہور اور ۱۹۷۰ء میں دوسری شاخ راولپنڈی میں قائم کی اور فرم کا نام تبدیل کرکے منیف ضیاالدین اینڈ کمپنی رکھا۔ آپ کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ ۱۹۶۱ء سے ۱۹۸۰ء تک انسٹی ٹیوٹ آف چارٹرڈ اکاؤنٹنٹس کی ریجنل کمیٹی اور کونسل کے لگاتار ممبر منتخب ہوئے اور صدر بھی رہے۔

افضال منیف صاحب زمانہ طالب علمی ہی سے سیاسی رجحان رکھتے ہیں۔ اسکول، کالج اور یونیورسٹی کی سیاست میں حصہ لیتے رہے اور اندرون و بیرونِ ملک متعدد کانفرنسوں اور سیمیناروں میں پاکستان کے مندوب اور آزادانہ حیثیت میں شرکت کرتے رہے ہیں۔ ۱۹۷۸ء میں منعقد ہونے والے بلدیاتی انتخابات میں آپ نے بھرپور حصہ لیا اور کراچی کنٹونمنٹ بورڈ کے ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی سے ممبر منتخب

ہوئے۔ بعد ازاں نائب صدر چنے گئے۔ اس عہدے پر کئی سال فائز رہے۔ ۱۹۸۹ء میں حکومت سندھ کے وزیر مقرر ہوئے۔ مہاجر قومی موومنٹ کے ٹکٹ پر بھاری اکثریت سے سندھ صوبائی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے اور سندھ حکومت میں وزیر برائے کچی آبادی، لوکل گورنمنٹ اور ترقی و منصوبہ بندی مقرر ہوئے۔ ۱۹۹۳ء تک خدمت کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ بعد میں پہلے وزارت اور پھر سندھ اسمبلی کی رکنیت سے مستعفی ہو گئے۔ دورانِ وزارت آپ نے کئی کارہائے نمایاں انجام دیے اور حکومت سندھ کی متعدد کمیٹیوں میں نمائندگی کی جن میں ورلڈ بینک اور دیگر مالیاتی ادارے شامل ہیں۔ اس دوران آپ نے متعدد ترقیاتی منصوبوں کو سندھ کے ترجیحاتی منصوبوں میں شامل کرایا جو مفید ثابت ہو رہے ہیں۔ سندھ کے دیہی و شہری عوام کی بلا امتیاز خدمت نے آپ کی مقبولیت میں بھی اضافہ کیا۔

تعلیمی شعبہ میں بھی افضال منیف صاحب کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ ۱۹۸۶ء میں آپ بھاری اکثریت سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے اعزازی خازن منتخب ہوئے۔ اس عہدے پر تادمِ تحریر مسلسل منتخب ہوتے چلے آ رہے ہیں۔ ۱۹۹۱ء میں ہمدرد یونیورسٹی کے قیام کے بل کو منظور کرانے میں آپ نے پوری توانائی صرف کی اور یہ جدوجہد کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ ۱۹۹۳ء میں سرسید یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی وجود میں آئی۔ آپ یونیورسٹی کے پہلے بورڈ آف گورنرز کے اراکین میں نامزد ہوئے اور یہ تسلسل بھی قائم ہے۔ ہمدرد اسکول اور یونیورسٹی کے متعدد اداروں سے بھی وابستہ ہیں۔ افضال منیف صاحب سرسید یونیورسٹی کے نمائندے کی حیثیت سے سرسید میڈیکل کالج برائے خواتین، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی، فہیم النساء میموریل انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی برائے طالبات کے بورڈ آف گورنرز کے ممبر ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر تعلیمی، ثقافتی اور مذہبی اداروں کے بورڈ آف ٹرسٹیز کے ممبر کی حیثیت سے بیش قیمت خدمات انجام دے رہے ہیں، جن میں العباس ایجوکیشن ٹرسٹ، سارک ہیلتھ کیئر فاؤنڈیشن اور ٹیچرز ٹریننگ فاؤنڈیشن وغیرہ شامل ہیں۔ احباب میرٹھ کے بھی خازن ہیں۔

آپ نے دینی علوم کے فروغ کے لیے ایک قابلِ ذکر ادارہ "صراطِ مستقیم فاؤنڈیشن" کے نام سے قائم کیا ہے، جس کے آپ منیجنگ ٹرسٹی ہیں۔ اس ادارے کے تحت ایک بڑا کمپلکس کلفٹن کے علاقہ میں تکمیل کے مراحل طے کر رہا ہے جو مکمل ہونے کے بعد ایک منفرد مقام کا حامل ہوگا۔ اس کے علاوہ لاتعداد اداروں کے تاحیات رکن ہیں۔ کراچی کے بیشتر کلبس کے بھی مستقل ممبر ہیں جن میں مرین سے کنٹری کلب، ڈیفنس اتحاد کرکٹ کلب، روٹری کلب، کراچی بوٹ کلب، کراچی جیمخانہ اور ڈیفنس اتحاد کرکٹ کلب شامل ہیں۔

دسمبر ۱۹۶۸ء میں معروف مسلم رہنما نواب محمد اسمٰعیل خاں کے بڑے صاحبزادے محترم جی۔ اے مدنی آئی۔ سی۔ ایس کی سب سے چھوٹی صاحبزادی مریم زمانی سے آپ کی شادی ہوئی۔ محترمہ ڈھاکہ یونیورسٹی

سے انگریزی میں بی۔ اے آنرز ہیں۔ انگریزی کی بہت اچھی مقررہ بھی ہیں اور زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے۔ آپ کی دو صاحبزادیاں بشریٰ امین اور طوبیٰ سعد ہیں۔ ایک صاحبزادے فرخ افضال ہیں۔ یہ تینوں بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ افضال صاحب خوش نصیب ہیں کہ دو بار حج اور پندرہ مرتبہ عمرے کی سعادت حاصل کر چکے ہیں۔ یہ دینِ اسلام سے گہری وابستگی اور عاشقِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہونے کا ثبوت بھی ہے۔

سرسید یونیورسٹی کراچی

اقبال حسن صدیقی

اقبال حسن صدیقی اپنے گہرے مشاہدے اور وسیع مطالعے کی وجہ سے علمی شخصیت اور تاریخی تسلسل کے حوالے سے اپنے خاندان پر کام کرنے کی وجہ سے محترم ہیں۔ آپ کا خاندان اہم مناصب پر فائز رہا ہے۔ بزرگوں کی اسلام سے وابستگی بھی بہت گہری ہے۔ صدیقی صاحب کے پردادا مفتی احسن اللہ صاحب میرٹھ میں وکیل سرکار تھے۔ قصبہ کاندھلہ کی مسجد انہوں نے ہی تعمیر کرائی تھی۔ جس کی تصدیق مسجد کے دروازے پر کندہ اس شعر سے ہوتی ہے۔

چوں احسن اللہ از پئے سلطان رکن دین
کہ وہ بنائے مسجد زیبا برائے تو

قصبہ کاندھلہ کی عیدگاہ احسن اللہ صاحب کے بیٹے محمود نے تعمیر کرائی۔ آپ کے والد شاہد حسن صدیقی خلف حاجی محمود حسن ریلوے میں ملازم تھے۔ انہوں نے مختلف شہروں میں خدمات انجام دیں۔ جن دنوں وہ غازی آباد میں تعینات تھے۔ وہاں ۱۳ اکتوبر ۱۹۳۰ء کو اقبال حسن صدیقی کی ولادت ہوئی۔ تعلیم و تربیت کا سلسلہ جاری تھا کہ آپ کے والد کی راولپنڈی میں پوسٹنگ ہوئی اور وہ اپنے خاندان کے ساتھ جولائی ۱۹۴۷ء میں راولپنڈی پہنچے۔ اس کے ایک ماہ بعد ہی پاکستان وجود میں آیا۔ اس وقت اقبال حسن صدیقی صاحب دسویں کلاس میں زیر تعلیم تھے۔ ۱۹۴۸ء میں آپ نے پنجاب یونیورسٹی سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ اپنی ذاتی کوششوں سے ٹائپنگ میں درجہ کمال تک مہارت حاصل کرلی تھی۔ ایک بینک میں آسامیاں نکلیں تو تفریحاً "ایک دوست کے اصرار پر انٹرویو دینے چلے گئے۔ کوئی درخواست تو دی نہیں تھی' پھر بھی انگریز افسر نے انٹرویو لینے پر رضامندی ظاہر کی۔ ابھی انٹرویو کی ابتداء ہی ہوئی تھی کہ آپ ٹائپ رائٹر پر جا بیٹھے۔ وہ تیزی سے بولتا رہا اور یہ برق رفتاری سے ٹائپ کرتے رہے۔ افسر نے کام دیکھا تو اس کو بڑی حیرت ہوئی کہ اس برق رفتاری کے باوجود ایک بھی غلطی نہیں ہوئی تھی۔ اس افسر نے درخواست دینے کے لئے کہا۔ اس طرح آپ نے بینک کی ملازمت سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا اور بینکنگ سے ہی وابستہ رہے۔ آپ انویسٹمنٹ کارپوریشن آف پاکستان کے ایگزیکٹیو وائس پریذیڈنٹ کی حیثیت سے ۳۱ جولائی ۱۹۹۳ء کو ریٹائر ہوئے۔

اقبال حسن صدیقی صاحب کے تین بھائی یوسف ہارون صدیقی' حسن بلال صدیقی اور سہیل حسن صدیقی ہیں۔ تین بہنوں میں سے ایک کا انتقال ہو چکا ہے۔ حکیم سیف الدین احمد صاحب آپ کے پھوپھی زاد بھائی ہیں۔ جون ۱۹۵۶ء میں آپ کی شادی خالہ زاد بہن محترمہ ثریا طاہر بنت سید محمد طاہر صاحب سے کراچی میں ہوئی۔ محترمہ ثریا اقبال کا شمار ممتاز مدرسین میں ہوتا ہے۔ وہ اسلامیہ کالج برائے خواتین کراچی کی پرنسپل کی حیثیت سے ریٹائر ہوئی ہیں۔ آپکی اولاد میں پانچ صاحبزادے نوید اقبال' ندیم

اقبال' نیر اقبال' خاور اقبال اور شعیب اقبال ہیں۔ ان میں سے چار بیٹوں کی شادی ہو چکی ہیں۔ حج و عمروں کی سعادت بھی حاصل کر چکے ہیں۔

اقبال حسن صاحب کی ادب سے وابستگی قلبی ہے۔ مطالعہ کا بے حد شوق رکھتے ہیں۔ روز چار گھنٹے پڑھے بغیر نہیں رہ سکتے۔ مشاعروں کے اس حد تک شائق رہے ہیں کہ کسی بھی شہر میں منعقد ہونے والے مشاعرے کی خبر ملتی تو ہر صورت میں پہنچ جاتے تھے۔ آپ نے نامور شعراء کو سنا اور ان کے کلام کو محفوظ کرتے رہے۔ اردو شعراء کا انتخابِ کلام ترتیب دے رہے ہیں۔ جو تین سے زائد جلدوں میں ہوگا۔ اس انتخاب میں موصوف نے سوانحی اشارے بھی دیئے ہیں۔ اس کے علاوہ اقبال صاحب نے شجرۂ صدیقان چار خاندانی سلسلوں کو یکجا کر کے مرتب کیا ہے۔ یہ آپ کی برسوں کی محنت کے بعد مکمل ہونے والا ہے۔ آپ کا انہماک' دلچسپی اور محنت کو دیکھنے کے بعد یہ رسمی جملہ اپنی معنویت کے ساتھ دہرایا جا سکتا ہے۔ اگر خلوص نیت ہو تو کوئی بھی کام ناممکن نہیں ہے۔

اکرام احمد خاں

اکرام احمد خاں

جناب اکرام احمد خاں میرٹھ کی ان نامور شخصیات میں شامل ہیں جنہوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر ملک و قوم کی یادگار خدمات انجام دیں۔ موصوف نامور رہنما نواب محمد اسمٰعیل خاں کے منجھلے صاحبزادے ہیں۔ اس خاندان کی سیاسی، تعلیمی، ادبی اور سماجی شعبوں میں دلچسپی اور ان امور میں کارکردگی سے کون واقف نہیں ہے۔ کئی نسلوں سے اس گھرانے کی اپنی روایات ہیں جو مشرقی تہذیب و روایات کی جملہ خصوصیات کے ساتھ تابندہ ہیں۔

جناب اکرام احمد خاں کی ولادت میرٹھ میں یکم جون ۱۹۱۵ء کو ہوئی۔ میٹرک تک تعلیم میرٹھ میں حاصل کی پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تعلیمی مراحل مکمل کئے۔ آپ نے بی۔ اے (فرسٹ ڈویژن) اور ایم۔ اے بھی فرسٹ ڈویژن میں کیا اور فرسٹ ڈویژن میں بھی فرسٹ آئے۔ علی گڑھ میں دورانِ تعلیم ہاکی اور کرکٹ ٹیموں میں شامل رہے اور یونیورسٹی اسٹوڈنٹ یونین کے اسپیکر رہے۔ اس طرح زمانۂ طالب علمی میں ہی مختلف شعبوں میں نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔

۱۹۳۹ء میں اسٹیٹ سول سروس (صوبائی) کے مقابلے میں سرفہرست رہے اور اسی سال ہندوستان کی اعلیٰ سول سروس (آئی۔ سی۔ ایس) کے مقابلے میں منتخب ہوئے اور تربیت کے لئے کیمبرج (برطانیہ) بھیجے گئے۔ وہاں سے واپسی پر انڈین سول سروس کے بنگال کیڈر میں اسسٹنٹ مجسٹریٹ (ڈھاکہ) مقرر کئے گئے اور پھر مختلف سب ڈویژنز میں ریذیڈنٹ مجسٹریٹ رہے اور ترقی کرتے ہوئے جوائنٹ مجسٹریٹ اور کلکٹر کے عہدوں تک پہنچے۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان کی خدمت کو اعزاز سمجھتے ہوئے ہجرت کی اور سول سروس آف پاکستان (سی۔ ایس۔ پی) میں شمولیت اختیار کی۔ مختلف ضلعوں میں خدمات انجام دیتے رہے اور پھر اسٹیٹ سیکریٹریٹ کے لئے منتخب ہوئے۔ یہاں ڈپٹی سیکریٹری اور جوائنٹ سیکریٹری کے عہدوں پر رہے۔ آپ کی کارکردگی کو دیکھتے ہوئے چیف کنٹرولر امپورٹ اینڈ ایکسپورٹ بنایا گیا۔ اس دور میں جناب اکرام احمد خاں نے امپورٹ اور ایکسپورٹ کے لئے پالیسیاں وضع کیں اور مختلف ممالک میں پاکستان کی

نمائندگی کا اعزاز حاصل کیا۔ ۱۹۵۵ء میں منسٹری آف کامرس میں جوائنٹ سیکریٹری کی حیثیت سے مختلف ممالک کے کامیاب دورے کئے۔ ۱۹۶۱ء میں ترقی پا کر جوٹ بورڈ کے چیئرمین بنائے گئے۔ یہ عہدہ وفاقی سیکریٹری کے برابر تھا۔ امریکہ میں فیلوشپ پر گئے اور واپسی پر ذمہ داریاں سنبھالیں۔ ایف۔ اے۔ او کے اجلاس میں پاکستانی وفد کی قیادت کی اور بہت سے ممالک میں پاکستانی وفد کی قیادت کا فریضہ انجام دیا جن میں جرمنی، بیلجیئم، اٹلی، فرانس اور برطانیہ شامل ہیں۔

۱۹۶۶ء میں جناب اکرام احمد خاں پریذیڈنٹ سیکریٹریٹ کے اکنامک افیئرز ڈویژن میں سیکریٹری مقرر کئے گئے۔ اس ممتاز عہدے پر کام کرتے ہوئے ترقیاتی پروگرام ترتیب دئے اور مختلف ممالک کے ساتھ معاہدوں پر دستخط کئے۔ پاکستان کنسورشیم کے اجلاس میں شرکت کی اور مختلف ممالک کے دورے کرنے والے وفد کی قیادت کا فریضہ انجام دیا جن میں کولمبو پلان کانفرنسیں بھی شامل ہیں۔ موصوف ایشین بینک کے گورنر بھی رہے ہیں۔ اس عہدے پر تین سال خدمات انجام دینے کے بعد ۱۹۶۹ء میں مغربی پاکستان کے ایک اہم ادارے واٹر اینڈ پاور ڈویلپمنٹ اتھارٹی کے چیئرمین مقرر کئے گئے۔ اس دورانئے میں آپ نے پانی اور بجلی کے بڑے منصوبے تجویز کئے اور پانی و بجلی کی تقسیم کے نظام کو باضابطہ اور موثر بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اٹلی، جرمنی، یوگوسلاویہ، چیکوسلواکیہ، ہنگری، روس، برطانیہ، امریکہ اور کینیڈا کے دورے کئے اور ورلڈ بینک امریکہ اور جاپان میں پاکستانی وفد میں شامل رہے۔ وطنِ عزیز کے یہ نامور فرزند ۱۹۷۳ء کے وسط میں ریٹائر ہوئے۔

جناب اکرام احمد خاں نے ان اہم ذمہ داریوں کی بجا آوری کے ساتھ ساتھ کھیلوں کے فروغ کے لئے بھی بہت کام کیا۔ ملک کی مختلف اسپورٹس تنظیموں کے علاوہ پاکستان کرکٹ کنٹرول بورڈ کے تین سال صدر رہے۔ اس حیثیت میں آئی۔ سی۔ سی کی برطانیہ میں منعقد ہونے والی میٹنگز میں بھی شرکت کی۔ گالف اور فوٹوگرافی آپ کے مشاغل میں شامل رہے ہیں۔

سردار امیر اعظم

سردار امیر اعظم

سردار امیر اعظم خان کی قومی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ انہوں نے ایک مخلص سیاسی کارکن، ایک منتخب نمائندے، ایک ذمہ دار وزیر اور ایک فرض شناس منصوبہ ساز کی حیثیت سے مصروف زندگی گزار دی۔

سردار امیر اعظم خاں اکتوبر ۱۹۰۳ء میں گجرات میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق صوبہ سرحد کے مشہور قبیلے اورک زئی سے تھا، جس کی اپنی شاندار روایات ہیں۔ ان کے پردادا تقریباً "ڈیڑھ سو سال پہلے اپنے صوبے کو چھوڑ کر یو پی میں جا بسے تھے۔ سردار صاحب کے والد سردار محمد اکرم خان یو۔ پی میں سپرنٹنڈنٹ پولیس تھے، وہ تحریکِ خلافت کے زمانے میں مستعفی ہو کر نواب زادہ لیاقت خان کی جاگیر کے منتظم مقرر ہو گئے تھے جو ضلع کرنال میں تھی۔

سردار امیر اعظم خاں نے کیمبل پور سے میٹرک کیا۔ پھر میرٹھ میں زیرِ تعلیم رہے اور میرٹھ کالج سے ایف۔ اے کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ انہوں نے آگرہ یونیورسٹی سے بی اے، ایل ایل بی اور ایم اے کی اسناد حاصل کیں۔ ۱۹۳۶ء میں مسلم لیگ میں شامل ہوئے اور یو پی مسلم لیگ کونسل کے رکن منتخب ہوئے۔ قیامِ پاکستان کے بعد راولپنڈی میں رہائش پسند کی۔ راولپنڈی سٹی مسلم لیگ کے سیکریٹری اور راولپنڈی میونسپلٹی کے رکن منتخب ہوئے۔

۱۹۵۲ء میں دولت مشترکہ پارلیمانی کانفرنس منعقدہ اوٹاوہ میں انہوں نے اپنے ملک کی نمائندگی کا اعزاز حاصل کیا۔ ۱۹۵۳ء میں راولپنڈی میونسپل کمیٹی کے چیئرمین ہوئے۔ اور اسی سال محمد علی بوگرہ کی وزارت میں وزیرِ مملکت برائے دفاع مقرر ہوئے۔ اس کے بعد وزارتِ اطلاعات و نشریات کا قلم دان سنبھالا۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء کے مارشل لاء کے نفاذ تک یہ فرائض ادا کرتے رہے۔

سردار امیر اعظم خاں نے بحیثیت وزیر ہی ملک و قوم کی خدمت نہیں کی، بلکہ اہم قومی اداروں میں بھی

گرانقدر خدمات انجام دیں۔ وہ پلاننگ کمیشن پی آئی اے اور پاکستان پریس انٹرنیشنل کے چیئرمین بھی رہے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے قومی اداروں کے استحکام و ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

پاکستان کے ممتاز بزرگ صحافی اقبال احمد صدیقی کے حوالے سے سید قاسم محمود نے تحریر کیا ہے "سردار امیر اعظم "لیاقت علی خان کے واقعہ شہادت کے عینی شاہد تھے اور اس بارے میں چونکا دینے والے حقائق بیان کرنے کا ارادہ رکھتے تھے ان کو ون یونٹ کی تشکیل کا پس منظر بھی معلوم تھا کہ یہ کیوں بنایا گیا" سردار امیر اعظم اپنی یادداشتیں قلم بند کرنے کی طرف مائل ہوئے تھے کہ وقتِ اجل آپہنچا اور ۱۹ فروری ۱۹۷۶ء کو جہانِ فانی سے رخصت ہوئے۔

سردار امیر اعظم نے شہریوں کو رہائشی سہولتیں فراہم کرنے کی غرض سے فلیٹس سے متعارف کرایا۔ انہوں نے الاعظم کے نام سے سب سے پہلا پروجیکٹ مکمل کیا جو لیاقت آباد (کراچی) میں ہے ایسے کئی دوسرے سلسلے بھی ان کی منصوبہ بندی سے روبہ عمل آئے ہیں۔

الاعظم اسکوائر کراچی

بابو برج ناتھ متھل

بابو برج ناتھ متھل ۱۸۹۱ء میں پیدا ہوئے۔ جسم کے بھاری بھرکم تھے۔ وہ ایک ہر دل عزیز اور پرکشش شخصیت کے مالک تھے۔ بچوں جیسی معصومیت، بڑوں جیسا اعتماد اور بزرگوں جیسی سنجیدگی ان کی ذات کا حصہ تھے۔ جتنی مہارت سے لوگ انہیں عدالتوں میں بحث کرتا دیکھتے اتنی ہی محویت سے بچوں کے ساتھ پتلی تماشا میں دکھائی دیتے۔ مزاج میں اخلاص و ایثار بہت تھا۔ بغیر کسی مصلحت یا لالچ بلا امتیاز ہر ایک کی خدمت کرتے تھے۔

بابو برج ناتھ متھل میرٹھ بار ایسوسی ایشن کے روح رواں تھے۔ اپنے موکلوں کو دوران سماعت اپنے دلائل سے حیران کر دیتے تھے۔ فکر کی گہرائی اس حد تک تھی کہ وہ ہر معاملہ کی تہہ تک پہنچتے تھے۔ مطالعہ کے بے حد شوقین تھے۔ مختلف موضوعات کی لاتعداد کتابیں ان کے زیر مطالعہ رہیں۔ عام لوگ حیران ہوتے تھے کہ بابو برج ناتھ متھل اتنے کاموں کے لئے وقت کیسے نکالتے ہیں۔ ان کی لائبریری ابھی تک موجود ہے۔

اگرچہ دولت کا حصول ان کے لئے کوئی مسئلہ نہیں رہا مگر انہوں نے پیسے کو کبھی عزیز نہیں رکھا۔ ان کی سخاوت سے بہت سے لوگ فیض یاب ہوئے۔ ان کی ڈائریاں اور بینک اکاؤنٹ اس کے گواہ ہیں۔

میراٹھ رانس کے مصنف نے لکھا ہے کہ وہ متھل خاندان کے نہ صرف چراغ تھے جس سے ان کا خاندان ہی نہیں پورا میرٹھ روشن ہو گیا تھا۔ ان کی شہرت دور دور تک پھیل گئی تھی۔ ایک مخلص انسان سمجھ کر لوگ اپنے ذاتی مسائل بھی ان کے پاس لے کر آتے تھے اور وہ پوری دلچسپی لے کر ان کو مشورہ دیتے تھے۔ آج بھی میرٹھ کے شہری انہیں مشکلات سے نکالنے والے کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ دلوں میں گھر کر جانے والی یہ شخصیت ۱۳ جون ۱۹۵۳ء کو سپرد آتش ہوئی۔

میراٹھ رانس ص ۳۲۱، ۳۲۲

حافظ بشیر احمد غازی آبادی

حافظ بشیر احمد غازی آباد کے باشندے تھے۔ غازی آباد ضلع میرٹھ میں شامل تھا۔ یہ دہلی سے بیس میل کے فاصلے پر ہے۔ آپ کی ولادت ایک انتہائی غریب گھرانے میں ہوئی۔ ابتدائی دینی تعلیم اپنے شہر میں ہی حاصل کی۔ قرآن پاک حفظ کیا۔

آپ نے ۱۹۲۸ء میں دیوان سنگھ مفتون کے ہفت روزہ جریدے "ریاست" سے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ پھر دہلی سے شائع ہونے والے مشہور روزنامہ "انجام" میں سردار علی صابری کی سرپرستی میں کام کیا۔ آپ نے مضامین لکھے۔ اس کے علاوہ تقریباً بیس سال روزانہ قطعہ تحریر کیا۔

مسلم لیگ سے گہری وابستگی رکھتے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد روزنامہ "جنگ" کراچی سے تعلق قائم کیا جو آخری سانس تک جاری رہا۔

حافظ صاحب مولانا اشرف علی تھانویؒ کے عقیدت مندوں میں شامل تھے۔ علامہ شبیر احمد عثمانی کے خاص رفقا میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔ پاکستان کے قیام کے بعد آپ نے لیاقت علی خاں، سردار عبدالرب نشتر اور خان عبدالقیوم خاں کے ساتھ مسلم لیگ کے لئے کام کیا۔ ۱۹۵۳ء کے پہلے بلدیاتی انتخابات کے موقع پر خواجہ ناظم الدین نے حافظ صاحب کو ایک سیٹ کے لئے مسلم لیگ کا ٹکٹ دیا۔ آپ نے بھاری اکثریت سے کامیابی حاصل کی۔ صدر ایوب خاں کے عہد حکومت میں بھی مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے کام کرتے رہے۔ اس طرح سیاست و صحافت میں ہی وقت گزرا۔ ۲۸ نومبر ۱۹۸۸ء کو آپ کا انتقال ہوا۔

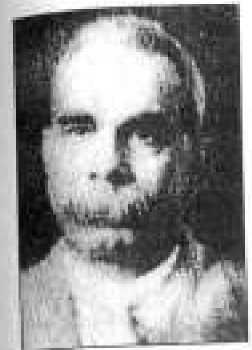

ڈاکٹر بھوپال سنگھ

ڈاکٹر بھوپال سنگھ

ڈاکٹر بھوپال سنگھ اپنے مخصوص برتاؤ' نیک نیتی اور خدمت کی وجہ سے میرٹھ کی ہر دلعزیز شخصیت تھے۔ ۱۹۳۳ء میں انہوں نے آگرہ میڈیکل اسکول سے استعفیٰ دیا اور میرٹھ آ گئے۔ یہاں انہوں نے بڈھانا دروازے پر " تربینی کوٹھی " میں اپنا مطب کھولا۔ جلد ہی ان کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ اس سے انہیں بے شمار دولت اور عزت حاصل ہوئی۔ وہ اپنی دولت کا صحیح استعمال کرنا جانتے تھے۔ بیماروں کے ساتھ ان کا رویہ نہایت ہمدردانہ رہا۔ ڈاکٹر صاحب غریب لوگوں کا نہ صرف مفت علاج کرتے تھے بلکہ پرہیزی کھانے اور پھل وغیرہ کے لئے پیسے بھی دیتے تھے۔ وہ ایک کامیاب معالج تسلیم کئے گئے۔

ڈاکٹر بھوپال سنگھ میڈیکل کالج آگرہ کے ابتدائی ایام میں ایک متحرک شخصیت رہے۔ صوبہ یو۔ پی اور میرٹھ کی میڈیکل ایسوسی ایشنز کے صدر بھی رہے۔ انڈین میڈیکل ایسوسی ایشن کے چیئرمین رہنے کا اعزاز بھی ان کو حاصل تھا۔ میرٹھ کالج کے لئے بھی ان کی خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔

ڈاکٹر بھوپال سنگھ نے اپنے کردار کے گہرے نقوش چھوڑے۔ مزاجاً " نرم تھے۔ اصولوں کے پابند تھے۔ ان کی وسیع خدمات کو ملک گیر سطح پر سراہا گیا۔ جولائی ۱۹۵۳ء میں وہ ایک سرگرم' پرجوش اور بامقصد زندگی گزار کر جہانِ فانی سے رخصت ہوئے۔ جب بھی اخلاص و ایثار کی بات ہوتی ہے تو ڈاکٹر ان کا نام زبان پر آجاتا ہے۔

میراٹھ ماس ص ۳۳۲

کرنل ٹی۔ ایف۔ اوڈونل

کرنل ٹی۔ ایف۔ اوڈونل

کرنل ٹی۔ ایف۔ اوڈونل میرٹھ کالج کے پرنسپل رہے ہیں۔ اس سے پہلے وہ آگرہ کالج کے پروفیسر اور فوج میں کرنل رہے۔ ۱۹۱۴ء کی لڑائی میں دوربک چوٹ لگنے سے ان کی ناک ختم ہو گئی تھی۔ نسلاً " آئرش تھے مگر ہندوستان سے بڑی محبت کرتے تھے۔ انہوں نے ہمیشہ طالب علموں کی تعلیم و تربیت کو پیش نظر رکھا۔ وہ طلباء کی خواہشات کو اولیت دیتے تھے۔ ایک کیس میں وہ طلباء کی طرف سے صفائی کے طور پر پیش ہوئے۔ انہیں کے زمانے میں میرٹھ کالج میں چھاتر سنگھ کی ابتدا کی گئی جس کے پہلے وزیر رام شرن ودیارتھی تھے۔ وہ طلباء کی ان سرگرمیوں سے بہت حیران ہوئے لیکن بعد میں یہ یقین ہونے پر کہ یہ محب وطن ہیں ہمیشہ ان کے ساتھ رہے۔ انہیں کے دور میں سبھاش چندر بوس' جواہر لعل نہرو اور کرن چندر داس جیسے رہنما کالج میں بلائے گئے۔ ۱۹۲۹ء میں گاندھی جی کی آمد کے موقع پر انہیں عزت دیتے ہوئے ایک سو ایک اشرفیاں چاندی کی طشتری میں رام شرن ودیارتھی کے ہاتھوں پیش کیں۔

کرنل ٹی۔ ایف۔ اوڈونل طلبہ میں ہر دل عزیز تھے۔ وہ ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔ ایک ماہر تعلیم کی حیثیت سے انہوں نے یادگار خدمات انجام دیں۔

میراٹھ ماس ص ۳۳۹' ۳۴۰

جاوید برکی

کرکٹ کی دنیا جاوید برکی کے نام سے نا آشنا نہیں ہے۔ وہ نہ صرف ایک اچھے کھلاڑی کی حیثیت سے مشہور ہوئے بلکہ مبصر کی حیثیت سے بھی ان کی خداداد صلاحیتوں کا اعتراف کیا گیا۔

جاوید برکی ۸ مئی ۱۹۳۸ء کو میرٹھ میں پیدا ہوئے اور میرٹھ ہی میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم آکسفورڈ یونیورسٹی میں مکمل کی۔ وہیں ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۰ء تک کرکٹ کھیلتے رہے۔ ۱۹۶۰ء میں انہوں نے ٹیسٹ کیریئر کا آغاز کیا اور ۱۹۷۵ء تک کھیلتے رہے۔ پاکستان میں کمبائنڈ یونیورسٹیز، پنجاب، لاہور، کراچی، راولپنڈی اور سرحد کی طرف سے کھیلا۔ انہوں نے اپنے پہلے ٹیسٹ میچ کی پہلی اننگز میں سات اور دوسری اننگز میں تیرہ رنز بنائے۔ یہ میچ ۶۱-۱۹۶۰ء کی سیریز میں بھارت کے خلاف بمبئی میں کھیلا گیا تھا۔ جاوید برکی نے ۲۵ ٹیسٹ میچوں میں ۴۸ اننگز کھیلیں۔ چار مرتبہ ناٹ آؤٹ رہے۔ انہوں نے بھارت کے خلاف ۵، انگلینڈ کے خلاف ۱۱، نیوزی لینڈ کے خلاف ۷ اور آسٹریلیا کے خلاف ۲ میچ کھیلے۔ ۳۰،۴۷ کی اوسط سے ۱۳۴۱ رنز بنائے۔ ۱۴۰ رنز ان کا بہترین اسکور ہے جو ۱۹۶۱ء کی سیریز میں ڈھاکہ میں انگلینڈ کے خلاف تھا، انہوں نے سات کیچ لئے۔ ۱۹۶۲ء میں پانچ ٹیسٹ میچوں میں پاکستان کی قیادت کی۔ یہ امر بھی دلچسپ ہے کہ ان کی تینوں سنچریاں انگلینڈ کے خلاف ہی ہیں۔

۱۹۷۹ء میں جاوید برکی کو دوسرے ورلڈ کپ کرکٹ ٹورنامنٹ کیلئے پاکستان ٹیم کا منیجر مقرر کیا گیا۔ اعلیٰ سرکاری عہدوں پر بھی فائز رہے ہیں۔ کرکٹ کے مبصر ہیں۔ عمران خاں (پ: ۱۹۵۲ء) اور ماجد جہانگیر خان (پ: ۱۹۴۶ء) کے کزن ہیں۔ یہ دونوں نامور کھلاڑی بھی پاکستان کی قومی کرکٹ ٹیم کے کپتان رہ چکے ہیں۔

ہمارے کپتان، ص ۳۲،۳۱
انسائیکلوپیڈیا پاکستانیکا، ص ۲۹۲

ڈاکٹر جلال انجم

محترم حکیم ناظرالدین فیضی ظہیری کے بیٹے جلال الدین ظہیری علمی دنیا میں ڈاکٹر جلال انجم کے نام سے معروف ہیں۔ آپ کی ولادت میرٹھ کے محلہ کرم علی میں ۱۷ اگست ۱۹۵۸ء کو ہوئی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد آپ نے اردو میں ایم۔ اے اور بی۔ ایڈ کی اسناد حاصل کیں۔ ممتاز شاعر قلق میرٹھی کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا اور میرٹھ یونیورسٹی سے "قلق میرٹھی : حیات اور کارنامے" کے زیر عنوان ڈاکٹر امیراللہ شاہین کی نگرانی میں پی۔ ایچ۔ ڈی کیا۔ آپ درس و تدریس کے شعبہ سے وابستہ ہیں۔

ڈاکٹر جلال انجم نے اسکول کے زمانے سے لکھنا شروع کیا۔ ابتدا میں چھوٹی چھوٹی نظمیں، مضامین اور مقالے لکھے۔ اعلیٰ تعلیم تک آتے آتے ڈاکٹر امیراللہ شاہین اور ڈاکٹر بشیر بدر کی سرپرستی میں شعوری طور پر مضامین لکھنا شروع کئے اور پھر تصنیف و تالیف اور تنقید و تحقیق کی طرف سنجیدگی سے متوجہ ہوئے۔

آپ نے مختلف شہروں میں منعقدہ سیمیناروں میں مقالات پڑھے ہیں۔

ڈاکٹر موصوف کا تحقیقی مقالہ ۱۹۸۷ء میں منظرعام پر آیا اور اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۹۳ء میں طبع ہوا۔ یہ ۳۹۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ تنقیدی مضامین کا مجموعہ "افکارِ تازہ" ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا۔ ڈاکٹر امیراللہ شاہین کے انتقال کے بعد "ڈاکٹر امیراللہ شاہین : شخصیت اور فن" کے نام سے مختلف اکابرین کے مضامین کا مجموعہ مرتب کیا۔ یہ کتاب ۱۹۹۶ء میں طبع ہوئی۔

ڈاکٹر جلال انجم نے زبان و ادب کے فروغ کے لئے اپنے آپ کو وقف کر رکھا ہے۔ ادبی و علمی سرگرمیوں میں بھی پوری دلچسپی سے حصہ لیتے ہیں۔ اردو ایسوسی ایشن میرٹھ کالج میرٹھ' اردو ریسرچ اسکالرز ایسوسی ایشن میرٹھ یونیورسٹی میرٹھ' اور انتظامیہ کمیٹی انجمن ترقی پسند مصنفین گولڈن جوبلی کانفرنس کے سکریٹری' اردو افسانہ سیمینار میرٹھ کالج اور قلم زاد نئی دہلی کے کنوینر ہیں۔ ۷۹-۷۸ء میں میرٹھ کالج میگزین کے مدیر بھی رہ چکے ہیں۔

آپ کی زیر طبع کتب میں انیسویں صدی میں اردو غزل' "کلیاتِ قلق مع مقدمہ و حواشی" اور "جواہر منظوم کا تنقیدی و تحقیقی مطالعہ" شامل ہیں۔ آج کل شدید علیل اور دہلی میں سکونت پذیر ہیں۔

حکیم جمشید احمد خاں

حکیم جمشید احمد خاں

حکیم جمشید احمد خاں معروف و ممتاز اور قابل طبیب تھے۔ ان کا مطب مرجعِ خلائق رہا۔ مہلک امراض میں مبتلا افراد ان کے زیرِ علاج رہ کر صحت یاب ہوئے۔ حکیم صاحب صرف پاکستان ہی نہیں بلکہ مشرقِ وسطیٰ میں بھی مقبول تھے۔ وہاں کے مایوس مریض ان سے رجوع ہو کر بفضلِ تعالیٰ صحت یاب ہوتے تھے۔

حکیم جمشید احمد خاں کا وطن مالوف فرخ آباد ہے۔ ان کے جدِ امجد حکیم اعمز حسین برصغیر کی ممتاز شخصیت اور بلند پایہ صاحبِ تصنیفات و تالیفات طبیب گذرے ہیں۔ ان کے والد ماجد حکیم احمد حسین خاں بھی مشہور طبیب تھے جن کا انتقال ایک سو دو سال کی عمر میں کراچی میں ہوا۔

حکیم جمشید احمد خاں ۱۰ر جولائی ۱۹۱۳ء کو میرٹھ میں پیدا ہوئے جہاں ان کے والد طبابت کرتے تھے اور حکیم فرخ آبادی کے نام سے مشہور تھے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت اہتمام سے ہوئی۔ فیض عام ہائی اسکول میرٹھ سے میٹرک کرنے کے بعد کرسچین کالج لکھنؤ اور پھر میرٹھ کالج میں تعلیمی سلسلہ جاری رکھتے ہوئے گریجویشن کیا۔ دورانِ تعلیم غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی بھرپور حصہ لیتے رہے۔ میرٹھ کالج کے یک وقت نائب صدر اور سوشل سیکریٹری کے عہدوں پر فائز رہے۔ قومی و ملکی حالات سے باخبر ہونے کی وجہ سے انہوں نے وقت کے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے مسلم لیگ کے لئے فعال کردار ادا کیا۔ ۲۱ر فروری ۱۹۳۸ء کو مسلم لیگی اکابر قائداعظم، قائد ملت اور نواب محمد اسماعیل خاں کالج میں مدعو کئے گئے۔ انہیں زعما کی موجودگی میں انہوں نے میرٹھ کالج کی عمارت پر مسلم لیگ کا جھنڈا لہرایا۔

تعلیم سے فارغ ہو کر اپنے والد سے طب کی علمی و عملی تعلیم حاصل کی اور ان کے ساتھ بیٹھ کر برس ہا برس معاونت کی۔ نیز اپنے برادر بزرگ حکیم خورشید علی خاں سے بھی فیض حاصل کیا۔ طب میں مہارت حاصل کرنے کے بعد حکیم صاحب علیحدہ مطب کرنے لگے۔ ۱۹۳۲ء سے میرٹھ اور دہلی دونوں شہروں میں مریضوں کو دیکھنے لگے اور کامیاب طبیب کی حیثیت سے پہچانے جانے لگے۔ تقسیم ہند کے بعد کراچی آ گئے اور یہاں اپنا مطب قائم کیا۔

حکیم جمشید احمد خاں کا شمار عمائدینِ شہر میں ہوتا تھا۔ انہوں نے فنِ طب اور اطباء کی خدمت کو فرض جانتے ہوئے ہر قسم کے ذاتی مفادات سے بالاتر ہو کر خدمت کی۔ ہر قدم پر سینہ سپر ہو کر بڑی سے بڑی طاقت کے سامنے واشگاف الفاظ میں اپنے طبی نظریات کو پیش کرنے میں کبھی مصلحت سے کام نہیں لیا۔ اس کی ایک مثال ۱۹۵۹ء میں مارشل لاء کے فوری بعد پاک جمعیت الاطباء کے نمائندے کی حیثیت سے مرکزی وزیر صحت کی طب دشمن پالیسی سے زبردست اختلاف ہے۔ انہوں نے استدلال کے ذریعہ حکومت سے طب کی اہمیت و افادیت تسلیم کرائی۔ قیام پاکستان کے فوری بعد ۱۹۴۸ء میں جبکہ ملک میں کسی طبی تنظیم کا وجود نہ تھا، انہوں نے پاک جمعیت الاطباء قائم کی تھی۔ اسی تنظیم کے زیرِ اہتمام انہوں نے خالق دینا ہال کراچی میں محترمہ فاطمہ جناح کی صدارت میں پاکستان کی تاریخ کا سب سے پہلا عظیم الشان جلسہ منعقد کیا۔ اس جلسہ میں فنِ طب کے تحفظ، بقا اور ترقی کے لیے متعدد قراردادیں منظور ہوئیں۔

۱۹۶۸ء میں منعقد ہونے والے طبی بورڈ کے انتخاب میں حکیم جمشید احمد خاں کراچی سے منتخب ہوئے۔ انہوں نے دس ہزار سے زائد ووٹ حاصل کئے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں اطباء کا بھرپور اعتماد حاصل تھا۔ طبی بورڈ میں انہوں نے کئی بنیادی مسائل حل کرائے۔ طب کی ترقی و ترویج کے لیے پانچ سالہ منصوبہ پیش کیا جسے حکومت نے منظور کیا۔ اس منصوبے میں ہر علاقہ میں طبیہ کالجوں کا قیام اور تعلیمی اداروں کے لیے اتفاقی ہسپتالوں کے علاوہ اساتذہ کی تربیت کے لیے کالج قائم کرنے کی گنجائش رکھی گئی۔

حکیم صاحب دی بورڈ آف یونانی اینڈ آیورویدک سسٹم آف میڈیسن پاکستان، صحت کمیشن پاکستان، ایڈورٹزمنٹ کنٹرول بورڈ آف سندھ اور اسپیشل طبی مشاورتی بورڈ پاکستان کے فعال ممبر رہے۔ زائرین و حجاج کی طبی خدمت کے لیے سرکاری سطح پر اطباء کا وفد حجازِ مقدس بھیجنے کے لیے بھی انہوں نے کوششیں کیں جو بعد میں بارآور ہوئیں۔

انہوں نے مختلف ممالک کے دورے کئے۔ حلقہ احباب بھی وسیع تھا جس میں مختلف المزاج افراد شامل تھے۔ وطنِ عزیز کے اس محسنِ طب نے ۱۹۹۶ء میں کراچی میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ تدفین سوسائٹی قبرستان کراچی میں ہوئی۔ حکیم جمشید احمد خاں مرحوم نے دو شادیاں کیں۔ دوسری اہلیہ ڈاکٹر سرور جہاں ہیں۔ ان کی اولاد میں تین بیٹیوں کے علاوہ دو بیٹے ارشد جمشید اور ممتاز جمشید ہیں۔ یہ دونوں بھائی ڈاکٹر ہیں اور امریکہ میں مقیم ہیں۔ فنِ طب میں واحد شاگرد حکیم ایاز الرحمٰن بقائی ہیں جو فیڈرل بی ایریا میں مطب کرتے ہیں۔ بقائی صاحب اپنے استاد سے گہری عقیدت رکھتے ہیں۔

مولانا حامد علی قریشی

مولانا حامد علی قریشی کے خاندانی بزرگوں میں مظفر علی قریشی، شور علی قریشی اور منصور علی قریشی دہلی میں سکونت پذیر ہوئے۔ یہ تینوں حقیقی بھائی تھے۔ منصور علی قریشی ملتان چلے گئے۔ وہیں مقیم ہوئے اور وہیں سلسلہ نسل پھیلا۔

مظفر علی قریشی اور شور علی قریشی دہلی کے بادشاہ کی فوج میں ملازم ہوئے۔ دہلی کے گرد و نواح میں جاٹوں اور گوجروں کی سرکشی، لوٹ مار اور قتل و غارت گری کو انہوں نے دبایا۔ اسی اثنا میں تحصیل ہاپوڑ ضلع میرٹھ کے ایک مقام راؤ کوٹان میں ایک جاٹ راؤ کوٹ سنگھ نے بغاوت کر دی۔ ان دونوں بھائیوں کو ایک مسلح فوجی دستے کے ساتھ اس کی سرکوبی کے لئے بھیجا گیا۔ زبردست لڑائی ہوئی۔ راؤ کوٹ سنگھ کو شکست دے کر اس کی تمام جاگیر اور راؤ کوٹان کے تمام علاقے کو تباہ و برباد کر کے جب دربار شاہی میں پہنچے تو بادشاہ نے ان کو انعام و اکرام سے سرفراز کیا اور حکم دیا کہ تم دونوں اسی مقام پر جاؤ۔ بڑے بھائی مظفر علی قریشی کے لئے بادشاہ نے فرمایا کہ تم اپنے نام سے ایک بستی آباد کرو۔ چنانچہ یہ دونوں بھائی اس جگہ پر آباد ہوئے اور مظفر علی قریشی نے اپنے نام پر مظفر آباد کے نام سے ایک بستی بسائی۔ ان کا مزار اسی بستی کے قبرستان میں ہے جو پکی لکھوری اینٹوں سے بنا ہوا ہے۔

مظفر علی قریشی کے چار بیٹے تھے۔ ان میں سے ایک کی اولاد میں مولانا حامد علی قریشی صاحب ہیں۔ آپ نے مدرسہ عالیہ عربیہ میرٹھ میں تعلیم حاصل کی، وہاں سے فارغ ہو کر آپ نے ایک مدرسہ ۱۸۸۵ء میں اسی مظفر آباد میں قائم کیا۔ جس میں آس پاس کے دیہات سے مسلمان طلباء تعلیم حاصل کرنے کے لئے آنے لگے۔ آپ کے والد بنیاد علی قریشی تھے۔ صرف ان کو ہی تعلیم کا شوق تھا۔ انہوں نے عربی اور فارسی کی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ پھر میرٹھ جا کر مڈل اور میٹرک کے امتحانات پاس کئے اور چھپتے چھپاتے بی۔اے کی ڈگری حاصل کی۔ اس چھپنے کی وجہ یہ تھی کہ ان کے والد انگریزی تعلیم کے سخت خلاف تھے۔ میرٹھ میں تعلیم پانے کے بعد انہوں نے میرٹھ ہی میں محکمہ بندوبست میں ملازمت کر لی جہاں ان کی تنخواہ چھبیس روپے تھی۔ ایمانداری سے کام کیا۔ نیک نامی حاصل ہوئی تو انہیں ریاست گوالیار میں عارضی طور پر بلا لیا گیا۔ پھر ریاست اندور میں ان کو طلب کیا گیا۔ وہاں سے میسور چلے گئے اور آخر میں ریاست بھوپال کے اسی محکمے کے مہتمم اعلیٰ نواب شاہجہاں بیگم کے عہد میں ۱۹۰۳ء میں مقرر ہوئے۔ بھوپال ہی میں ۱۹۱۲ء میں ان کا انتقال ہوا۔ وہیں مدفون ہوئے۔

بنیاد علی قریشی صاحب کی شادی میر سید ضامن علی صاحب کی صاحبزادی صغیر النساء سے ہوئی تھی جن سے ۱۹ اپریل ۱۹۰۱ء کو حامد علی قریشی دہلی میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۱۲ء میں والد کے سایہ شفقت سے محروم ہوئے تو اس وقت اپنے والد کے ساتھ بھوپال میں تھے۔ وہاں سے آپ کے نانا دہلی لے آئے۔ کچھ عرصے بعد ان کا بھی انتقال ہو گیا اور آپ چھوٹے چچا کی سرپرستی میں آگئے مگر وہ بھی جلد اللہ کو پیارے ہو گئے اور پھر بڑے چچا نے اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ یہ زمانہ مولانا حامد علی قریشی کے لئے بڑا صبر آزما ثابت ہوا۔ کوئی ظلم و زیادتی ایسی نہ تھی جو آپ کے چچا نے روا نہ رکھی ہو۔ میرٹھ کی تمام جائداد و املاک چچا نے اپنے قبضے میں کر لی تھیں۔ والد کے انتقال کے بعد سے ۱۹۲۰ء تک آپ کی زندگی حصول تعلیم اور مقدمہ بازی میں گزری۔ ان کاموں کی تکمیل کے لئے آپ نے مزدوری بھی کی۔ کچھ تعلیم مدرسہ فرقانیہ لکھنؤ، کچھ عرصے مدرسہ عالیہ میرٹھ اور مدرسہ عالیہ گلاؤٹھی اور کچھ عرصے مدرسہ فتح پوری دہلی میں پائی لیکن کہیں سے فارغ التحصیل ہونے کی سند حاصل نہ کر سکے۔

۱۹۲۶ء میں مولانا محمد علی جوہر کی صحبت میسر آئی۔ کچھ عرصے دہلی اور بمبئی میں ان کے ساتھ رہے۔ انہوں نے خلافت کی تحریک کے لئے کام کرنے کا حکم دیا۔ آپ نے مقصد کے حصول کے لئے کلکتہ، ڈھاکہ، سلہٹ، راج شاہی، کھلنا، چاٹگاؤں، رنگون، سیلون، بمبئی، حیدر آباد دکن، پنجاب، سندھ اور سرحد کے طوفانی دورے کئے اور ۱۹۲۸ء میں کلکتہ خلافت کانفرنس میں شرکت کی۔ آپ نے دہلی میں مدرسہ حیات الاسلام قائم کیا، جو بعد میں دار الیتامیٰ کی شکل اختیار کر گیا۔

مولانا حامد علی خان کو ہر دل عزیزی حاصل تھی۔ اسی وجہ سے حاکمان وقت سماجی کاموں کے لئے معاونت کے طالب ہوتے تھے۔ آپ نے ڈپٹی کمشنر دہلی اے۔ ایچ۔ لیڈی کی درخواست پر دیہات سدھار کے کاموں میں دہلی حکومت کا ہاتھ بٹایا۔ اس کے صلے میں ڈپٹی کمشنر نے "خان صاحب" کا خطاب دینا چاہا تو آپ نے صاف انکار کر دیا اور معذرت کرتے ہوئے کہا "جناب آپ کے ہاں خطاب دے کر ہمارے مذہب خریدے جاتے ہیں اور پھر دیہات سدھار کی آڑ میں جاہل عوام کو مرتد بنایا جاتا ہے۔ مجھ کو صرف خدمت سے غرض ہے وہ میں انجام دیتا رہوں گا۔" بعد میں آپ کو اس اسکیم کا کنوینر بنایا گیا۔

مولانا حامد علی قریشی ۱۹۳۶ء میں مسلم لیگ میں شامل ہوئے۔ ۱۹۳۸ء میں پریڈ گراؤنڈ دہلی میں مسلم لیگ پولیٹیکل کانفرنس کا آپ کو کنوینر مقرر کیا گیا۔ مسلم لیگ میں شامل ہونے کے بعد مسلم لیگ کے کاموں کی ذمہ داریاں زیادہ بڑھ گئیں۔ صوبہ مسلم لیگ کے کونسلر، صوبہ مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر اور آل انڈیا مسلم لیگ کے کونسلر منتخب ہوئے اور ۱۹۴۵ء میں صوبہ مسلم لیگ دہلی کے جنرل سیکریٹری منتخب ہوئے۔ سیاست میں آنے کے بعد بھی آپ کی سماجی مصروفیات میں فرق نہیں آیا۔ ۱۹۳۹ء میں دہلی میں ہونے والے ہندو مسلم فساد کے موقع پر دہلی میونسپل کمیٹی نے ایک امن کمیٹی تشکیل دی اس کمیٹی کے چیئرمین لالہ دیش راج چودھری اور سیکریٹری مولانا حامد علی قریشی منتخب ہوئے۔ اسی سال انجمن حیات

الاسلام کی طرف سے دہلی میں بڑے پیمانے پر ایک تبلیغی کانفرنس ہوئی جس میں عمائدینِ شہر نے جوق در جوق شرکت کی۔ بیگم مولانا محمد علی جوہر' مولانا مفتی کفایت اللہ' مولانا احمد سعید اور مولانا عبدالحامد بدایونی کے علاوہ بہت سے احراری و مسلم لیگی رہنماؤں نے بھی نہ صرف شرکت کی بلکہ خطاب بھی کیا۔

۱۹۴۷ء کے پر آشوب دور میں انجمن حیات الاسلام' دہلی سے کراچی منتقل ہو گئی۔ مولانا نے تمام مشکلات کے باوجود ہمت نہیں ہاری اور اس انجمن کے لئے اپنی کافی جائداد فروخت کر دی۔

مولانا حامد علی قریشی صاحب انسانی اوصاف کا پیکر تھے۔ انتہائی خوش طبع' ملنسار' خلیق' متواضع' دوست نواز' علم دوست اور ہمدرد خلائق انسان تھے۔ وضع کے پابند رہے۔ مولانا کی پہلی شادی ۱۹۲۰ء میں آپ کی چھوٹی خالہ کی لڑکی اصغری بیگم سے ہوئی۔ ان سے تین بچے ہوئے۔ اصغری بیگم ۵ جون ۱۹۳۸ء کو ساتھ چھوڑ گئیں۔ دو ماہ بعد آپ کی خالہ کی منجھلی لڑکی زلیخا بیگم بنت مولوی ابوالحسن سے شادی ہوئی۔ ان سے چار اولادیں ہوئیں۔ جن میں سے دو موجود ہیں۔ راشد علی قریشی صاحب نے تعلیم مکمل کرنے کے بعد اسٹیٹ بینک آف پاکستان میں ملازمت پسند کی۔ ایک لڑکی نور الصباح کراچی میں ہیں۔

دہلی کی یادگار ہستیاں' ص ۲۱۷ تا ۲۲۳

مولانا حبیب الرحمٰن صدیقی

پروفیسر حبیب الرحمٰن صدیقی

پروفیسر حبیب الرحمٰن صدیقی کی ولادت میرٹھ میں ۳۱ مارچ ۱۸۹۸ء کو ہوئی۔ آپ کے والد مولوی خلیل الرحمٰن دینی و علمی مزاج رکھتے تھے۔ دادا مولوی عبدالکریم صدیقی مشہور بزرگ حضرت غوث علی شاہ قلندر پانی پتی کے مرید باختصاص تھے۔ شعر و ادب سے بھی گہری دلچسپی رکھتے تھے اور مرزا غالب کے شاگرد تھے۔ ان کے سب سے چھوٹے بیٹے مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی معروف و مقبول شاعر گزرے ہیں۔ دوسرے دو بھائی مولوی نذیر احمد خجندیؒ اور مولوی عبدالعلیم صدیقی شریعت و طریقت میں عالی شہرت رکھتے تھے۔

محترم حبیب الرحمٰن صدیقی نے عربی کی ابتدائی تعلیم میرٹھ میں اپنے نانا سے حاصل کی اور فارسی آیا قاضی زین العابدین فرہادؔ سے پڑھی۔ انگریزی کی تعلیم مشن ہائی اسکول' میرٹھ میں پائی اور غالباً" فیض عام انٹر کالج سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۱۷ء یا ۱۹۱۸ء میں آپ کے ایک خالہ زاد بھائی مولوی انعام الرحیم' آئی۔ سی۔ ایس کر کے آئے تھے اور ناگپور کے کمشنر مقرر ہوئے تھے۔ جب وہ میرٹھ سے اپنی نئی ملازمت پر روانہ ہونے لگے تو اپنے ساتھ چند نوجوان بھائیوں کو ناگپور لیتے آئے تاکہ ان کی تعلیم اپنی نگرانی میں کرائیں۔ ان بھائیوں میں صدیقی صاحب بھی تھے۔ ناگپور پہنچ کر آپ نے ہسلپ کالج میں داخلہ لیا اور الٰہ آباد یونیورسٹی سے ۱۹۲۰ء میں بی۔ اے پاس کر کے امراؤتی (برار) کے گورنمنٹ محمڈن ہائی اسکول میں مدرس ہو گئے۔ ملازمت میں رہتے ہوئے الٰہ آباد یونیورسٹی سے ہی اردو میں ایم۔ اے کیا اور پھر ناگپور یونیورسٹی سے فارسی میں بھی ایم۔ اے کی سند حاصل کی اور دونوں امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کئے۔

پروفیسر حبیب الرحمٰن صدیقی فلسفہ اور اردو' فارسی و انگریزی کے شعر و ادب کے ساتھ تاریخ اسلام اور عالمی سیاسی نظریات و تحریکات پر بڑی محرمانہ نظر رکھتے تھے۔ مارکس اور اس کے موافق و مخالف ماہرین کا وسیع مطالعہ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ آپ عالمی تحریکوں اور مختلف نظریات کا باریک بینی سے جائزہ

لیتے تھے۔ اس کے باوصف فطرتاً" اور عملاً" خوش عقیدہ مذہبی آدمی تھے۔ ذاتِ باری تعالیٰ پر آپ کا ایقان نہایت محکم تھا۔

صدیقی صاحب کا حافظہ بھی غیر معمولی تھا۔ بہت خوش بیان اور بزم آرا تھے۔ گفتگو میں مختلف زبانوں کے اشعار بے تکلف نقل کرتے تھے۔ برار کے مشہور اردو ماہنامہ "مرقع" امراؤتی کے ایک عرصے تک نگراں رہے۔ اس رسالے میں آپ کا کلام اور مضامین شائع ہوتے تھے۔ یہ رسالہ منشی محمد حیات خاں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اپنا تعارف

حبیب الرحمن الصدیقی

عکس تحریر: حبیب الرحمن صدیقی

مغربی یاد میں [illegible] تھا۔ فن عروض پر گہری نظر رکھتے تھے۔ ڈاکٹر ساجد کمام گاؤنی نے لکھا ہے کہ ودربھ میں آپ جیسا ماہر علم عروض کوئی نہیں گزرا۔ آپ ایک مدت تک ودربھ ایجوکیشنل بورڈ سے بھی منسلک رہے اور آپ ہی علاقہ ودربھ کے وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے حصہ نظم کی داخل کتب میں اوزان سے طلباء کو روشناس کرایا۔ حضرت شارق نیازی نے تحریر کیا ہے "آپ کو شہرت طلبی سے سخت نفرت تھی' اس لئے کوئی تخلص تک اختیار نہیں کیا"۔ شعرو ادب کے علاوہ صدیقی صاحب موسیقی سے بھی ذوق رکھتے تھے۔

پروفیسر موصوف تقریباً" تیس سال کی ملازمت کے دوران ٹیچر سے ترقی کر کے سی۔ پی و برار کے مختلف اسکولوں میں صدر مدرس رہے اور پھر کنگ ایڈورڈ کالج امراؤتی میں دو تین سال کے لئے فارسی کے لیکچرر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ ١٩٥٣ء میں ہیڈ ماسٹر کے عہدے سے قبل از ریٹائرمنٹ لے کر امراؤتی میں رہے اور یہیں میرٹھ کا یہ جوہر قابل تہتر سال اور چند ماہ کی عمر میں ٢٥ جولائی ١٩٧١ء کو سپرد خاک ہوا۔ آپ کا حلقۂ احباب بہت مختصر تھا۔ حضرت ساغر نظامی' محترم محمد یحییٰ تنہا اور محترم حامد اللہ افسر آپ کے قریبی دوستوں میں تھے' اور یہ تینوں آپ کے ہم وطن تھے۔ آپ کی اولاد میں محترم ذکاء صدیقی اور محترمہ نورالعین علی نے علمی و ادبی وارث ہونے کا حق ادا کیا ہے۔ جناب ولی الرحمن صدیقی کا شمار بھی ودربھ کے اچھے شعراء میں ہوتا ہے۔

جناب ذکاء صدیقی نے ١٩٩٨ء میں پروفیسر حبیب الرحمن صدیقی کے مکاتیب کا مجموعہ "مکاتیب حبیب" نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے۔ ذکاء صاحب نے ان مکاتیب پر گفتگو کرتے ہوئے تحریر کیا ہے۔ "یہ مکاتیب خالصتاً" اردو تہذیب و ثقافت کے آئینہ دار ہیں۔ گردش زمانہ نے انہیں کب کا میٹ دیا۔ آزادی سے قبل کے جاگیرداری عہد کا وہ ماحول جس نے مکتوب نگار کے ذہن' کردار' جذبات اور شخصیت کی تعمیر و تشکیل کی تھی اب کسی کو میسر نہیں آئے گا۔ اگر ان مکاتیب سے اس گم شدہ ماضی کی روایات (اچھی بری جیسی بھی تھیں) اور اس کے پروردہ ذوق علم و ہنر کی کچھ جھلکیاں کسی کو نظر آسکیں تو ہے چشم خریدار پہ احساں میرا"۔

اس مجموعہ مکاتیب میں ساغر نظامی مدیر "ایشیا" کی مولانا حبیب الرحمن صدیقی کے خطوط کے بارے میں رائے بھی "ایشیا" جون ١٩٨١ء کے حوالے سے نقل ہوئی ہے۔ ساغر صاحب کی رائے کا اقتباس ملاحظہ فرمایئے"۔ حبیب آرٹ' شاعری اور زندگی کی حقیقی گہرائیوں کا حکیمانہ علم رکھتے ہیں۔ دنیا اور اس سے تعلق رکھنے والی باتوں سے اتنے ہی غمگین اور مسرور ہوتے ہیں جس قدر ایک فلسفی۔ مسائل میں سخت نکتہ چیں اور دور رس ناقدانہ انداز' اور بے لاگ انسان' مخلص اور سچے دوست' اپنی جدوتوں کے خود دشمن' عوامی تخیل رکھنے کے باوجود خواص سے لاپرواہ---------- حبیب کے خطوط سے مطالعے کی وسعت' حکیمانہ ذہنیت' قادر البیانی' تازگی' لچک' دیسا نتگی' خلوص اور تنقید عالیہ کی بلند روح ظاہر ہوتی

ہے۔ انداز تحریر ایک خوبصورت دریا کا بہاؤ ہے جو الفاظ کو اس طرح بہائے لئے جا رہا ہے جیسے موجیں کشتی کو"۔

آپ کے تلامذہ میں رشید کیفی' عبدالغنی فاروقی' شارق نیازی' عثمان فاروقی' تصدق حسین تاجی اور حفیظ اللہ خاں بدر کھام گانوی کافی مشہور ہیں۔

ماخذ : مکاتیب حبیب' ذریعہ میں اردو شاعری ص ۲۷۲ تا ۲۷۳

خلیل الہدیٰ امرادی' ص ۳' ۲۶ مارچ ۱۹۷۶ء' صحیفۂ شاعر' ص ۷۵' ستمبر اکتوبر ۱۹۸۰ء کھام گاؤں۔

عبدالعلیم صدیقی روڈ کراچی

منشی حکیم الدین

منشی حکیم الدین ایک خوشحال اور با اثر گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے اعلیٰ عہدوں پر خدمات انجام دیں اور گہرے نقوش چھوڑے۔

منشی حکیم الدین یکم جنوری ۱۸۴۹ء کو بمقام سرول ضلع میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۶۵ء میں دہلی سے ملازمت کا آغاز کیا اور مختلف عہدوں پر فائز رہنے کے بعد یکم جنوری ۱۹۰۳ء کو مین پوری سے ڈپٹی کلکٹر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ اسی سال دسمبر ۱۹۰۳ء سے ۱۹۰۸ء تک بھوپال میں نائب وزیر مال کے عہدے پر خدمات انجام دیں۔ ۱۹ دسمبر ۱۹۰۹ء کو تحصیل باغپت کے لئے آنریری مجسٹریٹ اور بعد میں آنریری اسسٹنٹ کلکٹر بنائے گئے۔ ۱۹۱۶ء میں میرٹھ ضلع سے "خان بہادر" کے خطاب کے لئے نامزد ہوئے۔

منشی حکیم الدین کے والد محترم منشی عزیز الدین بھی اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز رہے۔ وہ حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے صاحبزادے مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے شاگرد رشید تھے۔ غازی پور' اناؤ اور فتح آباد کے تحصیلدار رہے۔ لکھنؤ' بہرائچ اور گونڈہ میں ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کی حیثیت سے بندوبست کا کام کیا۔ ۱۳ اپریل ۱۸۸۴ء کو ان کا انتقال ہوا۔ اس وقت گونڈہ میں مقیم تھے۔ وہیں کربلا متصل تالاب میں دفن کئے گئے۔

منشی حکیم الدین صاحب سے ممتاز شاعر حضرت رنج کی بہن عمر النساء کی بڑی صاحبزادی سید النساء سے شادی ہوئی۔ منشی صاحب کے دونوں بیٹوں عبید الحق اور حاجی بدرالدین انور کو شعر و شاعری سے دلچسپی تھی۔ عبید الحق کو یزدانی اور حاجی بدرالدین کو حضرت میرٹھی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ اول الذکر ۱۹۴۸ء اور آخر الذکر ۱۹۵۸ء میں جہان فانی سے رخصت ہوئے۔

عبید الحق کے بیٹے نور الدین بھی ڈپٹی کلکٹر رہے۔ ان کے ایک صاحبزادے ڈاکٹر ظہور صدیقی دہلی یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ میں پروفیسر ہیں۔ حاجی بدرالدین صاحب کی دختر نگار فاطمہ (پ: ۱۹۲۸ء) پدم شری حکیم سیف الدین احمد صاحب کی اہلیہ ہیں۔

منشی حکیم الدین کا انتقال ۲۸ نومبر ۱۹۱۹ء کو ہوا۔ ان کے ہم زلف حکیم فخر الدین نے تاریخ وفات کہی:-

اخوئی منشی حکیم الدین احمد باخدا
سوئے جنت جب سدھارے بہر خواب
دل سے ہاتف نے کہا بے ساختہ صلِ علیٰ
سالِ رحلت فخر لکھ غفران مآب

منشی حکیم الدین شعر بھی کہتے تھے۔ جارج پیش شور اور منشی حکیم الدین کے اصرار پر ہی ''کلیاتِ رنج'' حکیم فخر الدین نے شائع کیا۔ کلیات میں منشی صاحب کا قطعہ تاریخ شامل ہے۔

جہاں میں غل ہے گلزارِ سخن میں پھر بہار آئی
کلامِ رنج سے عالم میں ایک تازہ چمن پھولا
حکیم نکتہ داں پی ہے سر زدہ آج اک ساغر
بہارِ عیش میں کہہ دے گلستانِ سخن پھولا

۱۳۰۸ھ

حکیم فصیح الدین رنج میرٹھی ص ۳۶-۳۷

خالدہ ریاست

خالدہ ریاست

معروف ٹیلی ویژن اداکارہ خالدہ ریاست نے اپنی فطری صلاحیتوں کے خوب جوہر دکھائے۔ انہوں نے ایک قلیل مدت میں وہ مقام حاصل کر لیا تھا جس کی فن کار تمنا کرتے ہیں۔ وہ ایک ایسی اداکارہ تسلیم کی گئیں جس نے ناظرین کے دلوں میں جگہ بنالی تھی۔

خالدہ ریاست محکمہ پولیس کے ایک دیانت دار، فرض شناس اور نیک نام افسر ریاست اللہ خان کی سب سے چھوٹی بیٹی تھیں۔ ریاست صاحب کی سات بیٹیوں میں عائشہ خان اور خالدہ ریاست ہی فن کی دنیا میں آئیں۔ ان بہنوں کے دو بھائی راحت اللہ خان اور خالد اللہ خان ہیں۔ ریاست صاحب مرحوم کراچی میں اس وقت ایس۔ ایس۔ پی تھے جب پورے شہر کا ایک ہی ایس۔ ایس۔ پی ہوتا تھا۔ ان کا تعلق شاہجہاں پور سے تھا۔ یہ قصبہ ضلع میرٹھ کا حصہ ہے۔

خالدہ ریاست نے کراچی میں تعلیم حاصل کی۔ اداکاری سے شوق تھا۔ پہلی مرتبہ جاسوسی سیریل "نامدار" کے ذریعہ متعارف ہوئیں۔ ۱۹۷۳ء میں ٹیلی کاسٹ ہونے والی اس سیریل میں وہ ایک منجھی ہوئی اداکارہ کی حیثیت سے نمایاں ہوئیں۔ سید قاسم محمود مدیر انسائیکلوپیڈیا پاکستانیکا کے مطابق ڈرامہ "ڈائجسٹ" میں خالدہ ریاست نے اداکاری کے ایک نئے کیچر کو متعارف کرایا۔ "ڈاکٹر انور سجاد کے کھیل "ہوا اور سمندر" میں خالدہ ریاست نے جدید عورت کے مسائل کو پیش کیا۔ طویل دورانیے کے کھیل "وادی پر خار" میں شاندار اداکاری کرنے پر وہ چوتھے پاکستان ٹیلی ویژن ایوارڈ کی بہترین اداکارہ قرار پائیں۔ اس ڈرامے میں ان کے ساتھ آصف رضا میر تھے۔ یہ کھیل یونس جاوید نے تحریر کیا تھا۔ بانو قدسیہ کے ڈرامے "دو کنارے" میں اپنے منفرد لب ولہجے اور چہرے کے تاثرات سے بڑے بڑے ناقدینِ فن کو اپنے فن کی مداحی پر مجبور کر دیا اور اس طرح شہرت بڑھتی چلی گئی۔ "نقش ثانی" میں طلعت حسین کے مقابل خالدہ ریاست نے اپنی صلاحیتوں کا خوبصورت اظہار کیا۔

ان کی کامیاب ترین ڈرامہ سیریل "بندش" قرار دی جاتی ہے۔ ممتاز ادیبہ حسینہ معین کے اس کھیل میں وہ اپنے فن کی معراج پر تھیں۔ انہوں نے ثابت کیا کہ وہ سب سے الگ اور منفرد ہیں اور ان کا اسلوبِ اظہار خاص ان کی ذات سے مخصوص ہے۔ خالدہ ریاست کے بے شمار ڈراموں میں دھوپ دیوار' ساحل' بازید' ساون روپ' آدھے چہرے' دشتِ تنہائی' امید بہار' چنان پر گھونسلہ اور دھوپ کنارے زیادہ مقبول و مشہور ہوئے۔

توقع تھی کہ خالدہ ریاست جہانِ فن میں اپنی فطری اداکاری کا سفر اور نئی منزلوں سے آشنا کریں گی مگر وہ سرطان جیسے موذی مرض میں مبتلا ہو کر عین عالم جوانی میں ۲۶ اگست ۱۹۹۶ء کو جہانِ فانی سے رخصت ہو گئیں۔ متعلقہ شعبے سے وابستہ ساتھیوں کے علاوہ لاکھوں مداح سوگوار ہو گئے۔ ان کی موت کو ناقابلِ تلافی نقصان قرار دیا گیا۔

انسائیکلوپیڈیا پاکستانیکا' ص ۲۶۹

ڈاکٹر خاور جمیل

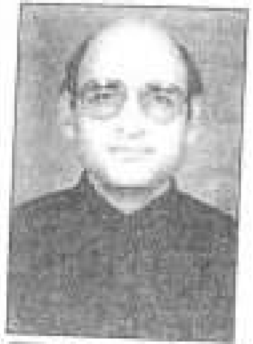

ڈاکٹر خاور جمیل

ڈاکٹر محمد خاور جمیل ممتاز دانشور ڈاکٹر جمیل جالبی کے صاحبزادے ہیں۔ موصوف خاندانی روایات کے امین ہیں۔ شگفتگی، متانت، ذہانت اور علمیت چہرے سے ظاہر ہے۔ ملنساری، خوش مزاجی اور کم گوئی مزاج کا حصہ ہے۔ سول سروس میں ہوتے ہوئے علمی کام بھی کر رہے ہیں اور خوش فکر شاعر بھی ہیں جس کا علم کم لوگوں کو ہے۔

ڈاکٹر خاور جمیل نے کراچی یونیورسٹی سے گریجویشن کیا اور اپنی اسی مادر علمی سے ایم۔اے (اکنامکس)، ایل۔ایل۔بی اور ایل۔ایل۔ایم کیا، پھر لندن یونیورسٹی سے ڈی۔پی۔ایم کرنے کے بعد ۱۹۹۵ء میں کراچی یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کر کے اپنی اعلیٰ تعلیم مکمل کی۔

زمانہ طالب علمی میں دوسری سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتے رہے اور ایک متحرک طالب علم کی حیثیت سے پہچانے گئے۔ کراچی یونیورسٹی کی طرف سے Role of Honour اور Most outstanding student، اکنامکس سوسائٹی اور ڈیپارٹمنٹ آف اکنامکس کے اعزازات کے علاوہ سوشیالوجی سوسائٹی کی طرف سے سلور اور گولڈ میڈلز حاصل کر چکے ہیں۔ معلومات عامہ کے مقابلوں میں بھی شریک رہے اور اپنی خداداد ذہانت کا مظاہرہ کرتے ہوئے انعامات حاصل کیے۔ لکھنے لکھانے کا شوق بھی فطری ہے۔ تعلیم کے دوران بہت سے مضمون نویسی کے مقابلوں میں شریک ہی نہیں سرفہرست رہے۔

عملی زندگی میں ایک ذمہ دار اعلیٰ افسر کی حیثیت سے فرائض ادا کرتے ہیں۔ ڈاکٹر خاور جمیل نے مختلف اعلیٰ عہدوں پر رہتے ہوئے بہترین منصوبہ بندی سے اپنے زیر نگرانی محکموں میں اصلاحات کیں اور انہیں فعال رکھا۔ وائس کمشنر سندھ سوشل سیکورٹی، حکومت سندھ کی حیثیت سے وہ ایک کامیاب منتظم رہے جس کے دوررس اثرات مرتب ہوئے۔

ڈاکٹر خاور جمیل کی مختلف النوع خدمات کا سرکاری اور غیر سرکاری دونوں سطحوں پر اعتراف کیا گیا ہے۔ صدر پاکستان نے لٹریچر اور کلچر کے شعبوں میں موصوف کی کارکردگی کے اعتراف میں گولڈ میڈل

دیا۔ مرکزی وزارت تعلیم نے ان کی صلاحیتوں کا اعتراف کیا۔ تعلیم، کلچر، اسپورٹس اور قانون کے صوبائی وزیر نے بھی ان کی طرف سے کی جانے والی کوششوں کو سراہا۔

پیشہ ورانہ اداروں میں بھی ڈاکٹر خاور جمیل ہمیشہ فعال رہے۔ اسلامیہ کالج کراچی کی سوشیالوجی سوسائٹی کے جنرل سیکریٹری منتخب ہوئے۔ ایجوکیشنل کونسل میں حکومت سندھ کے نامزد ممبر کی حیثیت سے بھی آپ نے پوری دلچسپی کے ساتھ کام کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ ادبی مشاغل بھی جاری رکھے۔ ۷۳-۱۹۷۲ء میں مشہور ادبی رسالے "نیا دور" میں ایسوسی ایٹ ایڈیٹر کے فرائض سنبھالے رہے۔ پاکستان نیشنل اکیڈمی کے اعزازی ممبر بھی ہیں۔ آرٹس کونسل کراچی کے امور میں بھی دلچسپی لیتے ہیں اور گورننگ باڈی کے رکن رہ چکے ہیں۔ تعلیمی لائبریریز کے لئے کتب منظور کرنے والی کمیٹی اور وزارت تعلیم کے زیر انتظام نیشنل بک کونسل کی سندھ میں چلڈرن لٹریچر کمیٹی کے ممبر ہیں۔ ادبی وعلمی کتب ادب، مسائل اور کلچر، نئی تنقیدیں اور یادوں کے نگر ری ایڈٹ کر چکے ہیں۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کے لاتعداد مضامین مختلف رسائل واخبارات میں شائع ہوتے ہیں۔

۱۹۸۰ء میں زینت صاحبہ سے آپ کی شادی ہوئی اولاد میں فخرہ جمیل، دانیال جمیل، سدرہ جمیل، ایوب جمیل اور التمش جمیل ہیں۔

ڈاکٹر خاور جمیل مشاعروں میں شرکت کے لئے وقت نہیں نکال پاتے۔ میری درخواست پر انہوں نے کچھ کلام مرحمت فرمایا ہے۔ اسی میں سے چند اشعار پیش کیے جا رہے ہیں۔

غزل

محبت کی نظروں سے دیکھا جہاں تک — نظر آئے مجھ کو، تمھیں تم وہاں تک
گزاری اس انداز سے عمر ہم نے — رہے مہرباں ہم پہ نامہرباں تک
کہاں کا گلہ، چارہ گر، ہوش میں آ — غم دل کی لذت پہ قرباں ہے جاں تک
چمن میں کہیں آج بجلی گری ہے — کہ آنچ آرہی ہے، مرے آشیاں تک

چھپایا جو راز ان سے بھی ہم نے خاور
وہ آکر رہا دل سے آخر زباں تک

چاندنی رات، اس پہ تنہائی — دل کی ایک ایک چوٹ ابھر آئی
بعد مدت کچھ اس طرح وہ ملے — جیسے پھر زندگی پلٹ آئی
حال دل ان سے کیا بیاں کرتے — ان کو دیکھا، تو آنکھ بھر آئی
یہ جو گزرے نظر چرائے ہوئے — ان کی ہم سے بھی تھی شناسائی

ہے یہی آبرو محبت کی
کیوں ہے خاور یہ خوف رسوائی

قطعات

محبت، راہ تسلیم و رضا ہے — محبت، چارہ صدق و صفا ہے
محبت کر، محبت کر محبت — محبت، باعث قرب خدا ہے

محبت، پرتو شمس و قمر ہے — محبت، جلوۂ نور سحر ہے
محبت ہے متاع دین و دنیا — محبت، اسوۂ خیرالبشر ہے

محبت، ابتدائے زندگی ہے — محبت، انتہائے زندگی ہے
محبت ہی، چراغ بزم ہستی — محبت، مدعائے زندگی ہے

خورشید وارثی

خورشید وارثی

ممتاز مصنف محترم سید خورشید علی جعفری گروہی علمی حلقوں میں خورشید وارثی کے نام سے معروف ہیں۔ آپ نے قلم سے وابستگی کا حق نہایت انہماک اور دلچسپی سے ادا کیا ہے۔ اسی وجہ سے آپ کی تصانیف کی عالمی سطح پر پذیرائی ہوئی ہے۔

خورشید وارثی صاحب کے والد سید محسن علی جعفری خلف سید بدر علی جعفری ایک علمی اور بااثر گھرانے کے فرد تھے۔ وہ محکمہ پولیس میں ملازم تھے اور ملازمت کے دوران اپنے فرائض کی انجام دہی میں ڈاکوؤں سے مقابلے میں شہید ہوئے۔ ان کی شہادت کے بعد ان کو کنگ پولیس میڈل دیا گیا تھا۔ سید محسن علی جعفری اپنی پوسٹنگ کی وجہ سے الہ آباد میں تھے، وہیں یکم نومبر ۱۹۱۸ء کو خورشید وارثی صاحب کی ولادت ہوئی۔ محسن صاحب کا وطن میرٹھ ہے۔ شہر کے محلہ مشائخان میں ان کا مکان تھا۔ ان کے مکان کے قریب ہی مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی کی رہائش گاہ تھی۔

چار سال کی عمر میں خورشید صاحب اپنے ماموں مرزا محمد حامد کے پاس میرٹھ آ گئے۔ یہاں تعلیم و تربیت کا سلسلہ شروع ہوا۔ اسلم سیفی صاحب کے صاحبزادے اکرام سیفی آپ کے بچپن کے دوستوں میں سے ہیں۔ یہاں فیض عام ہائی اسکول میں تعلیم پائی اور پھر گورنمنٹ ہائی اسکول میرٹھ سے میٹرک کیا۔ اس دور کے کلاس فیلوز میں اختر عباس محتشب جارچوی، نواب جمشید علی خان کے صاحبزادے شمشاد علی خان، مولانا شاہ احمد نورانی کے بھائی شاہ احمد جیلانی اور ممتاز ہاکی پلیئر مشتاق احمد شامل ہیں۔

آپ کے پھوپی زاد بھائی حامد علی جعفری جے پور کے راجا کے بچوں کے اتالیق تھے اور مہاراجہ ہائی اسکول کے صدر مدرس بھی تھے۔ انہوں نے خورشید صاحب کو جے پور بلا لیا۔ وہاں آپ مسلم مڈل اسکول میں ڈرائنگ ماسٹر ہو گئے۔ اس وقت آپ کی عمر پندرہ سال اور چند ماہ تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ تعلیم جاری رکھتے ہوئے الہ آباد بورڈ سے ۳۶-۱۹۳۵ء میں اعلیٰ قابلیت کا امتحان پاس کیا اور پھر الہ آباد یونیورسٹی سے بی۔اے اور ایم۔اے کے امتحانات میں کامیابی حاصل کی اور انگریزی کے مضمون کو ہی اپنائے رکھا۔

۱۹۴۰ء میں خورشید صاحب میرٹھ واپس آ گئے۔ والدہ نے نہایت شفقت و محبت سے کہا کہ بیٹا تمہارے باپ نے نہایت ذمہ داری کے ساتھ پولیس کے محکمے میں فرائض انجام دیئے۔ حتیٰ کہ اپنی جان قربان کر دی۔ میری خواہش ہے کہ تم والد کے نقش قدم پر چلو۔ میں تمہیں وردی میں دیکھنا چاہتی ہوں۔ ماں کے احساسات سے متاثر ہو کر آپ نے ان سے وعدہ کر لیا۔ ماں کی خواہش کی تکمیل سعادت مند بیٹے کی زندگی کا مقصد بن گئی۔ آپ محکمۂ پولیس میں ملازم ہو گئے اور مراد آباد میں ٹریننگ حاصل کی۔ پہلی پوسٹنگ انسپکٹر کی حیثیت سے لکھیم پور میں ہوئی۔ ایک سال بعد تھانہ بھیرہ میں براہِ راست ایس۔ ایچ۔ او مقرر ہوئے اس وقت وارثی صاحب سب سے کم عمر پولیس افسر تھے۔ بعد میں چھ سال تک مختلف شہروں میں یہ فرائض سنبھالے رہے۔

۱۹۴۸ء میں خورشید وارثی صاحب پاکستان آ گئے اور کراچی کو مستقر بنایا۔ اسی سال ایس۔پی، سی۔آئی۔ڈی نے بغیر کسی ڈاکومنٹ کے آئی۔جی سندھ سے منظوری حاصل کر کے سب انسپکٹر اسپیشل کیس سیکریٹ برانچ میں لے لیا۔ اس پوسٹ پر دو سال کام کیا۔ اس دوران کچھ عرصہ پولیس اہلکاروں کو قانون بھی پڑھایا۔ ۱۹۵۱ء میں اینٹی کرپشن سندھ میں انسپکٹر کلاس ٹو گزیٹیڈ آفیسر ہو گئے۔ حیدر آباد ڈسٹرکٹ کے اینٹی کرپشن ڈیپارٹمنٹ سے انسپکٹر کی پوسٹ سے ۱۹۷۱ء میں ریٹائر ہوئے۔ یہ امر باعثِ حیرت ہے کہ اپنی سروس کے دوران نہ آپ نے کسی کو گالی دی اور نہ کسی پر تشدد کیا اور ایک کامیاب پولیس افسر مانے گئے۔

انگریزی تو خورشید صاحب کا مضمون تھا ہی، لکھنے پڑھنے کا ذوق بھی ابتداء سے رکھتے تھے۔ دینی رجحان بھی شروع سے ہے اور اسلامی تعلیمات کو ہی دونوں جہاں میں سرخروئی کا سبب مانتے ہیں۔ مسلمانوں کی شیرازہ بندی سے ہمیشہ متفکر رہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد ایک عرصے کے مطالعے اور گہرے غور و فکر کے بعد دردمندی کے ساتھ قلم سنبھالا۔ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف یہودیوں کی منصوبہ بندی کو منظرِ عام پر لانے کے لئے کمربستہ ہوئے اور حق تو یہ ہے کہ حق ادا کر دیا۔ آپ کی تصانیف شاہد ہیں کہ خورشید وارثی صاحب کا تجزیاتی شعور بہت پختہ ہے۔ آپ کے فکر و عمل میں عالمِ اسلام کے اتحاد اور مسلمانوں کی ترقی و سربلندی کے لئے پرخلوص جذبات کا عکس بہت واضح ہے۔ خورشید صاحب نے اپنی تحریروں میں سائنٹیفک انداز اپنایا ہے اور اپنے موقف کو استدلال کے ساتھ پیش کرتے ہیں جو آفاقی ہے اور دل میں اترتا چلا جاتا ہے۔ آپ کی تمام تصانیف کے موضوعات کو دیکھنے کے بعد کہا جا سکتا ہے کہ آپ صورتاً" اور سیرتاً" ہی نہیں قلباً" بھی ایک ایسے نظریاتی شخص ہیں جس کی رگوں میں غیرت و حمیت دوڑ رہی ہے اور وہ پورے شعور و ادراک کے ساتھ اسلامی روح کو پیش کر رہے ہیں۔ اکابرین نے خورشید وارثی صاحب کی علمی و دینی خدمات کو سراہا ہے۔ چند آراء سے مختصر اقتباسات پیش خدمت ہیں:

ڈاکٹر انعام اللہ خان: جناب خورشید وارثی کی تالیف "مسئلہ قومیت اور اس کا حل" ایک فکر انگیز

کتاب ہے انہوں نے یہ کتاب بڑے سائنٹیفک انداز میں مرتب کی ہے اور اپنے جائزے میں معروضیت کا پورا خیال رکھا ہے۔

پروفیسر حسنین کاظمی: بحیثیت ایک مسلمان اور ایک پاکستانی کے' وارثی صاحب نے ایک قومی فریضہ بہ طریقِ احسن پورا کر دیا ہے۔ جس ذہنی انتشار کی کیفیت سے ہم گذر رہے ہیں اس میں اس فریضے کی ادائیگی بجائے خود ایک بڑا کام ہے۔

حکیم محمد سعید: میں نے "پاکستان اور ہشت پا" کو نہایت توجہ کے ساتھ پڑھا اور میں کہتا ہوں کہ پاکستان آج جن حالات سے گذر رہا ہے' اور جن مصائب کی گرفت میں ہے ایسے حالات میں یہ تالیف حالاتِ حاضرہ کا ایک نہایت جامع محاکمہ ہے۔

خورشید وارثی صاحب کی انگریزی اور اردو تصانیف درج ذیل ہیں۔

۱۔ اتحادِ امت ۲۔ اتحادِ ملتِ اسلامیہ ۳۔ روحِ اتحادِ امت ۴۔ مسئلہ قومیت اور اس کا حل ۵۔ پاکستان اور ہشت پا (تین جلدیں) ۶۔ اسلامی ریاست کا دستور ۷۔ ادارہ اتحادِ امت کا موقف ۸۔ دو تاریخی واقعات ۹۔ قلم جناح اور جمہوریت ۱۰۔ قائداعظم اور فوج ۱۱۔ طالبان کا افغانستان: امن اور سلامتی کا گہوارہ۔

12. GULF WAR A JEWISH CONSPIRACY.
13. THE COBWEB WORLD-WIDE DESIGNS OF SATAN.
14. THE ZIONIST INTERNATIONAL CONSPIRACY.
15. ECONOMIC WARFARE.
16. THE HIDDEN ENEMIES OF INDIA.
17. DISINTEGRATION OF U.S.A IN OFFING.
18. SYNOPSIS OF ECONOMIC WARFARE.
19. STATUS OF WOMAN IN ISLAM.

تصنیف و تالیف کے علاوہ خورشید صاحب کی اہم خدمت امتِ مسلمہ کے اتحاد کے لئے کی جانے والی عملی کوششیں ہیں۔ آپ نے پہلے امتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتحاد کے شرعی جواز کے متعلق تمام مکاتبِ فکر کے علماء سے فتویٰ حاصل کیا۔ مفتی ولی حسن' مفتی محمد رفیق حسنی' علامہ ابنِ حسن نجفی اور مفتی عبدالقہار صاحبان نے اپنے فتاویٰ میں نہ صرف اس کو جائز قرار دیا بلکہ وقت کی ایک اہم ضرورت اور مستحسن اقدام قرار دیا۔ ان فتاویٰ کی روشنی میں وارثی صاحب نے "ادارہ اتحادِ امت" کے نام سے ایک ادارے کی تشکیل کی جو ۱۹۸۱ء میں رجسٹرڈ ہوا۔ اس ادارے کے زیرِ اہتمام متعدد کتب اور کتابچے شائع ہو چکے ہیں۔

ادارہ اتحادِ امت کے قیام کے بعد اس کے اثرات ظاہر ہونا شروع ہوئے۔ پاکستان کی تاریخ میں پہلی

بار مسلمان اور عیسائی دانشوروں کے درمیان مکالمہ کے سلسلے میں ملتان میں پانچ روزہ سیمینار منعقد ہوا' جس میں پوری دنیا سے مسلم اور عیسائی دانشور شریک ہوئے۔ اس سیمینار میں وارثی صاحب کو مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے مدعو کیا گیا تھا۔ خورشید وارثی کی کتاب کوب ویب کے حوالے سے سیمینار کے شرکاء نے مسلم عیسائی یکجہتی کے لئے رضامندی کا اظہار کیا۔ اس کتاب کا نفسِ مضمون یہ ہے کہ یہودی' مسلمانوں اور عیسائیوں کے دشمن ہیں جس کا ثبوت یہ انجیل ہے جس میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سولی پر چڑھانے والے یہودی تھے۔ اس لئے مسلمان اور عیسائی متحد ہو کر اس خطرناک دشمن سے اپنا دفاع کریں۔

وارثی صاحب نے برطانیہ اور ابو ظہبی کا سفر کیا۔ اس سے پہلے ۱۹۸۱ء میں حج کی سعادت حاصل کر لی تھی۔ ۱۹۸۵ء میں اتحادِ امت کی کوششوں سے متاثر ہو کر حکومتِ ایران نے حج کی دعوت دی جو آپ نے قبول کر لی۔ اس حج میں ایرانی وفد کی قیادت حجۃ الاسلام مہدی کروبی نے کی تھی۔ جن سے خورشید وارثی صاحب کو تبادلہ خیالات کا موقع ملا۔

وارثی صاحب کی شادی ۱۹۴۳ء میں سرور جہاں بنت حاجی مرزا معین الدین بیگ سے بنارس میں ہوئی' جہاں مرزا صاحب کی پوسٹنگ تھی۔ آپ کی اولاد میں دو بیٹے اور پانچ بیٹیاں ہیں۔ جمال خورشید سعودی عرب میں ایک امریکی فرم میں ایریا منیجر ہیں۔ نجم خورشید ابو ظہبی کے نیشنل بینک میں آفیسر ہیں۔ روما' رخشاں' افشاں' سیما اور رعنا بھی اپنے گھروں کو سنبھالے ہوئے ہیں۔ آپ کے سب بچے ایم۔اے ہیں۔

خورشید وارثی صاحب شعر و ادب سے بھی گہرا شغف رکھتے ہیں مگر شعر کم کہتے ہیں۔ چند اشعار بطور نمونہ ملاحظہ فرمایئے۔

تصور کی دنیا میں جب تو عیاں ہے
مجھے تارے گننے کی فرصت کہاں ہے
اجڑ رہا ہے نشیمن ہوا کے جھونکوں سے
قفس میں دیکھ کے ہم تلملائے جاتے ہیں
گناہِ حضرتِ آدم ہے باعثِ تخلیق
گناہ کرنے سے ہم کیوں ڈرائے جاتے ہیں
دو عشق کے ماروں کو خبر بھی نہ ہوئی کہ
یوں گذرا دبے پاؤں محبت کا زمانہ
مل کر جسے ہم دونوں نے ترتیب دیا تھا
لوگوں کی زباں پر ہے ابھی تک وہ فسانہ
وہ سامنے ہیں یا کہ تصور ہے سامنے

یوں محبت خیال کی بہکا رہی ہے آج
ساحل ہے دور ، رات ہے اور کشتیٔ حیات
موجوں میں ڈگمگاتی چلی جا رہی ہے آج
اے موت چھوڑ دے ، مجھے للہ چھوڑ دے
ان کی نظر زمیں جھکی جا رہی ہے آج
خدا سے چھیڑی ہوئی جنگ روکنا ہو اگر
مٹا دو سود کی لعنت کو اپنے کھاتوں سے
تھا جن کا ارضِ مقدس میں داخلہ ممنوع
انہیں کو سونپ دیا ملک اپنے ہاتھوں سے

ڈاکٹر راحت ابرار

ڈاکٹر راحت ابرار

ڈاکٹر راحت ابرار صاحب کا شمار ہندوستان کے ممتاز صحافیوں میں کیا جاتا ہے۔ آپ ۲۳ دسمبر ۱۹۵۵ء کو ضلع میرٹھ کے مشہور گاؤں "رٹول" میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد گرامی اسرار الحق صدیقی اس علاقے کے بہت بڑے زمیندار تھے۔ انہوں نے رٹول میں آموں کے باغات لگائے اور اپنے والد انوار الحق صدیقی کے پیدا کردہ آم "انور رٹول" کو بہت شہرت دلائی۔

راحت ابرار صاحب نے ابتدائی تعلیم اپنے ننھیال قصبہ سکندرہ راؤ (علی گڑھ) اور میرٹھ شہر میں حاصل کی۔ یو۔ پی بورڈ سے ۱۹۷۳ء میں ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پری یونیورسٹی میں داخلہ لیا جہاں سے ۱۹۷۷ء میں بی۔ اے '۱۹۸۰ء میں بی۔ ایڈ '۱۹۸۱ء میں ایم ایڈ اور ۱۹۸۹ء میں اردو میں ایم۔ اے کیا۔ اس تعلیمی سلسلے کے دوران جامعہ اردو 'علی گڑھ سے ۱۹۷۶ء میں ادیب کامل اور ۱۹۷۸ء میں معلم اردو بھی کر لیا تھا۔ ۱۹۹۸ء میں آپ نے رام منوہر لال یونیورسٹی 'فیض آباد سے پی۔ ایچ۔ ڈی کا اعزاز حاصل کیا۔

ڈاکٹر راحت ابرار صاحب نے عملی زندگی کا آغاز صحافت سے کیا۔ اردو 'ہندی اور انگریزی زبانوں پر عبور رکھتے ہیں اسی لئے تینوں زبانوں کے اخبارات و رسائل میں مسلسل خدمات انجام دیں۔ اردو کے اخبارات "سیاستِ جدید" "کانپور اور "قومی آواز" ہندی کے اخبارات امر اجالا 'جنتا یگ' نشانت 'نو بھارت ٹائمز اور ہندوستان وغیرہ کے علاوہ انگریزی اخبارات و رسائل نیشنل ہیرالڈ 'نیشن 'اسٹیٹ مین' ورلڈ اور یونیورسٹی نیوز وغیرہ کی نمائندگی کی۔ ان اخبارات و رسائل میں دو سو سے زاید اردو' سو سے زاید ہندی اور پچاس کے قریب انگریزی میں مضامین 'فیچرز' انٹرویوز اور کہانیاں وغیرہ لکھیں۔ قومی موضوعات پر تینوں زبانوں میں آپ کی فکر انگیز تحریریں بھی شائع ہوتی رہی ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف نے اخلاص و انہماک اور ذمہ داری کے ساتھ صحافت میں خدمات انجام دی ہیں اور یادگار نقوش چھوڑے ہیں۔

ڈاکٹر راحت ابرار صاحب نے ۱۹۸۹ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سم اسپیس فارورڈ" کے نام سے ایک بروشر ترتیب دیا۔ ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کو دور کرنے کے لئے ملک کے دور دراز علاقوں کا دورہ کیا اور ایک "کل ہند تعلیمی کارواں" کے ذریعہ مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کیا۔ بعد میں اس تعلیمی سفر کو آپ نے کتابی شکل میں شائع کیا۔ بابری مسجد کے انہدام سے متاثر ہو کر آپ نے ایک کتاب بھی مرتب کی۔ موصوف نے بھارت کے صوبہ اتر پردیش کے مسلم زیر انتظام تعلیمی اداروں اور فلاحی تنظیموں کی ایک ڈائریکٹری بھی مرتب کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی ایجوکیشن سوسائٹی اور ایجوکیشن فورم، یو۔پی رابطہ کمیٹی اور علی گڑھ جرنلسٹ ایسوسی ایشن کے اعزازی سکریٹری ہیں اور یونیورسٹی گزٹ کے ادارتی بورڈ کے ممبر بھی ہیں۔

ڈاکٹر راحت ابرار صاحب نے تخلیقی اور ادبی صحافت میں ہی نمایاں کردار ادا نہیں کیا بلکہ ہندوستان کے علمی حلقوں میں ممتاز محقق اور ناقد کی حیثیت سے آپ کی تحریروں کو معتبر سمجھا جاتا ہے۔ آپ نے سرسید احمد خاں کے مضامین کا ہندی زبان میں ترجمہ بھی کیا ہے تاکہ ان کے افکار و نظریات سے دوسرے حلقے بھی روشناس ہو سکیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے آپ کو گہرا لگاؤ ہے۔ یہیں تعلیمی سلسلہ مکمل کیا اور اس علمی مرکز کی خدمت کو ہی مقصدِ حیات بنایا۔ ۱۹۸۳ء میں اسسٹنٹ پبلک ریلیشنز آفیسر کی حیثیت سے یونیورسٹی سے وابستہ ہو گئے۔ ۱۹۹۸ء میں ترقی دیکر پبلک ریلیشنز آفیسر بنادیے گئے ہیں۔

اپنی دفتری مصروفیات کے باوجود ملک بھر کے تعلیمی اداروں میں منعقد ہونے والی کانفرنسوں اور سیمیناروں میں شرکت کرتے رہتے ہیں۔ ایک مخلص سماجی کارکن اور دردمند مسلمان ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کی فلاح و اصلاح کے کاموں میں پیش پیش رہتے ہیں۔ آپ کے دائرہ تحقیق میں علی گڑھ کو مرکزیت حاصل ہے۔ علی گڑھ سے متعلق کافی مواد جمع کر چکے ہیں اور متعدد عنوانات کے تحت کئی کتابیں ترتیب دے رہے ہیں۔ رنج میرٹھی پر آپ کا بلند پایہ تحقیقی مقالہ ذوقِ تحقیق کا آئینہ دار اور محض ایک صحافی کی لسانی قدرت کا ثبوت ہی نہیں دیتا بلکہ تحقیق و جستجو کے پس منظر میں ایک ممتاز محقق اور باریک بیں نقاد ہونے کا ثبوت بھی فراہم کرتا ہے۔ آپ کی فعال اور متحرک شخصیت سے مزید توقعات وابستہ ہیں۔ آپ کا نام و کام یقیناً "حوالہ" میں رہے گا۔

رائے بہادر لالہ رامونج دیال

رائے بہادر لالہ رامونج دیال میرٹھ کے ممتاز اور خوشحال زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ تعلیم سے بہت دلچسپی تھی۔ عمر بھر تعلیمی اداروں سے وابستہ رہے۔ میرٹھ کالج سے بھی ان کی وابستگی بہت مستحکم تھی۔ بورڈ آف مینجمنٹ میرٹھ کالج کے ممبر ہونے کے علاوہ تازیست منتظمہ کمیٹی کے ممبر رہے۔ ۱۹۰۶ء میں سکریٹری بھی منتخب ہوئے تھے۔ اپنی زمینداری کی آمدنی سے ہر سال ایک معقول رقم تعلیمی اداروں پر خرچ کرتے تھے۔ کارِ خیر کے دوسرے شعبوں میں بھی ان کی یادگار خدمات ہیں۔ ہندو یتیم خانہ میرٹھ انہیں کی کوششوں اور اعانت سے قائم ہوا۔ دوسرے سماجی اور فلاحی اداروں کی بھی انہوں نے ہمیشہ سرپرستی کی۔

رائے صاحب کا حلقہ احباب بھی وسیع تھا۔ مسلم زعماء سے بھی ان کے خصوصی مراسم تھے۔ خان بہادر شیخ عبدالکریم کے خاص احباب میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ دسمبر ۱۹۱۱ء میں ان کا انتقال ہوا۔

رائے بہادر لالہ رامونج دیال کے تینوں بیٹوں لالہ مہابیر پرشاد، سیٹھ رامیشور پرشاد اور لالہ ہری پرشاد نے اپنے باپ کی طرح قومی و سماجی خدمت کے سلسلے کو قائم رکھا۔ ان کے تینوں بیٹے بھی انتقال کر چکے ہیں۔ رائے بہادر کی تیسری نسل بھی اپنی خاندانی روایات کی پابند ہے۔

خان بہادر حاجی رشید احمد

خان بہادر حاجی رشید احمد

خان بہادر حاجی رشید احمد کی شخصیت گوناگوں خصوصیات کی حامل تھی۔ ایک طرف خان بہادر موصوف علماء و صلحاء کے ساتھ بوریہ نشین تھے تو دوسری طرف آپ رؤوساء اور حکام کی محفلوں میں پیش پیش رہتے تھے۔ ان مصروفیات کے ساتھ ساتھ شب بیداری اور تلاوت و وظائف کے معمولات میں کوئی فرق نہیں آنے دیتے تھے۔

حاجی رشید احمد صاحب ۱۸۸۰ء میں میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد حاجی عبدالکریم صاحب دیندار اور صاحب خیر بزرگ تھے۔ حاجی صاحب ان کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔ آپ کی نانی اور ماموں شیخ علیم الدین نے آپ کی پرورش کی۔ نانی بہت بڑی عابدہ اور تہجد گزار خاتون تھیں اسی لئے حاجی صاحب کی زندگی میں دینی رنگ غالب رہا۔ قرآنی اور دینی تعلیم کی تکمیل کے بعد آپ نے انگریزی اسکول میں داخلہ لے کر میٹرک پاس کیا اور پھر میرٹھ کالج سے ایف۔ اے پاس کیا۔ اپنی ذاتی قابلیت اور محنت کی بدولت اردو' فارسی اور انگریزی میں آپ کو یکساں قدرت حاصل تھی۔ انگریزی تقریر و تحریر میں ملکہ رکھتے تھے۔

حاجی صاحب تعلیم سے فارغ ہو کر اپنے ماموں کے ساتھ کاروبار میں شریک ہو گئے۔ میرٹھ کا میدان آپ کی تجارتی سرگرمیوں کے لئے محدود تھا اس لئے کلکتہ جا کر اپنے سسرال والوں کے ساتھ کاروبار میں شریک ہو گئے۔ ۱۹۱۲ء میں اپنے عزیزوں کے اصرار پر میرٹھ واپس آئے اور الٰہی بخش اینڈ کمپنی میں شرکت پسند کی۔ یہ بندوق کارتوس کا ممتاز تجارتی ادارہ تھا۔ حاجی صاحب کی شمولیت کے بعد اس کمپنی کا کاروبار اتنا بڑھا کہ یہ کمپنی پورے برصغیر میں مشہور ہوئی۔

۱۹۲۲ء میں آپ نے اس کی ایک شاخ کشمیری دروازہ دہلی میں قائم کی اور خود بھی وہیں سکونت اختیار کی۔ قیام پاکستان تک آپ دہلی میں رہے۔ وہاں فسادات میں آپ کی نئی دہلی کی دوکان لوٹ لی گئی اور

کشمیری دروازہ دہلی کی دوکان کے اسلحہ جات حکومت نے اپنی تحویل میں لے لئے۔ ستمبر ۱۹۴۷ء میں آپ دہلی چھوڑ کر کلکتہ چلے گئے جہاں حاجی صاحب کی فرم کی ایک شاخ ۱۹۳۶ء سے قائم تھی۔ کلکتہ میں کاروبار بند کر کے اپنے اہل و عیال کے ساتھ چاٹگام میں مستقل طور پر آباد ہو گئے اور یہیں ۱۰ ستمبر ۱۹۵۲ء کو تہجد کی حالت میں اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ آپ کے انتقال کی خبر سے شہر کی تجارتی سرگرمیاں معطل کر دی گئیں' پورٹ ٹرسٹ کے دفاتر بند ہو گئے اور عدالتوں میں تعطیل کا اعلان کر دیا گیا۔

خان بہادر حاجی رشید احمد نے بھرپور طریقے سے اپنی زندگی کے شب و روز گزارے۔ دینی' قومی' تعلیمی' معاشرتی' تجارتی اور سیاسی شعبوں میں مخلصانہ خدمات انجام دیں۔ ۱۹۳۲ء میں لندن میں منعقد ہونے والی گول میز کانفرنس میں مسلم لیگ کے نمائندے کی حیثیت سے شرکت کی۔ دہلی میونسپل کمیٹی کے دس سال تک رکن رہے اور اس دوران سینئر وائس پریذیڈنٹ بھی رہے۔ انجمن قوم پنجابیان کے صدر' فتحپوری مسلم ہائی اسکول کے سیکریٹری' جامع مسجد دہلی اور فتحپوری مسجد دہلی کی انتظامی کمیٹیوں کے رکن' مدرسہ امداد الاسلام میرٹھ' دارالعلوم دیوبند' مظاہر الاسلام سہارنپور اور مدرسہ امینیہ دہلی کی مجلس شوریٰ کے رکن' دہلی مسلم ایسوسی ایشن کے بانی' چاٹگام چیمبرز آف کامرس کے بانی و صدر' مسلم یونیورسٹی علی گڑھ' آل انڈیا مسلم لیگ کونسل' چاٹگام پورٹ کمیشن اور چاٹگام میونسپلٹی کے رکن کے علاوہ چاٹگام کے اعزازی مجسٹریٹ کی حیثیت سے آپ کی خدمات کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ خان بہادر حاجی رشید احمد ایک قومی و ملی درد رکھنے والے مخلص و ممتاز رہنما اور باعمل مسلمان تھے۔ ملا واحدی نے اپنی کتاب "میرے زمانے کی دلی" میں لکھا ہے کہ دلی میں قائداعظم اور نواب زادہ لیاقت علی خاں کے جو حضرات ہاتھ پاؤں تھے ان میں خان بہادر حاجی رشید احمد مرحوم بھی شامل ہیں۔

ماخذ : یادرفتگاں' نقش اول' ص ۲۹۰ تا ۳۰۰

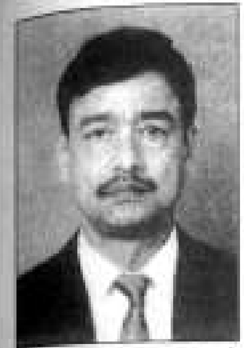

ڈاکٹر رفاقت شیر خاں

ڈاکٹر رفاقت شیر خاں

ڈاکٹر رفاقت شیر خاں ۱۹۴۰ء میں دنیائے رنگ و بو میں آئے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم مروجہ طریقے کے مطابق اپنے والد شیر علی خاں کی نگرانی میں حاصل کی۔ پرتاپ گڑھ سے میٹرک اور آگرہ سے ۱۹۶۰ء میں انٹر کیا اور اسی سال پاکستان ہجرت کی۔ یہاں سلسلۂ تعلیم جاری رکھتے ہوئے ۱۹۶۲ء میں سندھ یونیورسٹی جام شورو سے بی۔ ایس۔ سی کے امتحان میں کامیابی حاصل کی پھر اسی یونیورسٹی سے ۱۹۶۹ء میں ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کیا۔

زمانہ طالب علمی میں رفاقت صاحب کو کھیلوں سے دلچسپی رہی۔ جمپنگ اور فلائنگ کا شوق رہا۔ میرا تھن میں حصہ لیا اور انعامات حاصل کئے نیزہ بازی کے مقابلوں میں بھی شریک ہوئے اس طرح ایک متحرک طالب علم رہے۔

ڈاکٹر رفاقت صاحب نے ۱۹۷۳ء سے ۱۹۷۵ء تک پاکستان آرمی میں خدمات انجام دیں۔ پھر ۱۹۷۷ء تک نائیجیریا آرمی سے وابستہ رہے۔ ۱۹۸۲ء میں ابوظہبی کی مسلح افواج سے تعلق قائم ہوا اور یہ سلسلہ ۱۹ سال قائم رہا۔ آرمی سے کیپٹن کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔

آپ نے دنیا کی سیاحت بھی خوب کی۔ نائیجیریا، ابوظہبی، امریکہ، ملائشیا، سنگاپور، تھائی لینڈ اور یورپی ممالک کے سفر کئے اور اپنے مشاہدات کو وسعت دی۔ آج کل کراچی میں پریکٹس کر رہے ہیں اور ایک کامیاب معالج ہیں۔ 1971ء میں راؤ قدرت علی خاں کی صاحبزادی درخشاں آپ کی شریک سفر بنیں۔ اولاد میں ڈاکٹر سروش رفاقت اور رعنا شیر کے علاوہ ایک بیٹی نہاں ہیں۔ رعنا شیر ٹیکسٹائل ڈیزائننگ سے وابستہ ہیں اور نہاں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ کراچی میں مقیم ہیں۔

رقیہ بیگم

رقیہ بیگم مشہور خطاط منشی ممتاز علی میرٹھی مالک مطبع مجتبائی دہلی کی صاحبزادی تھیں اور اپنی بہنوں عائشہ بیگم، کلثوم بیگم اور زینب بیگم سے چھوٹی تھیں۔ رقیہ بیگم کے بھائی منشی مشتاق علی عربی کے بہترین خوش نویس اور منشی عبدالغنی بھی معروف خوش نویس تھے۔ آخر الذکر نے دہلی میں مطبع مصطفائی جاری کیا تھا۔ رقیہ بیگم نے اپنے والد اور بہنوں کے ساتھ حجاز مقدس ہجرت کی۔

محترمہ رقیہ بیگم نہایت عمدہ خوش نویس تھیں۔ مولانا امداد صابری نے لکھا ہے کہ عربی تحریر میں ان کا جواب نہیں تھا۔ منشی عبدالحمید صاحب نبیرہ منشی ممتاز علی صاحب کا کہنا ہے کہ انہوں نے بہت سے قطعات لکھے تھے جو ان کے والد منشی عبدالغنی صاحب کے پاس تھے" جن پر کتبہ رقیہ بیگم لکھا ہوا تھا۔ اس بات کی تصدیق مولوی محمد سلیم صاحب مہتمم مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ کی زبانی ہوئی۔ انہوں نے ایک تاریخی واقعہ ۱۹۵۳ء میں امداد صابری صاحب کے پہلے حج کے موقع پر انہیں سنایا تھا۔

محمد افضل ہرپی افغانستان کے باشندے تھے۔ انہوں نے مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی بانی مدرسہ صولتیہ، مکہ معظمہ سے تعلیم پائی تھی۔ یہ وہ بزرگ تھے جن کی خطاطی کا جواب تمام عرب میں نہیں تھا۔ جس وقت باب حرم شریف میں باب عباس کے قریب کی جگہ در و دیوار پر طغرے اور عبارت لکھنے کے لئے سلطان عبدالعزیز کے زمانے میں خطاطوں کی تلاش ہوئی" تو مولانا محمد افضل ہرپی نے مولانا سے خواہش ظاہر کی کہ میں اس مبارک کام میں حصہ لینا چاہتا ہوں' چنانچہ مولانا نے کوشش فرمائی' حکم آیا کہ ہر خطاط اپنا نمونہ لکھ کر بھیج دے۔ اس پر ہرپی صاحب نے کہا' نمونہ بھیجنے کی ضرورت نہیں ہے" ایک مقام بتا دیا جائے' وہاں عبارت لکھ دوں گا۔ دوسرے خطاط اس کو دیکھ لیں اور وہ جو فیصلہ کریں گے' وہ مجھے منظور ہوگا۔ چنانچہ جب وہ عبارت خطاطوں نے دیکھی تو سب نے متفقہ طور پر کہا کہ اتنا جلی' اس قدر موزوں خوش خط ہم نہیں لکھ سکتے۔ ہرپی صاحب کسی کو خطاط نہیں جانچتے تھے' لیکن انہوں نے کسی کا سکہ مانا تو رقیہ بیگم کا۔ ان کا خط دیکھ کر جھک جاتے تھے۔

محترمہ رقیہ بیگم مولانا رحمت اللہ صاحب کی معتقد تھیں۔ مولوی محمد سلیم صاحب کو انہوں نے ہی خطاطی سکھائی تھی۔

دلی کی یادگار ہستیاں' ص ۲۰۳' ۲۰۴

ریاست اللہ خاں

ریاست اللہ خاں

ریاست اللہ خاں اپنی دیانت داری اور فرض شناسی کی وجہ سے محکمہ پولیس میں ہمیشہ ہردل عزیز اور قابلِ احترام رہے۔ انہوں نے دورانِ ملازمت قومی مفادات اور فرض کی ادائیگی کو اہمیت دی اور نہایت ثابت قدمی سے زندگی کے شب و روز گزارے۔

شاہجہاں پور ضلع میرٹھ میں ان کی ولادت آبائی حویلی میں ۳۱ دسمبر ۱۹۱۳ء کو ہوئی۔ ان کے والد حمید اللہ خاں پولیس کے محکمہ میں داروغہ تھے۔ ریاست اللہ خاں آٹھ بھائی اور ایک بہن تھے۔ ان کے بڑے بھائی وجاہت اللہ خاں ممتاز انجینئر تھے۔ سوڈان کے شہر ودمدنی کی آبادکاری کے لئے پاکستان سے جو انجینئرز سوڈان بلائے گئے تھے ان کی قیادت وجاہت اللہ خاں نے ہی کی تھی۔ سکھر بیراج کے لئے بھی ان کی خدمات حاصل کی گئی تھیں اور وہ یو۔پی سے بلائے گئے تھے۔ بیراج پر ان کا نام لکھا ہوا ہے۔

ریاست اللہ خاں کی ابتدائی تعلیم مختلف شہروں میں ہوئی۔ انہوں نے گورنمنٹ ہائی اسکول بریلی میں پڑھتے ہوئے یو۔پی بورڈ سے ۱۹۳۱ء میں سیکنڈ ڈویژن میں میٹرک اور بعد ازاں گریجویشن کیا۔

بی۔اے کرتے ہی پولیس کے محکمہ میں شامل ہو گئے اور ٹریننگ پر گئے۔ تقسیم ہند کے وقت سہارنپور میں شہر کوتوال تھے۔ ان کے ایک دوست سلطان سنگھ نے ایک روز دفتر میں ان سے کہا کہ آپ اسی وقت میرے ساتھ چلئے۔ وہ دفتر سے براہِ راست ائرپورٹ لے گئے اور جیب میں سے ٹکٹ نکال کر انہیں دیا اور جہاز میں سوار کرا کے کراچی روانہ کر دیا۔ سلطان سنگھ کو معلوم ہو گیا تھا کہ ان کے قتل کی منصوبہ بندی ہو چکی ہے۔ اس نے دوستی کا حق ادا کرتے ہوئے ان کی جان بچائی۔ اس طرح ۱۹۴۸ء میں وہ تنہا پاکستان پہنچے۔ کراچی میں ظہیر عالم صاحب آئی۔جی پولیس تھے۔ انہوں نے کہا کہ میں اگرچہ آپ سے بخوبی واقف ہوں مگر بغیر دستاویزات کے اگر ملازمت میں لے لیا تو پھر ایسے لاتعداد افراد سامنے آئیں گے اور محکمہ کے لئے مشکلات پیدا ہوں گی لہٰذا آپ دوبارہ ابتدا سے ملازمت کا آغاز کریں۔ اس کے بعد ریاست اللہ خاں

نے نئے سرے سے ملازمت شروع کی اور ترقی کرتے ہوئے ایس۔ایس۔پی ہوئے۔ اس وقت کراچی کے چھبیس تھانے ان کے سپرد تھے۔ انہوں نے اسی عہدہ پر کام کرتے ہوئے استعفیٰ دیا۔

ریاست اللہ خاں نیک طبیعت تھے اور خوفِ خدا رکھتے تھے۔ انہوں نے ایس۔ایس۔پی کی سرکاری رہائش گاہ بھی قبول نہیں کی صرف اس لئے کہ اس کی آرائش کے لئے پیسے درکار تھے اور وہ اپنی حلال کمائی سے یہ خرچ برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے کبھی تحائف بھی قبول نہیں کئے۔ وہ کہتے تھے کہ اگر تحائف قبول کئے تو پھر بدعنوانیوں کو نہیں روکا جا سکے گا۔ ان کا مشہور کیس ہے کہ انہوں نے بھٹ شاہ سے معروف اسمگلر قاسم بھٹی کا سمندر میں چھپایا گیا ساڑھے تو من سونا برآمد کیا۔ رات گئے جب وہ یہ سونا لیکر گھر آئے تو بیگم کو شیطان نے ورغلایا انہوں نے کہا کہ سات بیٹیوں کا ساتھ ہے اس میں سے کچھ رکھ لیجئے۔ انہوں نے کہا کہ بیگم چاہے جتنا سونا نکال لو مگر یاد رکھنا کہ تمہاری قبر میں یہ بیٹیاں نہیں ہوں گی صرف تم جواب دہ ہوگی۔ بیگم نے توبہ کی اور احتیاطاً ریاست اللہ خاں نے وہ رات سونے کے پاس بیٹھ کر حقہ پیتے ہوئے گزاری۔ ان کی کارگزاری کے اعتراف میں پولیس میڈل بھی دیا گیا تھا۔ ریاست اللہ خاں ۱۳ نومبر ۱۹۸۱ء کو فجر کے وقت داغِ مفارقت دے گئے۔ تدفین کراچی کے سخی حسن قبرستان میں ہوئی۔ ان کی اہلیہ امیر جہاں بنت سلامت اللہ خاں بقیدِ حیات ہیں۔ انتقال کے وقت سات بیٹیاں اور دو بیٹے چھوڑے جن میں سے ایک بیٹی مشہور ٹی۔وی آرٹسٹ خالدہ ریاست انتقال کر چکی ہیں۔

بہ شکریہ عائشہ خان۔

مولانا ریاض الحسنؒ

مولانا ریاض الحسن باغپت ضلع میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد منشی ضیاء الحسن انصاری ریاست باغپت میں منیجر تھے۔ ان کا بڑا احترام کیا جاتا تھا۔ اسلام سے گہری وابستگی رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنے صاحبزادے ریاض الحسن کو چودہ سال کی عمر میں بغرض تعلیم و تربیت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی خدمت میں بھیج دیا تھا۔ آپ کو بیس پچیس سال تک مولانا کی خدمت میں رہ کر فیوضات علمی و روحانی سے بہرہ مند ہونے کا موقع ملا۔ آپ نے طب کی باقاعدہ سند لکھنؤ سے حاصل کی تھی۔ میرٹھ میں حکیم غلام مصطفیٰ صاحب کے معاون کی حیثیت سے کچھ عرصہ طبابت کی خدمات انجام دیتے رہے اور وعظ و تلقین کا سلسلہ پوری توجہ کے ساتھ جاری رکھا جس سے ہزاروں افراد کی اصلاح ہوئی۔

مولانا ریاض الحسن صاحب حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے مجاز صحبت تھے۔ ساری عمر دین کے احکام پر سختی سے عمل پیرا رہے۔ حقوق العباد کی ادائیگی پر خاص توجہ رکھتے تھے۔ اسلامی طریقے کے خلاف کسی بھی معاملے میں عمل کرنا گوارا نہ کرتے تھے۔ پوری زندگی سادگی اور اتباع سنت میں گزاری اور عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے سرشار آپ نے ۱۹۴۸ء کو مکہ معظمہ ہجرت فرمائی اور وہیں ۱۹۶۱ء میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ آپ کی تدفین جنت المعلیٰ میں ہوئی۔

کاروانِ تھانوی، ص ۱۹۰

منشی ریاض الدین

منشی ریاض الدین

منشی ریاض الدین بن نذیر الدین محلہ کرم علی میرٹھ میں ۱۹۱۳ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا منشی بشیر الدین نے میرٹھ شہر کے گدڑی بازار میں پرنٹنگ پریس "ہلالی پریس" کے نام سے لگایا۔ اس وقت علامہ یعقوب علی کا نامی پریس بھی میرٹھ میں شہرت رکھتا تھا۔ منشی بشیر الدین نے اپنے نوجوان پوتے ریاض الدین کی صلاحیتوں کا اندازہ کرتے ہوئے انہیں خوش نویسی کے فن سے آراستہ کیا اور پھر اپنے پریس کے جملہ انتظامی امور کی تربیت دے کر پریس کا انتظام ان کے سپرد کر دیا۔

منشی ریاض الدین اعلیٰ درجہ کے خوش نویس تھے۔ عربی، فارسی اور اردو کی علمی کتب کی کتابت سے ان کی کمال دسترس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ انہوں نے قرآن مجید کی کئی تفاسیر، احادیث کے مجموعوں اور سیرتِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کتب کے علاوہ تفسیر ابن کثیر کی پانچ جلدوں پر مشتمل تفسیر قرآن حکیم کی کتابت کی سعادت حاصل کی۔ بلند پایہ دینی و علمی کتب کی کتابت ان کے علم میں اضافہ کا سبب بھی بنیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد منشی جی ہجرت کر کے پاکستان آ گئے اور کراچی میں مستقل سکونت اختیار کی اور کچھ ہی عرصہ بعد روزنامہ "جنگ" کراچی کے شعبۂ کتابت سے وابستہ ہو گئے اور ہیڈ کاتب کی حیثیت سے برسوں کام کیا۔ فرائض کی بجا آوری میں ذمہ داری اور لگن کے ساتھ نرم روی اور انکساری کے سبب اخباری صنعت سے وابستہ مختلف الخیال لوگ ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔

منشی ریاض الدین ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔ اوائل عمر سے ہی دینی اور فلاحی کاموں میں دلچسپی لیتے رہے۔ میرٹھ میں بھی سماجی خدمات انجام دیں۔ کراچی میں مزید سرگرمی سے حصہ لیا۔ انہوں نے جامع مسجد انچولی کے تعمیراتی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور پچیس سال تک اسی مسجد کی منتظمہ کمیٹی کے رکن

خازن اور پھر صدر کی ذمہ داریاں احسن طریقہ سے انجام دیں۔ ایجوکیشنل ایسوسی ایشن کی ابتداء سے ہی رہنمائی کرتے رہے۔ زکوٰۃ و عشر کمیٹی میں بھی فعال کردار ادا کیا۔ شیخان بنی کلال کے شجرہ جات کے ماہر بھی تھے۔

عمر کے آخری برسوں میں پے در پے صبر آزما سانحات سے دوچار ہوئے۔ ۱۹۸۳ء میں ان کے جواں سال بیٹے ضیاء الاسلام اور ۱۹۹۳ء میں اہلیہ رخصت ہوگئیں۔ ۱۹۹۸ء میں ان کے دوسرے بیٹے مظہر الاسلام اپنی اہلیہ اور کم سن بچی کے ہمراہ شارجہ سے عمرہ کے لئے سعودی عرب جاتے ہوئے حادثہ کا شکار ہوگئے۔ آخر میں ۲ جنوری ۲۰۰۱ء کو شمشی جی کے بڑے بیٹے ظفر الاسلام جہانِ فانی سے رخصت ہوئے۔ ان تمام صدمات پر راضی بہ رضا رہنے والی یہ بزرگ شخصیت ستاسی سال پورے کرنے کے بعد ۱۴ ستمبر ۲۰۰۱ء کو راہی ملک عدم ہوئی۔

صدائے ایجوکیشنل دسمبر ۲۰۰۱ء ص ۷۶-۷۷

بابائے اردو روڈ، کراچی

پروفیسر ڈاکٹر رضی الدین احمد

ممتاز ماہر تعلیم پروفیسر رضی الدین احمد کی ولادت میرٹھ شہر میں ۲۰ مئی ۱۹۲۳ء کو ایک علمی گھرانے میں ہوئی۔ آپ کے والد محمد ظہیر الدین مشرقی تہذیب و معاشرت کو عزیز رکھتے تھے۔ پروفیسر موصوف نے ایم۔ اے میں کامیابی کے بعد ۱۹۵۶ء میں پی۔ ایچ۔ ڈی کیا اور ۱۹۶۳ء میں ڈی لٹ۔ درس و تدریس میں زندگی گزاری۔ پروفیسر و صدر شعبہ اردو رہے۔ آپ کی کتب "منتخب اردو افسانے" : ۱۹۶۵ء اور "نقد ابوالکلام" : ۱۹۶۹ء زیورِ طباعت سے آراستہ ہو چکی ہیں جن پر اردو اکادمی یو۔ پی اور اسٹیٹ ایوارڈ آندھرا پردیش سے انعامات ملے ہیں۔ پاکستان کا سفر بھی کرچکے ہیں۔ تروچی میں مقیم ہیں۔

ماخذ : ہندوستان کے اردو مصنفین اور شعراء، ص ۲۲۳

میرزاہد حسین

میرزاہد حسین کی ذات خلوص' سچائی' ایثار' بیباکی اور پختگی فکر جیسے اعلیٰ انسانی اوصاف کا مرقع ہے۔ آپ کے بزرگ پاکستان بننے سے بہت پہلے میرٹھ سے آکر بھاولپور میں آباد ہو گئے تھے۔ میرزاہد حسین یہیں پیدا ہوئے۔ والد میر عابد حسین نے اپنے دوسرے عزیزوں کے برعکس ملازمت کے بجائے زمینداری میں دلچسپی لی اور اپنی محنت و ہمت سے زمیندارہ کو فروغ دیا۔ جناب عابد حسین کی صادق آباد میں سکنی اور زرعی کافی جائداد ہے۔ میرزاہد حسین یہیں رہائش رکھتے ہیں۔ شہاب دہلوی نے لکھا ہے کہ "کبھی سیاست اوڑھنا بچھونا تھی۔ آج کل باغبانی اور کتب بینی و کتب اندوزی کا مشغلہ ہے"۔ کئی مربعوں پر مشتمل باغ آپ کی آمدنی کا اصل ذریعہ ہے۔

میرزاہد حسین نے طالب علمی کے زمانے سے ہی سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ ریاست بھاولپور میں آپ نے مسلم لیگ کے لئے فعال کردار ادا کیا اور مسلم لیگ کو عوامی سطح پر مقبول بنانے میں پیش پیش رہے۔ آپ نے مسلم لیگ کی حمایت میں "نوائے وقت" میں مسلسل مضامین لکھے اور مسلمانوں کو باور کرایا کہ ان کے لئے مشترکہ پلیٹ فارم کتنا ضروری ہے۔ جمہوری مزاج رکھتے ہیں۔ منافقت کو پسند نہیں کرتے۔ مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناح بے انتہا محبت کرتی تھیں۔ اس کا مشاہدہ شہاب دہلوی نے خود کیا ہے۔ فرماتے ہیں "........ میں نے اس حقیقت کا مظاہرہ میرزاہد اور مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناح کے درمیان بارہا کیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ میرزاہد اور محترمہ فاطمہ جناح میں حقیقی ماں اور بیٹے کا رشتہ ہے۔ ماں ایسی جس میں سخت گیری کے ساتھ ساتھ ماں کی جھلک بھی ہو اور بیٹا ایسا جس میں لاڈ اور پیار کے ساتھ تابعداری اور اطاعت شعاری کا ہر قرینہ بھی موجود ہو۔" حمید نظامی مرحوم آپ کے دوست سے زیادہ ممدوح تھے۔ میرزاہد حسین نے حمید نظامی کی یاد میں ایک شاندار لائبریری صادق آباد میں قائم کی ہے جس کے لئے ایک عمارت بلدیہ صادق آباد نے تعمیر کی ہے۔ کتب کا جو ذخیرہ میرزاہد حسین کے پاس ہے وہ شاید بھاولپور ڈویژن میں کسی اور جگہ نہیں ہے۔

میر صاحب مشرقی طرزِ معاشرت کو پسند کرتے ہیں۔ حلقۂ احباب بہت وسیع ہے۔ ہر ایک سے کشادہ پیشانی سے ملتے ہیں۔ مہمانوں کی تواضع میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔ آپ نے اپنے گھر سے متصل باغ میں ایک کوٹھی بنائی ہے جس کے ایک حصے میں لائبریری اور آرٹ گیلری ہے جہاں تاریخی نوادرات اور مسلم آرٹ کے نمونے رکھے ہیں۔

میرزاہد حسین کی اولاد میں ایک بیٹا اور تین بیٹیاں ہیں۔ صاحبزادے محمد طارق اپنے والد کی طرح ہوشیلے اور جذباتی نوجوان ہیں۔ آپ کی اہلیہ نے اپنے رفیقِ سفر کا بھرپور ساتھ دیتے ہوئے تمام خاندانی و گھریلو معاملات سنبھالے ہوئے ہیں۔

ماخذ : مشاہیر بھاولپور ص ۱۸۷ تا ۱۸۸

زین العابدین انصاری

زین العابدین انصاری

زین العابدین انصاری بن حاجی عبدالغفور بن حاجی شیخ سمیع اللہ ان باہمت لوگوں میں شامل ہیں جنہوں نے اپنی مسلسل جدوجہد سے زندگی کے سفر کو روشن بنایا اور کسی سنگِ میل پر ٹھہر کر سانس نہیں لیا۔

آپ کی تاریخ ولادت دستاویزات میں ۲۵ دسمبر ۱۹۳۵ء میرٹھ ہے مگر صحیح تاریخ پیدائش ۲۵ دسمبر ۱۹۳۱ء ہے۔ آپ پانچ بھائی اور دو بہنیں ہیں۔ انصاری صاحب نے مروجہ ابتدائی تعلیم کے بعد گورنمنٹ ہائی اسکول میرٹھ سے میٹرک کیا۔ یہاں اس وقت ڈاکٹر جمیل جالبی، زیڈ۔ اے۔ نظامی، مظفر احمد ضیا اور مظہر یوسف صاحبان بھی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ۱۹۴۷ء کے آخر میں یعنی تقسیم ہند کے فوری بعد اپنے افراد خاندان کے ساتھ پاکستان ہجرت کی اور سلسلہ تعلیم جاری رکھتے ہوئے ۱۹۵۲ء میں پنجاب یونیورسٹی سے گریجویشن کیا۔

آپ نے عملی زندگی کا آغاز پاکستان آرمی سے کیا۔ تین سال بعد راولپنڈی میں اپنا کاروبار شروع کیا۔ پھر لاہور میں بھی یہ سلسلہ جاری رکھا اور ۱۹۶۸ء میں کراچی کو اپنا مستقر بنایا۔ آپ کی فرم کارگو ہوم (پرائیویٹ) لمیٹڈ ۱۹۹۰ء میں عالم وجود میں آئی جبکہ یونائیٹڈ انجنیئرز ۱۹۵۴ء میں قائم کر چکے تھے۔ زین العابدین انصاری صاحب کے کاروباری دفاتر ملک کے تمام بڑے اور اہم شہروں میں قائم ہیں۔

انصاری صاحب ایک عملی شخصیت کے حامل ہیں۔ مذہبی رجحان رکھتے ہیں اور یہ امر باعثِ حیرت ہے کہ بڑے کاروبار کے ہوتے ہوئے بھی سودی لین دین نہیں کرتے اور نہ ہی رشوت سے کوئی سروکار ہے۔ اپنے تمام دفاتر کے کاموں کا آغاز تلاوت کلام ربانی سے کراتے ہیں۔ گھر کے تمام افراد حج کی سعادت حاصل کر چکے ہیں اور خود آپ نے دنیا کے تقریباً تمام ممالک کی سیاحت کی ہے۔ کئی مرتبہ اپنی اہلیہ کے ساتھ حجازِ مقدس کے سفر کی سعادت بھی حاصل کر چکے ہیں۔

۱۹۵۹ء میں سید حسن صاحب کی صاحبزادی الماس سے آپ کی شادی ہوئی۔ الماس صاحبہ مولانا محمد علی

جوہر کے نواسیوں میں سے ہیں۔ مشرقی تہذیب کی پروردہ اور نہایت دیندار ہیں۔ اپنی قیام گاہ پر ہر ماہ خواتین کے مذہبی اجتماعات کا اہتمام کرتی ہیں۔ ڈاکٹر زاہد انصاری، ماجد انصاری، راشد انصاری، ریحان انصاری اور عرفان انصاری کے علاوہ ایک صاحبزادی صدف اشرف علی آپ کے گلشنِ حیات کے خوشنما پھول ہیں۔ یہ سب بچے اعلیٰ تعلیم سے آراستہ ہیں۔

انصاری صاحب کی شخصیت میں مشرق و مغرب کے امتزاج سے اندازہ ہوتا ہے کہ نئی تہذیب سے آشنا ہوتے ہوئے بھی اپنی روایات کو عزیز رکھتے ہیں۔ مہمان نوازی مزاج کا حصہ ہے۔ تحائف دینے میں بھی پیش پیش رہتے ہیں۔ اپنے بچوں سے آزادانہ تبادلہ خیال کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ بچوں میں خود اعتمادی کا جوہر موجود ہے۔

زین العابدین انصاری صاحب فلاحی و سماجی اداروں کی سرپرستی بھی کرتے ہیں۔ تنظیم احباب میرٹھ کے قیام کے بعد سے اب تک خازن کی ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے ہیں۔ انجمن شیخ تاجران راولپنڈی کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر ہیں۔ آپ کا قیام پی۔ ای۔ سی۔ ایچ۔ ایس، کراچی میں ہے۔

مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھیؒ

میرٹھ کے قاضی شہر مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی دینی اور علمی حلقوں میں محتاجِ تعارف نہیں ہیں۔ آپ نے عمرِ عزیز اسلامی تعلیمات کے فروغ کے لئے وقف رکھی۔ مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے پیش کوشاں رہے۔ آپ سادہ مزاج رکھتے تھے۔ اچھے خطیب بھی تھے اور اپنی طویل خدمات کی وجہ سے نہایت محترم تھے۔

قاضی صاحب کی ولادت ۱۹۱۰ میں میرٹھ میں ہوئی اور اکیاسی سال کی عمر میں ۳۱ مارچ ۱۹۹۱ء کو میرٹھ میں وفات پائی۔ آپ کے والد مولانا قاضی محمد بشیرالدین صدیقی بھی ممتاز عالم تھے۔

آپ فاضل عربی (الہ آباد) اور فاضل دارالعلوم (دیوبند) تھے۔ کئی زبانوں پر دسترس رکھتے تھے۔ آپ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں استاذ تفسیر بھی رہے ہیں۔ تصنیف و تالیف اور ماہنامہ "الحرم" کی ادارت قاضی صاحب کی مصروفیات میں اولیت رکھتی تھی۔ آپ کی مرتبہ "قاموس القرآن" اور "بیان اللسان" نے بہت مقبولیت اور شہرت حاصل کی۔ ان کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ شیخ الاسلام مولانا قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے "بیان اللسان" پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر کیا ہے "مبارکباد کے مستحق ہیں ہمارے محترم دوست جناب مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی' قاضی میرٹھ جنہوں نے خدمتِ لسان اور بیان و توضیح لغت کے سلسلے میں اس مقدس اور ہمہ گیر زبان کا انتخاب فرمایا جو محض لغت اور زبان ہی نہیں بلکہ ملکہ الخ ہے۔۔۔۔۔۔۔ عربی لغت کی ترتیب و تہذیب کے سلسلے میں جن خصوصیات کی ممدوح نے اپنی اس کتاب بیان اللسان کے مقدمہ میں فہرست دی ہے اور جن خاص ذہنی رجحانات کے ساتھ آپ نے عربی لغت کی جدید کتابوں سے نیا طرز اخذ کرکے "بیان اللسان" کو اس پر مرتب کیا ہے' اس کے پیشِ نظر مجھے یہ عرض کرنے میں تامل نہیں ہے کہ انہوں نے عربی ادیبوں' طلبہ مدارس اور اساتذہ علوم عربیت پر احسان فرمایا ہے"۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے "قاموس القرآن" کی افادیت پر گفتگو کرتے ہوئے اپنی تحریر کے آخر میں لکھا ہے "علمی قاموس میں یہ "قاموس القرآن" میرے نزدیک بڑی اہمیت رکھتی ہے"۔

قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی صاحب کی تصانیف درج ذیل ہیں:

۱۔ مفتاح النحو (نحو عربی پر ایک رسالہ) : ۱۹۳۰ء
۲۔ انتخابِ صحاح ستہ (احادیث) : ۱۹۳۵ء
۳۔ موجِ نیل (ترجمہ مضامین منفلوطی مصری) : ۱۹۳۰ء
۴۔ نبی عربی (مختصر سیرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم) : ۱۹۳۰ء
۵۔ خلافتِ راشدہ (تاریخ اسلام) : ۱۹۳۲ء
۶۔ خلافت بنی امیہ (تاریخ اسلام) : ۱۹۳۳ء
۷۔ کلام عربی (حصہ اول و دوم) : ۱۹۳۳ء
۸۔ بیان اللسان (عربی اردو ڈکشنری) : ۱۳۶۸ھ
۹۔ قاموس القرآن (الفاظ قرآنی کی مختصر انسائیکلوپیڈیا) : ۱۳۷۳ھ
۱۰۔ سیرتِ طیبہ (رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت) : ۱۳۸۷ھ
۱۱۔ اخلاقِ نبوی (اخلاقی حدیثیں مع تشریح ضروری) : ۱۳۹۷ھ
۱۲۔ شہیدِ کربلا (تاریخ و مذہب کی روشنی میں) : ۱۹۸۶ء

آپ نے سعودی عرب اور پاکستان کے دورے کئے۔ آپ کی علمی خدمات کا اعتراف سرکاری سطح پر بھی کیا گیا اور ۱۹۸۰ء میں سند اعزازی برائے ممتاز فضلاء عربی، صدر جمہوریہ ہند کی طرف سے پیش کی گئی۔ قاضی صاحب شعروادب سے خصوصی دلچسپی رکھتے تھے۔ نمونہ کلام دستیاب نہ ہوسکا۔

ماخذ : قاموس القرآن، بیان اللسان، ہندوستان کے اردو مصنفین اور شعراء

سرفراز حسین عابدی

سرفراز حسین عابدی

سرفراز حسین عابدی بن سید عبدالغفور بن سید عنایت علی شاہ ایک خوش حال تعلقداری گھرانے کے چشم و چراغ ہیں۔ سرفراز عابدی صاحب کے پردادا ورید علی شاہ کا اپنا ایک ذاتی لشکر بھی تھا۔ انہوں نے انچولی کی ترقی میں سرگرم حصہ لیا۔ سید عبدالغفور مرحوم کی اولاد میں چار بیٹے اور ایک بیٹی ہوئے۔

سرفراز حسین عابدی کی ولادت ۱۵ نومبر ۱۹۲۸ء کو گل مراد علی خاں انچولی ضلع میرٹھ میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم و تربیت کے بعد گورنمنٹ ہائی اسکول میرٹھ سے ۱۹۴۷ء میں میٹرک اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ۱۹۵۱ء میں بی کام کرنے کے بعد اسی یونیورسٹی سے ایل ایل بی اور معاشیات میں ایم اے کیا۔ میرٹھ میں قیام کے دوران شہر کے معروف قانون داں عزیز احمد نظامی صاحب کی صحبت حاصل رہی اور ان سے فیض حاصل کرنے کے مواقع میسر رہے۔

عابدی صاحب ۱۹۵۲ء میں ترکِ سکونت کرکے پاکستان آئے۔ اور اگلے ہی سال حبیب بینک میں ملازم ہوگئے۔ پھر مستقل ہوکر پاکستان انڈسٹریل ڈویلپمنٹ کارپوریشن سے تعلق قائم کیا۔ چند سال بعد کارپوریشن سے علیحدگی اختیار کرکے ۱۹۶۱-۶۲ء میں حبیب بینک سے دوبارہ وابستہ ہوئے۔ یہاں خدمات کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے سینئر ایگزیکٹیو وائس پریزیڈنٹ کے اعلیٰ عہدے سے ۱۹۹۳ء میں ریٹائر ہوئے۔

پاکستان آنے کے ایک سال بعد اپنے عزیزوں سے ملنے انچولی اور میرٹھ گئے۔ وہاں خان بہادر تصدق حسین صاحب کی صاحبزادی سائرہ خاتون سے ۳ جولائی ۱۹۵۵ء کو ہاپوڑ میں شادی ہوئی۔ آپ کی آنکھوں کی روشنی تین لڑکے اور تین لڑکیاں ہیں۔ جاوید سرفراز آسٹن میں چیف فائننس آفیسر، حیدر سرفراز عابدی موبی لنک میں کنٹرولر آف امپورٹس اور معظم سرفراز عابدی کوٹیمیا کارپوریشن میں ڈائریکٹر ہیں۔ بیٹیوں میں سیما نذر حسین رضوی، بشریٰ واصف اور ساجدہ ریحان ہیں۔ عابدی صاحب سب بچوں کی ذمہ داریوں سے فارغ ہوچکے ہیں۔

سرفراز عابدی صاحب کے مشاغلِ حیات میں سیاست، خدمت اور مطالعہ شامل رہے۔ دورانِ تعلیم اگرچہ

آپ نے باقاعدہ اردو نہیں پڑھی مگر علم و ادب کا ذوق رکھتے ہیں۔ پوری دنیا کی سیاحت کر چکے ہیں۔ چار مرتبہ حج کی سعادت بھی نصیب ہوئی۔ عمرے بھی بہت کئے ہیں۔ آپ کی اہلیہ سائرہ بھی پابند صوم و صلوٰۃ ہیں۔ سعودی عرب آمد و رفت ان کا معمول بن چکا ہے۔ عابدی صاحب ۱۹۸۹ء سے تاحال انچولی ایسوسی ایشن کے صدر ہیں۔ علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کراچی، سرسید میموریل اسلام اور تہذیب الاخلاق لاہور کے لائف ممبر ہیں۔ دوران تعلیم علی گڑھ رائیڈنگ اسکول کے کپتان، کو آف آنر سید ہال علی گڑھ کے چیئرمین اور مسلم یونیورسٹی سوسائٹی کے نائب صدر کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دے چکے ہیں۔ نیک نفس، مہمان نواز اور انسانی خدمت کے جذبے سے سرشار ہیں۔ آپ کا قیام کراچی میں ہے۔

فرائض کی ادائیگی کے دوران چند سال مسقط میں بھی رہے۔ وہاں وائس چیئرمین بورڈ آف گورنرز پاکستان کالج چار سال رہے۔ مسقط میں ہی ایک اور تنظیم قائم کی۔

پروفیسر سعید احمد رفیق

پروفیسر سعید احمد رفیق

ممتاز فلسفی، ماہرِ تعلیم اور متعدد کتب کے مصنف پروفیسر سعید احمد رفیق خلف رفیق احمد صاحب کی ولادت ۲۰ فروری ۱۹۱۸ء کو باغپت ضلع میرٹھ میں ہوئی۔ ۱۹۳۵ء میں دہلی بورڈ سے میٹرک، ۱۹۳۷ء میں عربک کالج دہلی سے انٹر اور ۱۹۳۹ء میں اسی کالج سے تعلیم جاری رکھتے ہوئے بی اے کیا۔ عربک کالج دہلی میں معین احسن جذبی آپ سے دو سال سینئر، سردار علی جعفری ایک سال سینئر، ڈاکٹر مسعود حسین ہم جماعت اور اختر الایمان ایک سال جونیئر تھے۔ سعید احمد رفیق صاحب نے ۱۹۴۱ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے فلسفہ میں ایم۔اے کرنے کے بعد ۱۹۴۳ء میں بی۔ٹی کے امتحان میں کامیابی حاصل کر کے اپنی تعلیم مکمل کی۔

آپ نے ۱۹۴۵ء میں اسلامیہ کالج جالندھر میں فلسفہ کے استاد کی حیثیت سے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا۔ یہاں دو سال پڑھایا۔ پھر تقسیم ہند کے بعد ۱۹۴۹ء میں گورنمنٹ کالج کوئٹہ میں فلسفہ کے استاد ہوئے۔ ۱۹۵۵ء پروفیسر آف فلاسفی ہوئے۔ ۱۹۶۳ء سے ۱۹۷۱ء تک ژوب، خضدار اور نوشہرہ کے گورنمنٹ کالجز کے پرنسپل رہے۔ ۱۹۷۱ء سے ۱۹۷۶ء تک گورنمنٹ سائنس کالج، کوئٹہ اور گورنمنٹ کالج سریاب روڈ، کوئٹہ کے پرنسپل رہے۔ اس دوران ۱۹۷۲ء اور ۱۹۷۳ء میں بلوچستان یونیورسٹی کوئٹہ نے آپ کی خدمات حاصل کر لیں تھیں۔ یونیورسٹی میں آپ شعبہ تعلیم کے چیئرمین رہے۔ ۲۰ فروری ۱۹۷۶ء کو ریٹائر ہوئے۔ اس وقت آپ گورنمنٹ کالج کوئٹہ کے پرنسپل تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد ملازمت میں دو سال کی توسیع ہوئی۔ سبجیکٹ اسپیشلسٹ کی حیثیت سے ٹیکسٹ بک بورڈ کوئٹہ میں تقرر ہوا۔ یہ مدت پوری ہونے کے بعد ۱۹۷۸ء میں پھر توسیع ہوئی اور یہ سلسلہ ۱۹۸۶ء تک قائم رہا۔ ۱۹۸۷ء میں بلوچستان یونیورسٹی، کوئٹہ کے شعبہ فلسفہ کے چیئرمین مقرر ہوئے اور دو سال تک اس اہم منصب پر فرائض انجام دیئے۔ اس طرح بیالیس سال تک پروفیسر سعید احمد رفیق شعبہ تعلیم سے وابستہ رہے اور تشنگانِ علم کو

سیراب کرتے رہے۔

زمانہ طالب علمی میں ہی آپ نے مضامین لکھنا شروع کر دیے تھے۔ ۱۹۳۳ء میں ٹریننگ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں دورانِ تعلیم کالج میگزین میں آپ کے بہت سے مضامین شائع ہوئے۔

۳۴-۱۹۳۳ء میں ریاست 'دہلی اور شاہجہاں دہلی میں آپ کے دو چار افسانے چھپے۔ آپ نے وہ افسانے پروفیسر چوہدری عبدالغفور کو دکھائے۔ انہوں نے فرمایا کہ افسانے تو ٹھیک ہیں لیکن تمہاری زبان افسانوں کی نہیں ہے بلکہ مضامین کی ہے۔ ان کی اس رائے کی روشنی میں آپ نے مضامین لکھنا شروع کئے جو قیامِ پاکستان سے قبل جامعہ دہلی اور ہمایوں لاہور میں شائع ہوئے ان رسائل میں مضامین چھپنے سے ذوقِ تحریر فزوں تر ہوا اور پھر مضمون نگاری سعید احمد رفیق صاحب کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ آپ کے اردو اور انگریزی مضامین اور مقالات جن کی تعداد پچاس ساٹھ کے قریب ہے 'جامعہ دہلی' 'ہمایوں لاہور' 'عالمگیر لاہور' 'ادبِ لطیف لاہور' 'نقوش لاہور' 'افکار کراچی' 'امروز لاہور' 'لیل و نہار لاہور' 'فلسفیات لاہور' 'اقبال لاہور' 'سہ ماہی: بلوچستان یونیورسٹی کوئٹہ' 'قلم قبیلہ کوئٹہ وغیرہ میں شائع ہوئے۔

پروفیسر سعید احمد رفیق ممتاز مصنف ہیں۔ آپ کی کئی کتب شائع ہو چکی ہیں جن کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:

۱۔ مسلمانوں کا نظامِ تعلیم: ۱۹۵۶ء (تین ایڈیشن)
۲۔ اقبال کا نظریۂ اخلاق: ۱۹۶۲ء (تین ایڈیشن)
۳۔ تاریخِ جمالیات: ۱۹۷۲ء (دو ایڈیشن)
۴۔ حقیقتِ حسن: ۱۹۷۹ء
۵۔ فن اور مطالعہ فن: ۱۹۸۸ء
۶۔ انسانی قدریں: ۱۹۹۹ء
۷۔ بہشتِ حوا: ۲۰۰۰ء

مسودات:

۱۔ مسئلہ خیر و شر
۲۔ قدیم ہندوستان کا نظامِ تعلیم

تصنیف و تالیف کے ساتھ سعید احمد رفیق صاحب نے تراجم کے ذریعہ بھی اردو ادب کے دامن کو وسیع کیا ہے۔ تراجم حسبِ ذیل ہیں:

۱۔ بلوچستان تاریخ کے آئینہ میں: جسٹس خدا بخش مری: ۱۹۸۰ء
۲۔ مشرقی افغانستان کے خانہ بدوش قبائل: کیپٹن جے۔ اے۔ رابسن: ۱۹۸۰ء
۳۔ وسط ایشیا میں روس: جوزف لیو پولکی: ۱۹۸۶ء

۴۔ آزادیٔ فکر و خیال: جان بیگنل بری: ۱۹۸۸ء
(اس کتاب میں بہت سے مفصل حواشی بھی آپ نے تحریر کئے ہیں)
۵۔ گڑیا گھر (ڈرامہ): ہنرک ابسن: ۱۹۶۸ء
۶۔ خاتونِ بحر (ڈرامہ): ہنرک ابسن: ۱۹۵۹ء

ان کے علاوہ ہنرک ابسن کے پانچ دیگر ڈراموں کے تراجم مسودات کی شکل میں موجود ہیں۔

محترم سعید احمد رفیق نے ٹیکسٹ بک بورڈ میں مصروفیت کے دوران اردو 'انگریزی' معاشرتی علوم اور تاریخ کی کورس کی اکثر کتابوں کے لئے بہت سے اسباق لکھے ہیں۔ مختلف کتابوں پر نظر ثانی کی ہے۔ کئی کتب کو ایڈٹ بھی کیا۔ ہے یہ سب کام تعلیمی اور تدریسی نوعیت کا ہے۔

پروفیسر سعید احمد رفیق نے علم و ادب کے فروغ کے لئے بھی مسلسل کام کیا ہے۔ پاکستان فلاسفیکل کانگریس: ۷۳-۱۹۷۲ء کے سیکشن پریذیڈنٹ ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ پاکستان رائٹرز گلڈ بلوچستان کے سیکرٹری اور مجلس قلم قبیلہ کوئٹہ کے سات سال جنرل سیکرٹری رہے۔ گذشتہ دس سال سے سہ ماہی "قلم قبیلہ" کوئٹہ کے مدیر اعلیٰ ہیں۔ پاکستان فلاسفیکل کانگریس کے سالانہ اجلاس ۱۹۸۷ء کے منتظم رہ چکے ہیں۔ اسی سال بلوچستان یونیورسٹی کوئٹہ میں شعبہ فلسفہ قائم ہوا۔ محترم سعید احمد رفیق اس شعبہ کے بانی ہیں اور پہلا چیئرمین ہونے کا اعزاز آپ کو حاصل ہے۔

پروفیسر موصوف نے ادب برائے زندگی۔ جمالیات پر بہت سے مضامین کے علاوہ اس موضوع پر تین کتابیں لکھی ہیں۔ لیکن آپ ادب برائے زندگی کے قائل ہیں۔ اس سلسلے میں فرماتے ہیں کہ جمالیاتی اصول خود زندگی اور معاشرے سے متعین ہوتے ہیں۔ صرف ادب ہی نہیں بلکہ تمام فنونِ لطیفہ معاشرے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ فنون ہی معاشرے کو ترقی کی راہ پر گامزن کرتے ہیں۔ اسے آگے بڑھاتے ہیں اور اسے اعلیٰ اقدار سے روشناس کراتے ہیں اور معاشرے کی تطہیر، تعمیر اور ارتقاء میں معاون و مددگار ہوتے ہیں۔ فنونِ لطیفہ کے بغیر معاشرہ انسانی معاشرہ نہیں بلکہ دو پائے درندوں کا گہوارہ بن کر رہ جائے۔ مزید فرماتے ہیں کہ فنونِ لطیفہ کی طرح زندگی بھی اعلیٰ ترین اقدار میں سے ایک ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے بہت ہی زیادہ متعلق ہیں۔ فقط زندگی کو عناصر میں ظہورِ ترتیب نہ سمجھئے بلکہ اس لفظ کو اس کے صحیح مفہوم میں لیجئے تو ہم دیکھتے ہیں کہ زندگی انفرادی ہو یا اجتماعی 'ہر دو صورتوں میں وہ ادب اور فنونِ لطیفہ کی مرہونِ منت ہے کہ ان کے بغیر زندگی 'زندگی نہیں رہتی بلکہ صرف سانس کی آمد و رفت تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے۔ فنونِ لطیفہ کا مقصد زندگی کو آگے بڑھانا 'ترقی دینا' ترقی کی نئی نئی منازل سے روشناس کرانا اور اسے بہتر سے بہتر اور اعلیٰ سے اعلیٰ تر بنانا ہے ادب اور فنونِ لطیفہ کا فرض شخصی زندگی کو لطیف و نفیس بنانا ہے اس میں رنگ و بو پیدا کرنا 'نفاست و نزاکت سے روشناس کرانا' اسے قابلِ ستائش بنانا اور خود ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے اس کی رہنمائی اور مدد کرنا ہے۔

سعید احمد رفیق صاحب محبت پر گہرا یقین رکھتے ہیں۔ محبت آپ کی زندگی کا جوہر ہے۔ آپ محبت کو دنیا کی اعلیٰ ترین قدر سمجھتے ہیں۔ اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں کہ محبت سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں، محبت مجھے بھی نصیب ہوئی لیکن ماں کی نہیں کہ میرے بچپن میں ہی ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ ویسے زندگی کے ہر مرحلے پر وہ یاد آتی رہتی ہیں۔ زندگی میں ایک خاتون آئیں بعد میں خوش قسمتی سے ان سے رشتہ ازدواج سے منسلک ہو گیا۔ تینتالیس سال چھ ماہ اور سولہ دن ساتھ رہے اور پھر وہ رخصت ہو گئیں اور اب چودہ سال سے ان کی یاد میں دن گزر رہے ہیں۔ نہ معلوم یہ قیدِ تنہائی کب ختم ہوگی۔ ہاں بچوں سے اور بچوں کے بچوں سے بھی محبت ہے اور بہت محبت ہے۔ لیکن ان سب سے زیادہ، بہت زیادہ اور بہت ہی زیادہ ایک اور چیز سے محبت ہے اور وہ ہے پاکستان 'پاکستان' پاکستان۔ اس سے زیادہ نہ کسی سے محبت تھی نہ ہے نہ ہوگی:

تری ایک مشتِ خاک کے بدلے   لوں نہ ہرگز اگر بہشت ملے (حالی)

پروفیسر سعید احمد رفیق کے لاتعداد شاگرد زندگی کے مختلف شعبوں میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ کوئٹہ میں مقیم ہیں۔

سید احمد

سید احمد صاحب میرٹھ کی ان شخصیات میں قابلِ ذکر ہیں جن کی زندگی محنت، دیانت اور ادائیگیِ فرض کا نمونہ رہی ہے۔ انہوں نے پاکستان کے اعلیٰ ترین عہدوں پر کام کیا اور نیک نامی کے ساتھ گوشہ نشین ہو گئے۔

سید احمد صاحب کے جد سید محمد امین نامور مجاہد محمود غزنوی کے ساتھ اس وقت ہندوستان آئے تھے جب محمود غزنوی نے پانچویں مرتبہ حملہ کیا تھا۔ سید محمد امین فوج میں کمانڈر تھے۔ مغلوں کے دور میں ان کا خاندان اچھی حیثیت میں رہا۔ اس خاندان کے افراد نے ملکی امور میں دلچسپی لی مگر انہوں نے اپنے خاندانی پیشے زمینداری کو بھی عزیز رکھا۔

سید احمد صاحب کے والد سید محمد افضل بن سید محمد عمر اسسٹنٹ ڈپٹی کلکٹر رہے۔ پھر ریاست ٹونک میں انہوں نے سیکریٹری اسٹیٹ کونسل کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ اس ریاست میں وہ واحد افسر تھے جو انگریزی زبان پر کامل عبور رکھتے تھے۔ سید محمد افضل کے چار بیٹے سید محمد یامین، سید احمد، سید اقبال محمود اور سید شمس العارفین اور ایک بیٹی تھیں۔ سید محمد یامین نے لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم۔ اے فرسٹ کلاس پوزیشن میں کیا اور پھر آئی۔ سی۔ ایس کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ آکسفورڈ یونیورسٹی نے انہیں لیکچرر شپ کی پیش کش کی جو انہوں نے قبول کر لی اور برطانیہ چلے گئے۔ دوسرے بھائی سید اقبال محمود کسٹمز سروس میں رہے۔ تیسرے بھائی سید شمس العارفین نے اکنامکس میں ایم۔ کام الہ آباد یونیورسٹی سے کیا۔ انہوں نے بھی فرسٹ کلاس پوزیشن حاصل کی تھی۔

سید احمد صاحب کی ولادت ۲۸ جون ۱۹۱۹ء کو آبائی مکان واقع محلہ شاہ پیر میرٹھ میں ہوئی۔ آپ کے والد کا تبادلہ ہوتا رہتا تھا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد سید صاحب نے ہانسی سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ انٹر اور ۱۹۳۸ء میں بی۔ ایس۔ سی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے کرنے کے بعد سلسلہ تعلیم جاری رکھتے ہوئے ۱۹۴۰ء میں الہ آباد یونیورسٹی کیمسٹری میں ایم۔ ایس۔ سی کے امتحان میں فرسٹ کلاس آئے۔ اس طرح سید محمد افضل صاحب کی اولاد میں تین بیٹوں کو ماسٹرز کے امتحانات میں فرسٹ کلاس کی حیثیت سے کامیابی حاصل کرنے کا اعزاز و امتیاز حاصل ہے۔

سید احمد صاحب نے اپنی عملی زندگی کا آغاز محکمہ کسٹمز سے کیا۔ بنگال میں اسسٹنٹ کلکٹر کسٹمز رہے۔ اس طرح قیامِ پاکستان سے پہلے ہی آپ پاکستان میں تھے۔ ۱۹۵۳ء میں سید صاحب کا تبادلہ اسی عہدے پر حیدرآباد میں ہوا۔ ۱۹۵۵ء میں وزارتِ مالیات میں انڈر سیکریٹری کی حیثیت سے فرائض سنبھالے۔ ۱۹۶۰ء میں ڈپٹی کلکٹر کسٹمز کراچی مقرر ہوئے۔ ۱۹۶۹ء میں کلکٹر کسٹمز کے عہدے پر حیدرآباد اور ڈھاکہ میں فرائض انجام دیے اور پھر کراچی میں یہ عہدہ سنبھالا۔ ۱۹۷۲ء میں آپ کو سنٹرل بورڈ آف ریونیو کا ممبر مقرر کیا گیا۔ تین سال تک یہ ذمہ داریاں ادا کرتے رہے اور پھر ناگزیر حالات سے دل برداشتہ ہو کر ۱۹۷۵ء میں مستعفی ہو گئے جبکہ سات سال کی مدت

ملازمت باقی تھی۔ موصوف چیئرمین ہارٹیکس بورڈ بھی رہے ہیں۔

سید احمد صاحب انتہائی بااصول شخص ہیں۔ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے احکامات کو پیش نظر رکھتے ہوئے فرائض انجام دیئے۔ کسی لالچ، خوف یا مصلحت کو کبھی خاطر میں نہ لائے۔ یہی وجہ ہے کہ اتنے اہم عہدوں پر رہتے ہوئے بھی آپ کی زندگی دیانت، خدمت، قناعت اور سادگی کا نمونہ رہی۔ آج بھی جب وہ ماضی کے واقعات کو تازہ کرتے ہیں تو کوئی دھبہ آپ کے شفاف دامن پر نظر نہیں آتا۔ گفتگو بالکل صاف اور کھرے لہجے میں کرتے ہیں۔ ٹینس کے اچھے کھلاڑی ہیں۔ مشرقی پاکستان میں قیام کے زمانے میں ۱۹۶۷ء میں ڈبلس کے چیمپئن رہے اور پھر اسلام آباد میں بھی اعزاز کا دفاع کیا۔

سید احمد صاحب کے قریب ترین دوستوں میں صدر جنرل محمد ایوب خاں، سمیع اللہ خان، الطاف گوہر، ساجد علی اور آفتاب احمد جیسی شخصیات شامل ہیں۔ آپ نے یورپ اور مشرق وسطیٰ کے متعدد ممالک کا سرکاری امور کی انجام دہی کے سلسلے میں متعدد بار دورہ کیا۔ کئی بار اقوام متحدہ کے اداروں میں اپنے ملک کی نمائندگی کا اعزاز بھی حاصل کر چکے ہیں۔ اسلامی ارکان کے پابند ہیں۔ کراچی میں مقیم ہیں۔

ڈاکٹر شاہد حسن صدیقی

ڈاکٹر شاہد حسن صدیقی

ڈاکٹر شاہد حسن صدیقی عالمی شہرت کے حامل بینکار اور ماہر معاشیات ہیں۔ ان کے علم اور خدمات سے متعلقہ شعبہ کے ماہرین بخوبی واقف ہیں۔ موصوف کے بارے میں ایک ممتاز ہفت روزہ کے انٹرویو نگار نے لکھا ہے "ڈاکٹر شاہد حسن صدیقی پاکستان کا وہ موتی ہیں جو سمندر میں جا کر چھپ گیا۔ اس موتی کی آب و تاب جب خود اس پر منکشف ہونے لگی تو اسے وطن کا خیال آیا۔ سو اب وہ کئی برسوں سے وطن کی خاک کے ذروں کو رگڑ رگڑ کر چمکانے کی سعی کر رہے ہیں۔" لیفٹیننٹ جنرل (ر) سردار فاروق احمد خان لودھی نے ایک اہم سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے کہا "معیشت کے جس معاملے میں ڈاکٹر شاہد صدیقی یہ کہیں کہ مجھے اس کا پتہ نہیں ہے تو یقیناً وہ بات سب کچھ ہو سکتی ہے مگر معیشت نہیں۔"

ڈاکٹر شاہد حسن صدیقی ۲؍جولائی ۱۹۳۳ء کو انچولی ضلع میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ اپنے خاندان کے ہمراہ ۱۹۵۳ء میں پاکستان ہجرت کی اور کراچی میں سکونت اختیار کی۔ یہاں ان کے والد ماجد شمس الحسن صاحب (م ۱۹۷۸ء) محکمہ جیل خانہ جات سے وابستہ ہوئے اور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل کراچی رہے۔ ڈاکٹر شاہد حسن صدیقی صاحب کے دوسرے بھائی ممتاز سائنس داں ڈاکٹر مصباح الحسن صدیقی، ضیاء الحسن صدیقی، پروفیسر مشاہد حسن صدیقی، محمود ریاض صدیقی، خالد حسن صدیقی، عارف منصور، توصیف الاسلام اور ڈاکٹر عاصم ظفر ہیں۔ ڈاکٹر مصباح الحسن نے سائنسی شعبہ میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔ انہوں نے امریکہ سے ڈاکٹریٹ کیا تھا صرف چھیالیس سال کی عمر میں ان کا انتقال کینیڈا میں ہوا۔ محمود ریاض صدیقی اور عارف منصور کا تعلق شعبہ مالیات سے ہے۔ ضیاء الحسن صدیقی تاجر ہیں۔ پروفیسر مشاہد حسن صدیقی اور خالد حسن صدیقی شعبہ تعلیم سے متعلق ہیں۔ توصیف الاسلام سرکاری ملازمت میں ہیں۔ ڈاکٹر عاصم ظفر ایم آر سی پی ہیں اور برطانیہ میں مقیم ہیں اور وہاں کے ایک ہسپتال میں کنسلٹنٹ ہیں۔ دو بہنیں پروفیسر نسیم فاطمہ اور ڈاکٹر شمیلہ سلیم ہیں۔

ڈاکٹر شاہد حسن صدیقی نے ۱۹۶۳ء میں کراچی یونیورسٹی سے بیچلر آف کامرس اور اس کے بعد قانون کی

اسناد حاصل کیں۔ پھر انسٹی ٹیوٹ آف بینکرز پاکستان سے بینکنگ ڈپلومہ کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ زرعی ترقیاتی بینک آف پاکستان نے سونے کا تمغہ پیش کیا۔ اس کے بعد موصوف نے امریکہ سے پبلک ایڈمنسٹریشن میں پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

عملی زندگی میں ڈاکٹر شاہد حسن صدیقی نے اپنی خداداد صلاحیتوں سے شہرت و مقبولیت حاصل کی۔ آپ نے پاکستان، یورپ اور امریکہ میں تیس سال تک بینکوں میں اعلیٰ انتظامی عہدوں پر کام کیا۔ ۱۹۷۹ء میں پاکستان سے سود کے خاتمہ کے لیے پاکستان بینکنگ کونسل کے ورکنگ گروپ کے ممبر کی حیثیت سے سود کے خاتمہ کے ضمن میں اہم کردار ادا کیا۔ ۱۹۸۲ء میں حکومتی شعبہ کے بینکوں میں سب سے کم عمر ایگزیکٹو وائس پریذیڈنٹ رہے۔ آپ اسپورٹس سے بھی گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ الائیڈ بینک کے اسپورٹس ڈویژن کے سربراہ کی حیثیت سے کھیلوں میں نظم و ضبط قائم کیا۔ آپ کی دلچسپی کی وجہ سے ہی ۱۹۸۰ء میں الائیڈ بینک کی کرکٹ ٹیم پاکستان کی صفِ اوّل کی ٹیموں میں شمار کی گئی۔

ڈاکٹر شاہد حسن صدیقی نہایت ذہین اور دوراندیش شخص ہیں۔ ذاتی زندگی میں بھی اوقات کار کے پابند ہیں۔ نہایت ستھرا علمی ذوق رکھتے ہیں۔ مہمان نوازی، خلوص و محبت، شائستگی اور گفتگو میں نرمی، سلاست اور روانی ڈاکٹر صاحب کی وہ خصوصیات ہیں جن سے ملنے والا متاثر ہوتا ہے۔ مبالغہ سے گریز کرتے ہیں۔ دلائل کے ساتھ اپنا موقف پیش کرتے ہیں جس سے انکار ممکن نہیں ہوتا۔ معاشی و اقتصادی شعبوں میں تجزیہ کرنے کے معاملے میں ڈاکٹر شاہد حسن صدیقی کو شہرت اور قدر و منزلت حاصل ہے۔ مالیاتی علم پر آپ کا مطالعہ وسیع ہے۔ موصوف نے سینٹ آف پاکستان کی بینکنگ اینڈ فنانس کمیٹی کے چیئرمین کی خصوصی دعوت پر پاکستان میں بینکنگ کی صورت حال پر خصوصی تجزیہ اور سفارشات پیش کیں جن کو سینٹ کمیٹی نے سراہا اور اپنی سفارشات کا حصہ بنایا۔ سپریم کورٹ آف پاکستان کی شریعت اپیلیٹ بنچ میں سود کے مسئلہ پر حکومت کی اپیل کے ضمن میں عدالت کی معاونت کی اور پاکستانی معیشت سے سود کے خاتمے کے مختلف پہلوؤں پر تجزیہ پیش کیا اور اس ضمن میں بھی سفارشات پیش کیں جن کا ذکر عدالت عظمٰی کے فیصلہ میں جابجا ملتا ہے۔

ڈاکٹر شاہد حسن صدیقی کا انہماک اور اپنی قوم کی خیرخواہی و خوش حالی کا جذبہ نہایت قابل قدر ہے۔ آپ نے ایک طرف سرکاری و نیم سرکاری اور ایک بڑے انٹرنیشنل تجارتی بینک میں خدمات انجام دیں اور دوسری طرف مالیاتی شعبہ کی اہمیت اور اس کے خال و خد کو سنوارنے کے لیے تصنیفی سلسلہ شروع کیا۔ معیشت، فنانس، ترقی پذیر ممالک کی معیشت میں عالمی مالیاتی اداروں کے کردار اور اسلامی نظام معیشت و نظام بینکاری پر آپ کے تقریباً چار سو مضامین پاکستان، سعودی عرب، یورپ اور امریکہ کے ممتاز اخبارات و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ نیز آپ کے انٹرویوز اور خیالات موقر عالمی نشریاتی اداروں ریڈیو پاکستان، پاکستان ٹیلی ویژن، بی بی سی، وائس آف جرمنی، آسٹریلین ٹیلی ویژن نیٹ ورک اور ایشین بزنس نیوز میں نشر ہوئے ہیں۔ آپ کے تجزیات کو امریکہ کے بین الاقوامی شہرت یافتہ میگزین "نیوز ویک" نے بھی شائع کیا ہے۔ ڈاکٹر شاہد حسن

صدیقی نے اندرون و بیرون ملک کے مختلف کالجوں، یونیورسٹیز، کانفرنسوں اور سیمینارز میں مقالات پیش کیے ہیں۔ آپ نے اسلامی نظام بینکاری پر ایک تحقیقی کتاب "اسلامک بینکنگ" تصنیف کی ہے جو ۱۹۹۴ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کا دیباچہ ممتاز اسکالر مولانا جسٹس محمد تقی عثمانی نے تحریر کیا ہے۔

ڈاکٹر شاہد حسن صدیقی نے اپنے کیریئر کا آغاز زرعی ترقیاتی بینک سے کیا تھا۔ اور پھر بی سی آئی تک میں نمایاں رہے۔ آپ نے دنیا کے ہر حصہ میں سیاحت کی جس کی وجہ سے تجربات و مشاہدات کو وسعت ملی۔ ڈاکٹر صدیقی صاحب کی خدمات کا دائرہ کئی براعظموں تک پھیلا ہوا ہے۔ یورپ، افریقہ اور مشرق وسطیٰ کے باخبر حلقے آپ کے مداح ہیں۔ اسلامی بینکاری کے نظام پر دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے، صدیقی صاحب اس سے پورے طور پر واقف ہیں۔

ڈاکٹر شاہد حسن صدیقی اسلامی بینکاری کے بڑے اور فعال تحقیقی ادارے "ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک بینکنگ اینڈ فنانس" کراچی کے چیئرمین اور چیف ایگزیکٹو ہیں۔ یہ ادارہ آپ نے ۱۹۹۸ء میں قائم کیا تھا۔ اس کے بورڈ میں وطن عزیز کی معتبر شخصیات جسٹس ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن، پروفیسر ڈاکٹر اشفاق قادری اور پروفیسر ڈاکٹر شاہدہ وزارت شامل ہیں۔ اس سے قبل آپ انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک بینکنگ اینڈ انشورنس لندن کے ڈائریکٹر جنرل برائے ایشیا کے عہدے پر فائز رہے اور اس ادارے کے ایک انٹرنیشنل جرنل "دی ہورائزن" کے ایڈیٹوریل بورڈ کے رکن رہے۔

موصوف انسٹی ٹیوٹ آف بینکرز پاکستان، انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک بینکنگ اینڈ انشورنس لندن اور انٹرنیشنل بینکرز ایسوسی ایشن کے فیلو ہیں۔ کالج آف بزنس مینجمنٹ کراچی کی ریسرچ ایڈوائزری کونسل (ایم۔ فل پروگرام) اور اکیڈمک کونسل انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز اسلام آباد کے ممبر ہیں۔ ان کے علاوہ جرنل آف دی انسٹی ٹیوٹ آف بینکرز پاکستان اور دی انسٹی ٹیوٹ آف کارپوریٹ سیکریٹریز آف پاکستان کے سہ ماہی میگزین کے ادارتی بورڈ سے بھی وابستہ ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ شہید ذوالفقار علی بھٹو انسٹی ٹیوٹ آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی کے اعزازی ایڈوائزر اور قومی ادارہ برائے امراض قلب کراچی کے اعزازی مالیاتی مشیر کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ شاہد صدیقی صاحب کی اعلیٰ خدمات کے اعتراف میں متعدد اداروں نے اعزازات سے نوازا ہے۔

ڈاکٹر شاہد حسن صدیقی صاحب کے گھر کا ماحول پُرسکون ہے۔ آپ کی شادی عبدالحکیم صاحب کی دختر ڈاکٹر ناہید سے ۱۹۷۵ء میں لاہور میں ہوئی۔ محترمہ نے الٹرا ساؤنڈ کے شعبہ میں خصوصی مہارت حاصل کی ہے۔ حج کی سعادت سے بھی مشرف ہو چکے ہیں۔

مولانا شرف الدین

مولانا شرف الدین کی ولادت ۱۹۰۰ء میں ضلع میرٹھ کے مشہور مسلم قصبہ انچولی کے ایک زمیندار گھرانے میں ہوئی۔ یہی مولانا شرف الدین کراچی کی مشہور سفید پوش بستی انچولی ہاؤسنگ سوسائٹی کے بانی ہیں یعنی میرٹھ کا قصبہ انچولی اب کراچی میں باشعور اور پڑھے لکھے لوگوں کی ایک صاف ستھری بستی ہے۔ مولانا کو ایس۔ ایم۔ شرف الدین کے نام سے پکارا جاتا تھا۔

مولانا نے ۱۹۱۷ء میں مشن ہائی اسکول میرٹھ سے میٹرک' آگرہ کے سینٹ جونس کالج سے بی۔اے اور ۱۹۳۲ء میں ایم۔اے اول پوزیشن سے کرکے انچولی میں سب سے پہلے ماسٹر ڈگری حاصل کرنے کا اعزاز حاصل کیا۔ قیام پاکستان کے بعد ۲۸ اگست ۱۹۴۷ء کو کراچی آئے۔ یہاں سینٹرل بورڈ آف ریونیو اور سینٹرل گورنمنٹ کے محکمہ ایکسائز اینڈ کسٹم میں ملازمت کرتے رہے۔ بعد ازاں کراچی میں قائم ہونے والے "ادارۂ ترقیات کراچی" میں آفیسر آن اسپیشل ڈیوٹی کے طور پر فرائض انجام دیتے رہے۔ ۱۹۶۰ میں ریٹائر ہوئے۔

انچولی ہاؤسنگ سوسائٹی انہیں کے خواب کی تعبیر ہے۔ ۱۹۵۸ء میں یہ سوسائٹی رجسٹرڈ ہوئی۔ آپ نے کے۔ڈی۔اے سے دو سو بیس پلاٹوں کے لئے قطعہ اراضی حاصل کیا اور بستی آباد کی۔ پندرہ سال تک اس سوسائٹی کے صدر کی حیثیت سے بے لوث خدمت کی۔

شرف الدین صاحب مذہبی اقدار سے گہری وابستگی رکھتے تھے۔ آپ نے چار مرتبہ حج کی سعادت حاصل کی۔ اپنی برادری کی فلاح و بہبود سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ ہزاروں افراد کی ملازمتوں کے حصول کے لئے معاونت اور ان کے دیگر مسائل کے حل کے لئے ہمہ وقت کوششیں آپ کے اخلاص اور بے غرضی کا عملی ثبوت ہیں۔ اس طرح آپ کی زندگی کے شب و روز خدمت' ایثار اور خدا ترسی سے عبارت رہے' آج بھی سینکڑوں افراد ان کو نہایت احترام و محبت سے یاد کرتے ہیں۔ یہ ان کی قدر و منزلت ہی تھی کہ وہ ہر سائل کا کام محض ایک ٹیلی فون پر کرادیا کرتے تھے۔

صدائے انچولی' مجلہ خصوصی ۱۹۸۵ء

استاد شریف خان

معروف موسیقار شریف خان کا شمار موسیقی کے ان روشن ستاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنے ذاتی شوق' صلاحیت اور لگن سے کلاسیکی موسیقی کو سخت ترین مشکلات کے باوجود زندہ اور روشن رکھنے میں قابل ذکر خدمات انجام دیں۔ انہوں نے پاکستان ہجرت کرنے کے بعد یہاں فن موسیقی کو استحکام اور ترقی دینے میں پوری توانائی صرف کی۔

استاد شریف خان ضلع میرٹھ کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مہاراجہ پونچھ کے موسیقی کے استاد تھے۔ اس لئے ان کی زندگی کا اولین دور پونچھ میں گزرا۔ گیارہ برس کی عمر میں والدہ کا انتقال ہو گیا مگر ان کے والد نے خصوصی توجہ اور کمال شفقت سے اپنے بیٹے کی پرورش کی۔ شریف خان کو بچپن ہی سے فن موسیقی سے دلچسپی تھی۔ اس لئے ان کے والد اور اساتذہ نے انہیں موسیقی کی تعلیم دینے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ وہ ایک باکمال ستار نواز ہوئے ہیں۔ حضرت امیر خسروؒ کے تار چھیڑنے کے سلسلے میں وہ ممتاز مقام رکھتے تھے۔ وہ ستار اور چترونیا کمال مہارت اور پختگی سے بجاتے تھے اور انہوں نے اس فن کو ایسی بلندی تک پہنچا دیا تھا کہ "استاد" کا مرتبہ حاصل کر لیا تھا۔ شریف خاں نے راگ نور لمارا' راگ نمارا لمبار اور راگ کردانی جیسے راگ ایجاد کئے۔ انہوں نے متعدد نغموں کی موسیقی بھی ترتیب دی۔ آپ ریڈیو پاکستان لاہور سے وابستہ تھے۔

شریف خان کے بیٹے اشرف شریف خان اپنے والد کے فن سے فطری طور پر لگاؤ رکھتے ہیں اور ان کے وارث ہیں۔ جدید نسل کے نوجوان اور باصلاحیت موسیقاروں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ شریف خاندان کے دو شاگرد اعجاز نبی اور لطیف خاں بھی دنیائے موسیقی میں نمایاں ہو رہے ہیں۔

انسائیکلوپیڈیا پاکستانیکا' ص ۵۹۸

شکیل عدنان

شکیل عدنان

سید محمد شکیل ایک ایسے علمی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں جس کے ہر فرد نے شعر و ادب اور صحافت کی بڑی خدمت کی ہے۔ مولانا شوکت میرٹھی اور ان کے بعد مولانا ندرت میرٹھی اور ان کے سب بھائی اور پھر ان کی اولادیں، سب ہی قلم سے وابستہ رہیں۔ انہیں میں سید ممنون احمد راحت میرٹھی کے صاحبزادے سید محمد شکیل اپنے قلمی نام شکیل عدنان کے نام سے معروف ہیں۔

شکیل عدنان ۲۲؍اپریل ۱۹۶۳ء کو کراچی میں پیدا ہوئے۔ گریجویشن کے بعد ابتداء میں اسکول میں مدرس رہے، پھر اپنے ایک عزیز اور ممتاز کہانی نویس علیم الحق حقی کے مشورے پر ماہنامہ "اشارہ ڈائجسٹ" سے وابستہ ہو گئے۔ وہاں پروف ریڈر کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے ہوئے انگریزی کہانیوں کے اردو ترجمے بھی کرتے رہے۔ یہ کہانیاں ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ اور دیگر رسالوں میں شائع ہوتی رہیں۔ جون ۸۸ء میں حقی صاحب کے توسط سے جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز جوائن کر لیا۔ پہلے پاکیزہ ڈائجسٹ میں سب ایڈیٹر کے طور پر پھر جاسوسی ڈائجسٹ اور اس کے بعد گروپ کے سب سے زیادہ اشاعت کے حامل سسپنس ڈائجسٹ کے معاون مدیر کی حیثیت سے ذمہ داریاں نبھائیں۔ اسی دورانیہ میں ہفت روزہ محاسب (جو بعد میں روزنامہ ہو گیا) کے لئے بھی کام کرتے رہے۔

۱۹۹۳ء میں جمال احسانی کے ادارت چھوڑنے کے بعد سے جنوری ۲۰۰۰ء تک سسپنس ڈائجسٹ کی ادارت سنبھالے رہے۔ اس عرصہ میں ماس کمیونی کیشن میں ایم اے کیا۔ روزنامہ جسارت، ڈیلی نیوز اور جرات کے لیے قومی و عالمی موضوعات پر کالم لکھتے رہے۔ بعد میں ڈیلی نیوز کے کلچرل پیج کے نگراں مقرر ہوئے۔ جرات کراچی کے مانیٹرنگ شعبہ کے نگراں اور نیوز ایڈیٹر بنائے گئے، جنوری ۲۰۰۰ء میں سسپنس ڈائجسٹ سے علیحدگی اختیار کر کے اپنا پرچہ نکالنے کا عزم کیا اور "دی پرائم ٹائم انٹرنیشنل" کے نام سے ماہنامہ جاری کیا۔ اس وقت اپنے رسالے کے ایڈیٹر اور پبلشر ہیں۔

طالب علمی کے دور میں اپنے والد سید ممنون احمد راحت کے زیر سایہ اسکاؤٹنگ، سول ڈیفنس اور فرسٹ ایڈ کی سرگرمیوں میں حصہ لیا۔ اپنے والد ہی کے ادارے "انٹرنیشنل ٹورسٹ کلب" کے ترتیب ہوئے شمالی علاقوں کے تعلیمی و تفریحی دوروں میں معاون رہے۔ ایڈون میموریل ویلفیئر ٹرسٹ کے ٹرسٹی اور پرائم ویلفیئر آرگنائزیشن کے جنرل سیکریٹری کے فرائض ادا کر رہے ہیں۔

شکیل عدنان نے بچپن میں شعر بھی کہے، افسانے لکھے، انٹرویوز کئے، بچوں کے لیے کہانیاں لکھیں، اس کے ساتھ ساتھ ان کی اہم خدمت انگریزی ادب کی بہترین کہانیوں کے اُردو تراجم ہیں جو رسائل میں اہتمام سے شائع ہوتے ہیں۔ وسیع المطالعہ شخص ہیں اور پورے انہماک سے اپنے ارادوں کی تکمیل کے لیے جدوجہد کرتے ہیں۔ اپنے عجز و انکسار کی وجہ سے بھی مقبول ہیں۔ ان کا سفر جاری ہے اور بہترین توقعات وابستہ ہیں۔

سید خورشید علی صاحب کی صاحبزادی رخسانہ ۲۲؍ستمبر ۱۹۹۵ء کو شکیل عدنان کی ہم سفر بنیں، محترمہ اپنے شوہر کے علمی کاموں میں معاون و مددگار ہیں۔

شمیم احمد

معروف تنقید نگار شمیم احمد کا تعلق علویہ کے اس خاندان سے ہے جس کی ایک شاخ ضلع بارہ بنکی کے مشہور قصبے ردولی شریف کے قریبی موضعات اور قصبات میں رہائش پذیر رہی ہے اور دوسری شاخ کاکوری میں آباد ہے۔ ان کا خاندان موضع کھیولی ضلع بارہ بنکی میں آباد تھا۔ خاندانی شجرے اور تاریخ کے مطابق برصغیر میں آنے والے پہلے جد امجد سالار مسعود غازی کے ساتھ ہندوستان میں وارد ہوئے تھے اور اودھ کی فتوحات کے دوران ہی علاقوں میں رچ بس گئے تھے۔ اس خاندان کے دو ہی مشغلے رہے ہیں۔ ایک عسکری زندگی اور دوسری علم و ادب' جس میں تصوف سے گہرا تعلق موجود تھا۔ مشہور بزرگ سید نعمت اللہ شاہ (کھیولی) اور شاہ نجات اللہ (کرسی) کا ان علاقوں کی روحانی تربیت میں سب سے نمایاں حصہ رہا ہے۔ یہ بزرگ اسی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ تحریک آزادی کے دوران انگریزوں کے خلاف ضلع بارہ بنکی کے جن دو بھائیوں مدد علی اور پیر علی نے شدید مزاحمت کی اور جس کے نتیجے میں ایک کو چھت سے ہاتھ پیروں میں کیلے ٹھونک کر ٹانگ دیا گیا تھا' شمیم احمد کے دادا کے دادا تھے۔ ان کے دادا سید عباس علی شاعر بھی تھے اور ہنر تخلص کرتے تھے۔ شمیم احمد کے دو تائے ایس۔ اے۔ حکیم اور سید شجاعت علی لکھنؤ کے مشہور اطباء میں سے تھے۔ والد سید شرافت علی ایک چھوٹی سی ریاست میں ضلع دار تھے۔ کپڑے کی تجارت بھی کرتے تھے' والدہ کیرانہ ضلع مظفر نگر کے صدیقی خاندان سے تھیں۔ ان کے والد حامد حسن تحصیلدار اور دادا طیب احمد حسن وہاں کے رئیس تھے۔ شمیم احمد صاحب کا ننھیالی سلسلہ پیران کلیر شریف کے صابری سجادگان اور حضرت سلیم چشتی آگرہ کے سجادگان اور ددھیالی سلسلہ حضرت وارث علی شاہ کے سجادگان سے ملتا ہے۔

شمیم احمد صاحب کی ولادت ۱۹۳۳ء میں ہوئی۔ ان کے والد کا انتقال تین سال بعد ۱۹۳۶ء میں صرف ۳۹ سال کی عمر میں ہوا۔ والدہ نے اپنے تین کم سن بچوں سلیم احمد' زاہدہ عزیز اور شمیم احمد کے لئے زندگی وقف رکھی۔ شمیم احمد اپنے والد کے انتقال کے بعد ابتداء میں اپنی خالہ کے پاس رہے۔ بعض مصلحتوں کی وجہ سے پھر اپنی خالہ کی سوتیلی بیٹی کے ہاں میرٹھ آ گئے۔ ۱۹۴۳ء میں فیض عام انٹر کالج میں تیسری جماعت میں داخل ہوئے۔ اس وقت ان کے بڑے بھائی سلیم احمد بھی فیض عام انٹر کالج میں پڑھ رہے تھے۔ کچھ عرصے بعد سانپور چلے گئے اور وہاں تعلیم جاری رکھی اور یہاں سے ۱۹۴۷ء میں کیرانہ آ گئے۔ وہاں سے پھر میرٹھ آئے۔ میرٹھ میں سلیم احمد صاحب پہلے سے موجود تھے۔ ان کے پاکستان چلے جانے کی بعد شمیم احمد

صاحب میرٹھ سے براہ بمبئی کراچی آ گئے۔

کراچی آنے کے بعد شمیم احمد صاحب کچھ عرصے یہاں رہے اور پھر کچھ عرصہ حیدر آباد اور میرپور خاص میں گزارا۔ انہوں نے اپنے خالہ زاد بھائی کے ساتھ ایک دکان کھولی تھی۔ معاشی ابتری میں سلسلہ

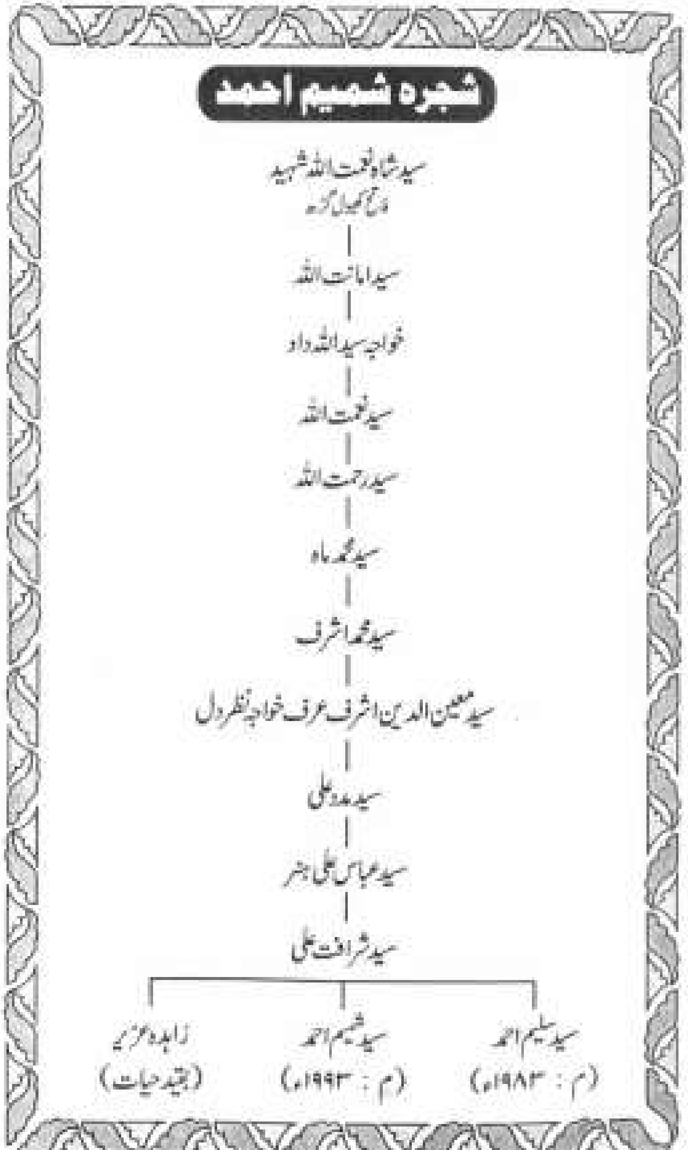

تعلیم تسلسل کے ساتھ جاری نہ رہ سکا مگر انہوں نے وقفوں کے ساتھ پرائیویٹ امتحانات دے کر تعلیم مکمل کرتے ہوئے کراچی یونیورسٹی سے ایم اے کیا۔ کراچی یونیورسٹی اور بلوچستان یونیورسٹی میں استاد رہے۔

شمیم احمد صاحب نے ۱۹۴۹ء سے تنقید لکھنے کا آغاز کیا۔ کتب بینی کا ذوق ابتدا ہی سے تھا۔ انہوں نے بتایا "میں نے ۹ سال کی عمر ہی سے ادب اور تاریخ کی کتابیں پڑھنی شروع کر دی تھیں اور میرا ذاتی شوق 'مشاغل' وقت گزاری سب پڑھنا اور مدام پڑھنا تھا۔ شاید حالات کی تلخیوں کا مداوا مجھے کتابوں میں نظر آتا ہے مگر حقیقت ہے کہ میں نے کسی قسم کے کھیل کود میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ میرا واحد شوق کتابیں تھیں"۔ شمیم احمد صاحب ایک نظریاتی شخص تھے۔ پاکستان سے گہری اور شعوری وابستگی رکھتے تھے۔ مسلم کاز کے لئے کام کرتے رہے تھے۔ پاکستان کے قیام کے بعد ان کی ذہنی زندگی اور طرزِ فکر میں انقلاب پیدا ہوا۔ اپنے ایک انٹرویو میں انہوں نے بتایا "پاکستان میں آکر میری ذہنی زندگی اور طرزِ فکر میں ایک اور انقلاب پیدا ہوا۔ پاکستان میرے خوابوں 'آرزوؤں اور تاریخی شعور کی بہت بڑی منزل تھی۔ وہ سر زمین جہاں خلافتِ راشدہ کا تجربہ ہونے والا تھا مگر دو سال میں مجھے بڑی تلخی کے ساتھ یہ احساس ہوا کہ قائد اعظم کی رحلت کے بعد یہ سب دھوکا بن گیا ہے۔ یہ ایک فریب تھا۔ چنانچہ میری ترقی پسندی کی وہ تربیت جو مسلم لیگ کے انتہائی عروج میں دب کر رہ گئی تھی اور تحریکِ پاکستان کے خوابوں میں' میں نے اسے ایک کمتر چیز سمجھا تھا' نئی رد عمل کی وجہ سے پھر ابھری۔ جب میں نے دیکھا کہ پاکستان تو صرف ایک دھوکہ کی ٹٹی بن گیا ہے جس میں اسلام اور خلافتِ راشدہ کا کوئی بیج نہیں بویا جا سکتا تو میں ایک شدید غصہ اور مایوسی کا شکار ہو گیا اور اس کا علاج ترقی پسند تحریک کے دعووں میں تلاش کرنے لگا لیکن کیا میں اندر سے وہ تھا؟ آنے والے سالوں نے یہ بتایا کہ نہیں 'اشتراکی نظریات سے میرے باطن میں مخاصمت موجود ہے اور اگر پاکستان کو قائم رکھا جا سکتا ہے تو اپنے تاریخی اور تہذیبی شعور کی بنیاد پر۔ مسلم لیگ کی قیادت نے اگر دھوکہ دیا تھا تو کیا ہوا؟ ہم کو اس صداقت کے لئے خون کا آخری قطرہ تک بہا دینا چاہئے جس کو میں نے آنکھ کھول کر پورے برصغیر کے مسلمان عوام میں ایک زندہ 'جیتا جاگتا اور بھرپور جذبہ اور ذاتی عہد نامہ محسوس کیا تھا۔ سن ۱۹۵۶ء سے لے کر اب تک میرا سفر اسی سمت میں ہے"۔

شمیم احمد صاحب اپنی تحریر کے ذریعہ فکری استدلال پر ہمیشہ زور دیتے رہے۔ ان کا موقف تھا کہ ہمیں اپنے ملک میں ہر اس آواز کا جواب جو ہمارے اجتماعی طرزِ عمل سے متصادم ہے اس پر پابندی لگا کر نہیں بلکہ عقلی اور جذباتی دونوں اعتبار سے فکر و استدلال کے ذریعہ دینا چاہئے۔

شمیم احمد صاحب تخلیق کے مقابلے پر تنقید کو ایک اعتبار سے ثانوی چیز کہتے ہیں' لیکن ان کے خیال میں "اگر کوئی ایسا ادیب ہے جو تنقید کو ایک وسیلہ اظہار کی صورت میں برتتا ہے اور اپنے شعور و فکر اور صداقت کو کسی اسلوب میں منتقل کرتا ہے تو یہ تنقید 'تنقید نہیں بلکہ ایک ایسی تحریر ہے جو عالمگیر اپیل

رکھتی ہے اور فنکار اس میں ایک کل کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ یہ کیا صنف ہوگی یہ الگ بات ہے مگر میں اسے تخلیق مانتا ہوں' تنقید نہیں۔ اس سطح پر جدید تنقید میں محمد حسن عسکری اور فراق صاحب آتے ہیں اور میں ان کی تنقید کو بھی تخلیق سمجھتا ہوں 'محض تنقید نہیں۔"

شمیم احمد صاحب ایک ممتاز تنقید نگار تھے۔ انہوں نے سنجیدگی اور دیانت کے ساتھ لکھا اور پھر یہ ان ہی کی جسارت تھی کہ کبھی کسی مصلحت کا شکار نہیں ہوئے۔ اسی لئے ان کی بیباکی نے شہرت حاصل کی۔ ممتاز ناقدین کی چند آراء کے اقتباسات سے ان کے علمی مقام کا اندازہ کیا جا سکتا ہے:

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی: خاص طور پر شمیم احمد کے مضامین تو اتنے دلچسپ ہوتے ہیں کہ انہیں پڑھنے بیٹھتا ہوں تو بغیر ختم کئے نہیں رہ سکتا جب کہ دوسرے نقادوں کے مضامین دو چار جملوں یا زیادہ سے زیادہ ایک آدھ پیراگراف سے زیادہ چل ہی نہیں پاتے۔ مجھے جھنجلا کر الگ رکھ دینا پڑتا ہے۔ ان سے اس دلچسپی کا جائزہ لیتا ہوں تو ان کی دو خاص صفتیں میرے سامنے آتی ہیں۔ اول ان کا تسلسل جو پہلے جملے سے توجہ کو پکڑتا ہے تو آخری جملے تک نہیں چھوڑتا' بات میں سے بات نکل آتی ہے اور افسانہ کا سا تسلسل قائم رکھتا ہے۔ دوسرے ان کی شگفتگی جس کی بنا پر بڑے چونکا دینے والے فقرے اور جملے سامنے آتے ہیں جو مضمون کو ایک خاص اور انفرادی زندگی دیتے رہتے ہیں اور میرے ذہن کو پھڑکاتے رہتے ہیں۔ لوگ ان کی فقرے بازی سے جل کر اسے تنقید کہنے کو تیار نہیں ہیں مگر میں اس بات کو مانتے ہوئے کہ کہیں کہیں یہ فقرے سطحی اثر قائم کرنے سے آگے نہیں بڑھتے' یہ بھی خوب سمجھتا ہوں کہ یہ فقرے کمال کے ساتھ فکر انگیز ہیں اور ان میں تنقید کی وہ جان ہے جس سے ہمارے منشیانِ تنقید آشنا نہیں ہیں۔ ان کی فقرے بازی محض طبیعت کو نہیں چونکاتی بلکہ فکر میں بھی ذاتی ہے اور حقیقت کو نہایت بلاغت کے ساتھ واضح کرتی ہے۔ اس میں ان مضامین کی وہ جان ہے جو انہیں تخلیقی تنقید کے دائرے میں لاتی ہے۔ دورِ رواں کے نقادوں میں وہی ان چند میں ہیں جو اردو تنقید کو محض نقش گیری کے دائرے سے نکال کر جیتی جاگتی زندہ اور زندہ رہنے والی چیز بنا دیتے ہیں۔

مشفق خواجہ: لیکن زاویہ نظر میں صرف اس قسم کی مزیدار باتیں نہیں ہیں اور بھی بہت کچھ ہے ادب' مسائل اور ادیبوں کے بارے میں دو درجن سے زیادہ مضامین کا یہ مجموعہ ادب کے سنجیدہ قارئین کی نظر سے ضرور گزرنا چاہئے۔ یہ روایتی تنقید نہیں ہے کہ پڑھنے والا اپنے ناکردہ گناہوں کی سزا بھگتے۔ یہ روایتی تنقید کے خلاف اعلانِ جنگ ہے' جس سے قاری کے خون میں حدت پیدا ہوتی ہے۔ آپ شمیم احمد سے لاکھ اختلاف کریں لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی تحریریں ادب اور اس کے مسائل پر سنجیدگی سے غور کرنے کی راہ دکھاتی ہیں۔

ڈاکٹر سید عبداللہ: ان دنوں مجھے ایک فکر انگیز کتاب دیکھنے کا اتفاق ہوا جسے دیکھ کر محسوس ہوا کہ ہمارے یہاں فکر و دانش کے لئے جاں گدازی کی رسم ابھی موجود ہے اور کچھ لکھنے والے ایسے بھی ہیں جو

سرورق: میری نظر میں ☆ شمیم احمد

سرورق: سوال یہ ہے ☆ شمیم احمد

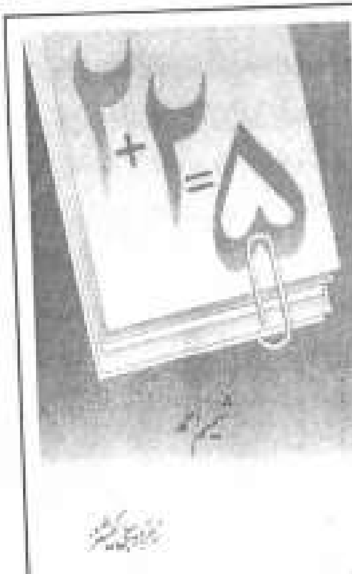

سرورق: ۲+۲=۵ ☆ شمیم احمد

ادب اور معاشرے کے باہمی روابط کے بارے میں متفکر رہتے ہیں اور سلیقے سے جرأت کے ساتھ اپنے خیالات پیش کر سکتے ہیں۔ اس فکر انگیز کتاب کا نام ۲+۲=۵' مصنف اس کے شمیم احمد ہیں جنہیں اردو ادب سے تعلق رکھنے والا ہر شخص جانتا ہے اور پہچانتا ہے۔ یہ ایک تنقیدی شاہکار ہے جسے پڑھ کر مجھ اس طرح محسوس کیا کہ جدید ادبی تنقیدوں کے اکابر کے رخصت ہو جانے کے بعد ایک نیا نقاد ایسا سامنے آیا ہے جس کا ادبی اور معاشرتی شعور یکساں طور سے کامل اور گہرا ہے۔ اور اسے پیش کش کا ایسا فن حاصل ہے کہ اس کے تنقیدی نتائج کو کوئی تسلیم کرے یا نہ کرے آسانی سے نظر انداز نہیں کر سکتا۔"

ڈاکٹر سلیم اختر: شمیم احمد میں تجزیہ کی غیر معمولی صلاحیت ہے۔ تحریر کی کاٹ دوسری اہم خصوصیت ہے۔ ان کی تمام خصوصیتیں اس وقت تک اپنے عروج پر ہوتی ہیں جب وہ کسی کے خلاف لکھ رہے ہوں۔ ویسے انہوں نے عصری مسائل کے تناظر میں آج کے ادب اور ادیب کے مطالعہ پر خصوصیت سے زور دیا ہے۔

ڈاکٹر انور سدید: شمیم احمد نے زندگی کی با معنی سرگرمی کو ادب کی تخلیقی تکنیک سے دیکھنے کی کوشش کی ہے اور پھر ہر مسئلہ پر اپنا فیصلہ دینے سے گریز بھی نہیں کیا۔ وہ ادب کا مطالعہ نسبتاً" وسیع تناظر میں کرتے ہیں اور درسی نقادوں کی طرح طلباء کی ضرورتیں پوری کرنے کی سعی نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ شمیم احمد کے موضوعات بیشتر نئے ہیں اور جن پرانے موضوعات کو انہوں نے چھوا ہے وہاں ان کا اسلوب تنقید دوسرے نقادوں سے جداگانہ ہے۔ شمیم احمد صید و صیاد دونوں پر نشتر زنی کرتے ہیں اور خوفِ فسادِ خلق سے بے نیاز ہو کر تنقید لکھتے ہیں۔ چنانچہ ان کے ہاں ان کا ذاتی زاویہ 'ذاتی رائے اور ذاتی اثر' بڑی اہمیت رکھتا ہے اور نیم دروں نیم بروں کی کیفیت پیدا کرنے کے بجائے کھلے اور برملا انداز میں کہہ دیتے ہیں۔

شمیم احمد کی پانچ کتب مضامین کے مجموعوں پر مشتمل ہیں اور ایک کتاب "تحریکِ پاکستان" پاکستان کے ثقافتی' سیاسی' تہذیبی' اور ادبی منظر کے جائزے پر مشتمل ہے۔ ان تصانیف کے نام ہیں:

برش قلم: ۱۹۸۳ء

۱۔ سوال یہ ہے؟: ۱۹۸۳ء

۲۔ ۲+۲=۵: ۱۹۷۷ء' ۱۹۹۴ء

۳۔ میری نظر میں: ۱۹۹۴ء

۴۔ زاویہ نظر:

۵۔ تحریکِ پاکستان: ۱۹۹۴ء

شمیم احمد صاحب کی شادی محترمہ تنویر بنتِ ناظر زماں صاحب سے ۲۹ اگست ۱۹۷۱ء کو ہوئی۔ آپ کی اولاد میں سید نعمان احمد' سید سلمان احمد' سید ارسلان احمد' سید ریحان احمد اور سید فرحان احمد کے علاوہ ایک بیٹی شائستہ شمیم ہیں۔

علیم احمد صاحب نے ۲۳ جون ۱۹۹۳ء کو انتقال کیا۔ ان کی تدفین ان کے بڑے بھائی ممتاز شاعر، نقاد اور ڈرامہ نگار سلیم احمد کی قبر کے قریب پاپوش نگر کراچی کے قبرستان میں ہوئی۔

صوفی شہاب الدینؒ

آپ کی ولادت ۱۸۹۵ء میں ہوئی۔ حضرت شہاب الدین کا اصل وطن موضع محلوالہ ضلع میرٹھ تھا مگر آپ نے ۱۹۳۳ء میں قصبہ کنھور میں مکان خرید کر وہیں سکونت اختیار کر لی تھی۔ آبائی پیشہ خطاطی تھا۔

صوفی شہاب الدین صاحب کے خاندان کے بیشتر افراد انگریز کمپنیوں میں کام کرتے تھے۔ آپ کے بڑے بھائی بھی شملہ میں کام کر رہے تھے۔ آپ اپنی تعلیم مکمل کر کے انہیں کے پاس شملہ چلے گئے۔ وہاں خطاطی کا کام سیکھ کر مختلف اداروں میں ۱۹۳۱ء تک ہندوستان کے مختلف مقامات بمبئی، کوئٹہ، دہلی اور لاہور وغیرہ میں خدمات انجام دیتے رہے۔ دینی رجحان غالب تھا لہٰذا آپ نے حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی سے تعلق قائم کیا اور بیعت کے بعد بہت جلد اجازت بیعت و تلقین بھی حاصل ہوگئی۔

آپ نے کنھور میں خلاف شریعت رسومات کو ختم کرانے کی بھرپور کوششیں کیں اور کافی حد تک کامیاب ہوئے۔ صوفی شہاب الدین صاحب کو فقہی مسائل پر کافی عبور حاصل تھا۔ کتب بینی سے گہرا شغف رکھتے تھے۔ اپنے مرشد کی تمام تصانیف کے علاوہ دیگر اکابر علماء کی تصانیف کا کافی بڑا ذخیرہ آپ کے کتب خانہ کی زینت تھا۔

صوفی صاحب نے تین مرتبہ حج کی سعادت حاصل کی۔ عمر کے آخری حصہ میں تمام مصروفیات ترک کر کے کتب کے مطالعے یا آنے والوں سے ملاقات تک اپنے آپ کو محدود کر لیا تھا۔ ۲۰ اگست ۱۹۷۰ء کو آپ نے رحلت فرمائی۔

کاروان تھانوی ص ۵۱

شیر علی خاں

شیر علی خاں

میرٹھ کے جن صاحبانِ فکر و نظر نے زندگی کے مختلف ادوار میں دیانت داری سے فرائض ادا کر کے نیک نامی حاصل کی ان میں شیر علی خاں بن امداد حسین خاں بن میر داد خاں بھی قابلِ ذکر ہیں۔ آپ کے والد امداد حسین خاں کو تعلیم کے فروغ سے خصوصی دلچسپی تھی۔ وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اپنے گاؤں توزری میں ایک اسکول قائم کیا تھا، جس میں ڈیڑھ سو سے زائد بچے پڑھتے تھے۔ آٹھویں کلاس کے بعد وہ ان طالب علموں کو میرٹھ یا ہاپوڑ مزید تعلیم کے لئے بھیج دیتے تھے۔ اپنی اسی خدمت کے سبب وہ اپنے علاقہ کے بہت بڑے محسن تھے۔ اس کا اثر ان کی آئندہ نسلوں پر بھی پڑا۔ آج بھی ان کے خاندان کے افراد انھیں بڑے احترام سے یاد کرتے ہیں۔ انھیں علم دوست شخص کے بیٹے شیر علی خاں کی ولادت ۱۹۰۹ء میں میرٹھ میں ہوئی۔ بھائیوں میں فرزند علی خاں اور توصیف علی خاں کے علاوہ تین بہنیں اکبری بیگم، افسری بیگم اور خاتون ہیں۔

شیر علی خاں صاحب نے تعلیمی مدارج طے کرتے ہوئے میرٹھ کالج سے بی۔اے کیا۔ اس وقت میرٹھ کالج کا الحاق آگرہ یونیورسٹی سے تھا۔ گریجویشن کرنے کے بعد خاں صاحب محکمہ پولیس میں ملازم ہوگئے۔ آپ نے مختلف شہروں میں خدمات انجام دیں۔ ایک کامیاب پولیس افسر کی حیثیت سے ترقی کرتے ہوئے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس ہوئے اور عرصہ ملازمت کے اختتام سے دو سال پہلے ریٹائرمنٹ حاصل کرلی۔ دورانِ ملازمت ۱۹۳۷ء میں الٰہ آباد یونیورسٹی سے ایل۔ ایل۔ بی کر چکے تھے لہٰذا سبکدوشی کے بعد وکیل کی حیثیت سے ۱۹۶۷ء میں پریکٹس کا آغاز کیا۔

خاں صاحب کا حلقۂ احباب وسیع اور اپنے وقت کے قابل لوگوں پر مشتمل تھا۔ قریبی دوستوں میں علامہ نیاز فتح پوری، چودھری چرن سنگھ، سردار امیر اعظم، اختر حسین، رشید احمد صدیقی اور کملا پرشاد ترپاٹھی شامل تھے۔ ان کے ہم وطن چودھری چرن سنگھ بھارت کے معروف سیاست داں ہیں، انھیں کی خواہش و تحریک پر بھارتیہ کرانتی

دل میں شامل ہوئے۔ ان کی جماعت نے اسمبلی کا ٹکٹ دیا۔ الیکشن میں نمایاں کامیابی حاصل کر کے اسمبلی کے رکن بنے۔ اسمبلی کی قائم کردہ مختلف کمیٹیوں میں انہوں نے بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے خود کو کامیاب پارلیمنٹیرین ثابت کیا۔ ۱۹۷۲ء میں اسمبلی کی مدت پوری ہوئی۔ ان کے بچوں میں دو بیٹیاں شبانہ اور فرزانہ بینائی سے محروم تھیں۔ بیٹے کرامت، عنایت، رفاقت اور وجاہت کے علاوہ دو بیٹیاں ڈاکٹر نوشابہ اور روداب پاکستان آچکے تھے اس لئے دوستوں نے مشورہ دیا کہ اس عمر میں ان نابینا بچیوں کے ساتھ مشکل ہوگی لہٰذا آپ بھی پاکستان چلے جائیں۔ موصوف نے حالات کو دیکھتے ہوئے اس صائب مشورے کو قبول کیا اور بچیوں کے ساتھ ۱۹۷۵ء میں پاکستان آگئے۔ یہاں صرف دو سال بعد کراچی میں جہانِ فانی سے رخصت ہوئے۔

شیر علی خاں صاحب کی نابینا بیٹی فرزانہ نے سندھ یونیورسٹی سے بی۔اے کے امتحان میں فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن لے کر اپنی خداداد ذہانت کا اظہار کیا۔ دوسری نابینا بیٹی شبانہ کا انتقال ہو چکا ہے۔

صادق حسین صدیقی سردھنوی

صادق حسین صدیقی سردھنوی نے تاریخی ناول نگاروں کی صف میں سب سے زیادہ شہرت اور مقبولیت حاصل کی۔ انہوں نے تاریخ اسلام کے ہر واقعہ کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا۔ مولانا عبدالحلیم شرر کے بعد تاریخی ناول نگاری میں انہیں کا نام آتا ہے۔ صادق سردھنوی نے تاریخی ناول نگاری کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا تھا۔ اس لئے ساری زندگی تاریخی ناول ہی لکھے۔

صادق حسین صدیقی سردھنوی ۶ دسمبر ۱۸۹۷ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد جعفر حسین صدیقی جید عالم تھے۔ انہیں عربی اور فارسی پر عبور حاصل تھا۔ صادق صاحب کی تعلیم و تربیت انہیں کی زیر نگرانی ہوئی۔ صادق سردھنوی نے مسلمانوں کو اسلاف کے کارناموں کی طرف متوجہ کرنے اور مسلمانوں کو عظمتِ رفتہ سے آگاہ کرنے کے لئے تاریخ کو افسانے کا رنگ دے کر پیش کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ "تاریخ خلفائے راشدین" کے دیباچے میں اس کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں "تاریخ یا تاریخی افسانے لکھنے سے ہمارا منشا یہ بھی تھا کہ قوم میں بیداری پیدا ہو اور تاریخ سے دلچسپی لیں تاکہ پستی سے عروج کی طرف گامزن ہو سکیں"۔ اپنے ناول "صادق" کے دیباچے میں مولانا تاریخی ناول لکھنے کا سبب بتاتے ہوئے لکھتے ہیں "آج مسلمان اپنے اسلاف کے حیرت انگیز کارناموں کو تقریباً بھول چکے ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ ان کے بزرگوں نے کہاں کہاں اور کیا کیا کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں۔ میں نے سرفروشانِ اسلام کے کارنامے ناولوں کے طرز میں لکھ کر قوم کے سامنے اس لئے پیش کئے ہیں کہ وہ ان بھولی ہوئی داستانوں کو نظر کے سامنے رکھتے ہوئے قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کے قدم بہ قدم چلیں"۔

ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ نے اپنے مقالے میں لکھا ہے "یہ کہنا مشکل ہے کہ صادق حسین صدیقی نے کب لکھنا شروع کیا کیونکہ کسی ناول سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ان کا پہلا ناول کون سا ہے"۔ صادق سردھنوی نے نصف صدی سے زائد عرصہ تک ناول تحریر کئے۔ انہوں نے تقریباً "۱۱۹" کتابیں تحریر کیں جن میں سے ۸۰ کے لگ بھگ تاریخی ناول ہیں۔ ان ناولوں کی فہرست ڈاکٹر گوریجہ نے فراہم کی ہے۔ ان میں جنگِ اصفہان، فتح شوستر، فتح یرموک، فتح بصرہ، جراحتِ صفیہ، نقاب پوش چیلیر، اسپین کی شہزادی، سسلی کی ساحرہ، اورنگ زیب عالمگیر، بہادر خواتینِ اسلام، خروشِ انتقام، حیدر علی، بہادر کرد، سلطان المجاہدین، سلطان بایزید یلدرم، شہزادہ جمشید، شیرِ دکن حیدر علی، شیر سوڈان، شیر شاہ سوری، طارق، عجمی شہنشاہ، علائی

بغداد، عماد الدین زنگی، فتح بیت المقدس، ماہ طلعت، جنگِ بدر، مغلِ اعظم، شہزادی عباسیہ، ہاشمی دوشیزہ، سلطان سبکتگین، مشرق کی حور، معرکۂ حلب، صلیبی جہاد، بہادر شہزادیاں، نازنینِ عرب، مشرق کے چاند، عرب کا چاند، شوقین ملکہ، معرکۂ کربلا، ایران کی فتح، پہلی صلیبی جنگ، سنگدل ملکہ، سلطان فیروز شاہ تغلق، معرکۂ روم و یونان، شیر دل خواتینِ اسلام، آفتابِ عالم، محبوبہ اور خاں، خالد بن ولید، سلطان صلاح الدین ایوبی، محمد بن قاسم، اندلس کے دو چاند، جوشِ اسلام، فتح بصرہ، فتح افریقہ، بغداد کی تباہی، ترکوں کی تلوار، حورِ مراکش، بنتِ حلب، بہادر دوشیزہ، دوشیزۂ کابل، محبوبِ حلب، سلطان محمد غوری، شاہ جلال غازی، شہزادی ایلس، مجاہد پاکباز، فتحِ کافرستان، مجاہدِ اسپین، بہادر حور، آشنا کی حور، رومی شہزادی، سعید و ظلیانہ، فتح انطاکیہ، جنگِ صلیب و ہلال، شکستِ تاتار، معشوقۂ ہند، جنگِ فلسطین، ایران کی حسینہ، آرمینیہ کا چاند، معرکۂ سومنات، جانباز ترک اور مصطفیٰ کمال شامل ہیں۔ ان ناولوں میں سے بیشتر نایاب ہیں، حالانکہ ان کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہوئے ہیں۔ ایک ایک ناول کئی کئی پبلشروں نے شائع کیا ہے۔ پاکستان میں بعض ایسے ناول قیامِ پاکستان کے بعد دوبارہ شائع کئے گئے جو قیامِ پاکستان سے قبل لکھے گئے۔

ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ نے صادق سردھنوی کے ناولوں کی زبان کے بارے میں تحریر کیا ہے "صادق حسین صدیقی نے پر تکلف زبان استعمال نہیں کی۔ جہاں لڑائی کے نقشے کھینچے ہیں، وہاں کوشش کی ہے کہ اس دور کے جنگی ہتھیاروں، جنگی وسائل اور لباس کا ذکر تفصیل سے کریں، بزم کے مناظر میں تفصیل کے بجائے اختصار ملتا ہے، البتہ رزم کے مناظر میں خاصی تفصیل موجود ہے"۔ اس خصوصیت کا ذکر ڈاکٹر نزہت سمیع الزماں نے بھی کیا ہے "مولانا کے طرزِ تحریر میں ایک خاص قسم کی شگفتگی جھلکتی ہے۔ جو ان کے ناولوں کو غیر دلچسپ ہونے سے بچالیتی ہے"۔ موصوفہ نے صادق سردھنوی کی ناول نگاری کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے "مولانا کہانی مزے میں کہہ لیتے ہیں اور قاری کی توجہ کو آگے کیا ہوا؟ میں الجھائے رکھتے ہیں۔ نیز تاریخی واقعات کی صحت کا بھی زیادہ خیال رکھتے ہیں۔ مولانا نے اردو کے دوسرے تاریخی ناول نگاروں کے مقابلے میں (ان میں شرر بھی شامل ہیں) تاریخی کرداروں کی اوقات کم گھٹائی ہے یعنی جیسے وہ تاریخ میں نظر آتے ہیں، ویسے ہی رہنے دیا ہے"۔

ڈاکٹر سلام سندیلوی نے اپنی کتاب "ادب کا تنقیدی مطالعہ" میں تحریر کیا ہے۔ "ان کے قلم نے تیغ" اردو ناولوں میں زبردست اضافہ کیا ہے۔ ان کا اندازِ بیان صاف اور شگفتہ ہوتا ہے۔ اس لئے قارئین ان کے ناولوں کو دلچسپی سے پڑھتے ہیں"۔ ڈاکٹر نزہت نے صادق سردھنوی کے ناولوں کا جائزہ لینے کے بعد یہ رائے قائم کی ہے۔ "بحیثیت تاریخی ناول ادب میں ان ناولوں کا کوئی مقام نہیں ہے"۔ ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ نے بھی لکھا ہے۔ "انہوں نے اپنے ناولوں میں فنی نزاکتوں کا لحاظ نہیں رکھا"۔

صادق سردھنوی کے ناول "آفتابِ عالم" کو ڈاکٹر نزہت سمیع الزماں نے ان کا سب سے بہتر ناول بتایا ہے جبکہ "تاریخ خلفائے راشدین" کو ڈاکٹر گوریجہ نے گرانقدر علمی تالیف قرار دیا ہے۔ مولانا صادق

سرو صنوی کے کسی بھی ناول میں ان کے حالات زندگی نہیں ہیں۔ اردو ادب کی تاریخوں میں بھی ان کا ذکر مفقود ہے۔

ماخذ : اردو ادب میں تاریخی ناول' ۳۵۰ تا ۳۸۳

اردو ادب میں تاریخی ناول کا ارتقاء' ص ۱۵۵ تا ۱۷۱' ڈاکٹر ممتاز عمر

صغیر احمد

صغیر احمد

خطاطی' موسیقی' مصوری' شاعری اور مجسمہ سازی کا کسی ایک شخصیت میں امتزاج دیکھنا ہو تو پھر ایک ہی نام ذہن میں آتا ہے اور وہ ہے صغیر احمد' جن کی خداداد صلاحیتوں کا اعتراف بڑے پیمانے پر کیا گیا ہے۔ آپ وطن عزیز کے ایک جانے پہچانے اور مقبول فنکار ہیں۔

صغیر احمد ۱۹۳۸ء میں میرٹھ پیدا ہوئے۔ آپ کے والد نذیر احمد میرٹھی ابن محمد یوسف ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے ۱۹۵۲ء میں پاکستان ہجرت کی' تین سال بعد والد کا سایہ شفقت اٹھ گیا پھر قائد آباد سے ملیر آ گئے۔ معاشی حالات نے کراچی چھوڑنے پر مجبور کر دیا اور صغیر صاحب لاہور چلے گئے۔ وہاں کپڑا بیچنے لگے' شربت کا ٹھیلا لگایا یعنی اسی قسم کے چھوٹے موٹے کام کر کے پیٹ بھرتے رہے' البتہ وہاں کا ادبی ماحول پسند آیا۔ لاہور میں عبدالحمید عدم' ظہیر کاشمیری اور موسیقار صفدر حسین سے روز کی ملاقاتیں معمول رہیں۔ ۱۹۶۴ء میں واپس کراچی آئے۔ لانڈھی میں دو سال قیام کیا اور ۱۹۶۶ء سے ملیر میں سکونت پذیر ہیں۔

صغیر احمد نے ۱۹۶۴ء میں لانڈھی میں قیام کے زمانے میں مصوری کا آغاز کیا۔ وطن کی محبت ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ کے زمانے میں عشق میں تبدیل ہو گئی۔ آپ کے کام کا نوے فیصد سے زیادہ حصہ اسلام اور پاکستان کے حوالے سے ہوتا ہے۔ آپ نے ابتداء میں مجسمہ سازی میں کافی شہرت حاصل کی۔ آپ کے بنائے ہوئے مہاتما بدھ' ماؤزے تنگ' قائداعظم اور دیگر شخصیات کے مجسمے بے حد پسند کیے گئے۔ ۱۹۷۰ء میں فکری تبدیلی آئی۔ چند بزرگوں نے آپ کے شوق اور فن کی سمت بدل کر پاکستان اور ملت اسلامیہ کو آپ کی تخلیقات کی پہچان بنا دیا۔ اس سلسلے کی پہلی کاوش نبیؐ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب عمارتوں کے ماڈلز تھے۔ ایک اور بڑا کام قائداعظم کی زندگی کو ماڈلز کے ذریعے اجاگر کرنے کا تھا۔ یعنی قائداعظم جہاں پیدا ہوئے اس عمارت کا ماڈل' ان کی تعلیمی درس گاہوں کے ماڈلز' لنکن ان'

زیارت' ریذیڈنسی' گورنر ہاؤس کراچی اور آخر میں مقبرے کا ماڈل۔ یہ چودہ ماڈل تھے۔ نیشنل میوزیم کراچی میں ۱۹۷۶ء کو ان کی نمائش ہوئی۔ صفیر صاحب نے یہ ماڈلز قومی عجائب گھر کو تحفتہً پیش کئے۔ ۱۹۷۷ء میں علامہ اقبال کی صد سالہ تقریبات کے حوالے سے علامہ سے منسوب ۷ عمارتوں کے ماڈلز تیار کئے جن کی نمائش لاہور میں ہوئی۔ اقبال انٹرنیشنل کانگریس کے شرکاء نے بھی ان ماڈلز میں دلچسپی لی۔ علامہ اقبال کمیٹی نے نقد انعام بھی دیا۔ قائداعظم کے مزار کے پہلو میں قائم میوزیم' قائداعظم ہاؤس میوزیم کراچی' علامہ اقبال میوزیم لاہور' کوڈ ریسرچ لیبارٹری' مدینتہ الحکمت کراچی کے علاوہ کراچی انٹرنیشنل ائرپورٹ کے ٹرمینل نمبر ۲ پر بھی صفیر احمد کا کیا ہوا کام دعوت نظارہ دے رہا ہے۔ آپ کے قابل ذکر کاموں میں ایک کیرتھر نیشنل پارک کا ڈایوراما بھی شامل ہے جو صفیر احمد کی زندگی کے مشکل منصوبوں میں سے ایک ہے۔ ۱۰x۱۸ فٹ کا یہ ڈایوراما سندھ کے ایک دشوار گزار علاقے کرچات میں رہ کر تیار کیا۔ نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اوشنوگرافی پاکستان نے بھی مختلف قسم کے سائنسی ماڈلز صفیر صاحب سے بنوائے ہیں۔ آج کل حجاج کرام کی رہنمائی کے لئے خاص پروجیکٹ پر کام کر رہے ہیں۔ صفیر احمد پولیسٹر' میٹل' پلاسٹر آف پیرس' ماربل اور ووڈ پر عام اوزاروں سے کام کرتے ہیں۔ اگر کوئی شخص ان اوزاروں سے کام کرتے ہوئے دیکھ لے تو وہ یقین نہیں کرے گا کہ ان ہی اوزاروں کی مدد سے صفیر احمد نے اتنے اہم کام کئے ہیں۔

صفیر احمد کے فن کے قدر دانوں میں جنرل محمد ضیاء الحق' حکیم محمد سعید' محمد خان جونیجو' ایس۔ ایم۔ عباسی جیسی شخصیات' غیر ملکی سفارت کار اور عمائدین ملک شامل ہیں۔ آپ نے قومی ترانے کو بھی مصور کیا ہے۔ قومی ترانے کے ہر مصرعے کو آپ نے پیش نظر رکھا ہے۔ صفیر صاحب کی یہ کاوش انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز اسلام آباد نے خوبصورت کتابی شکل میں شائع کی ہے۔

صفیر احمد موسیقی سے بھی گہرا لگاؤ رکھتے ہیں۔ ہارمونیم اور بینجو کے ماہر ہیں۔ لاہور کے قیام کے دوران شعر گوئی کی طرف بھی رجحان رہا۔ اس زمانہ کے دو قطعات ہیں:

مرے محبوب کچھ تو بات کرو
پھر یہ تنہائیاں ملیں نہ ملیں
گلشن وقت کی بہاروں میں
ایسی رعنائیاں ملیں نہ ملیں

ان کی چاہت بھی کہیں گردشِ ایام نہ ہو
میں جسے صبح سمجھتا ہوں کہیں شام نہ ہو
شدتِ غم سے سنورتی ہے زمانے میں حیات
زندگی کیا ہے اگر سوزشِ آلام نہ ہو

صفیر احمد کی شادی ۱۹۷۵ء میں شاہانہ بنت سیف الدین میرٹھی سے ہوئی۔ آپ کی اولاد میں شازیہ مسرت' رفعت شاہین' حنا ناہید' نوشین صبا اور ثنا احمد کے علاوہ ایک صاحبزادے معروف احمد ہیں۔ یہ سب تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ شازیہ مسرت بیاہی جا چکی ہیں۔ ملیر میں مقیم ہیں۔

غزل

پریشاں ہے وہ اس کے گھر مجھے جانا پڑے گا
کچھ اپنے مسئلوں کو اور الجھانا پڑے گا

یہ سناٹا نہیں ٹوٹے گا اب صوت و صدا سے
کسی کے سر سے اپنے سر کو ٹکرانا پڑے گا

اسے تسکین کے ساماں مہیا کر تو دوں میں
مگر خود اپنے آگے ہاتھ پھیلانا پڑے گا

میں اب بھی دستکیں اس گھر پہ دے سکتا ہوں لیکن
ہوا اور حبس کو اک ساتھ پہچانا پڑے گا

ان آنکھوں میں شرارت کی جگہ سوچوں نے لے لی
سو محسن پھر مجھے اس دل کو دھڑکانا پڑے گا

اشعار

ہوا وہی کہ ستاروں کی چال کج نکلی
مکاں گرا تو مکیں کا ہوا پٹہ منسوخ
مرے سکوت میں سارا جہاں ملوث تھا
سو میری چیخ بھی سارے جہاں تک پہنچی
اپنے ہی خدوخال کو پہچانتے نہیں
لوگوں نے آئینے کو تماشا بنا لیا

تعبیروں کی افزائش تک
خواب پرانا ہو جاتا ہے
ٹوٹنا مت چاہے ٹوٹ جاؤ تو
ٹوٹنے کا ملال مت کرنا
یہ زندگی تو کم ہے ترے انتظار کو
اک اور زندگی کی ضرورت الگ سے ہے
روٹی باسی ہو جانے سے
ہر غم تازہ ہو جاتا ہے

حکیم طالب احمد

حکیم طالب احمد کا وطن ہمدان تھا جو کبھی ایران کا دارالخلافہ تھا۔ آپ کے بزرگ نادر شاہ بادشاہ کے ہمراہ دہلی آئے اور بلاں محل کے قریب ایک بڑی حویلی میں مقیم ہوئے۔ حکیم صاحب کے والد حکیم غلام مولیٰ بخش قلق تھے۔ قلق صاحب دیوان شاعر اور مرزا غالب کے شاگرد تھے۔ ایک ممتاز حکیم کی حیثیت سے ان کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ انہوں نے ترکِ سکونت کر کے میرٹھ میں رہائش اختیار کر لی تھی اور ادبی دنیا میں قلق میرٹھی کے نام سے شہرت حاصل کی۔

حکیم طالب احمد صاحب میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے دہلی گئے اور دہلی میں ہی سکونت اختیار کی۔ شہزادہ والی اسکول دہلی میں تعلیم پائی۔ بعد میں بی۔ اے کیا اور محکمہ ریلوے میں گارڈ مقرر ہوئے مگر ملازمت کا سلسلہ زیادہ نہ چل سکا۔ وہاں سے علیحدہ ہو کر حکیم علی رضا دہلوی سے حکمت سیکھی اور اسی دوران خلافت کی تحریک میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ ۱۹۲۰ء میں حکیم علی رضا صاحب کے اصرار پر کوچہ چیلان میں ایک مطب "قومی دواخانہ" کے نام سے قائم کیا۔ جس کا افتتاح حکیم اجمل خاں صاحب کے دست مبارک سے ہوا۔ دواخانہ کی مصروفیات کے ساتھ قومی کاموں میں بھی دلچسپی لیتے تھے۔ حکیم طالب احمد صاحب کانگریس میں بھی رہے۔ سرسید احمد خاں کے تعلیمی کاموں کے بڑے مداح تھے۔ علی گڑھ یونی ورسٹی کی تعمیر میں آپ نے کافی جدوجہد کی۔ یوں کہئے کہ حکیم موصوف کی ساری زندگی سیاست، حکمت اور خدمت میں گذری۔

حکیم طالب احمد صاحب کا رجحان دین کی طرف کافی تھا۔ ۱۹۱۸ء میں مولانا محمدی شاہ الہ آبادی چشتی نظامی کے مرید ہوئے۔ اس کے بعد خواجہ حسن نظامی صاحب سے بیعت کی۔ آپ حزب البحر اور بسم اللہ وغیرہ کے عامل تھے۔

ڈاکٹر انصاری، مفتی کفایت اللہ، حکیم اجمل خاں، مولانا احمد سعید، مولانا سید احمد، آصف علی، مولوی شرف الحق، لالہ دیش بندھو گپتا اور لالہ شنکر سے حکیم صاحب کے خصوصی تعلقات تھے۔

حکیم طالب صاحب اپنے چند عزیزوں کے ساتھ نوجوانی میں بھوپال گئے، وہاں نواب شاہجہاں بیگم والی بھوپال تک رسائی ہوئی۔ انہوں نے حکیم صاحب کی اپنی عزیزہ فاطمہ بی بنت واصل محمد خاں جاگیردار بھوپال سے شادی کرا دی۔ فاطمہ بی کو زندگی بھر بھوپال سے وظیفہ ملتا رہا اور آخری عمر ۱۹۵۰ء تک جاری رہا۔ حکیم صاحب کی اولاد میں پانچ فرزند مطلوب احمد، محبوب احمد، مرغوب احمد، منظور احمد اور مشتاق احمد اور دو صاحبزادیاں کلثوم بی اور حاجرہ بی ہوئیں۔ مطلوب احمد اور مرغوب احمد صاحبان نے پاکستان ہجرت کی۔

دلی کی یادگار ہستیاں، ص ۲۴۳ تا ۲۴۶

طالب، حامد خاں

طالب سردھنوی

حامد خاں شعری دنیا میں طالب سردھنوی کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ آپ کے نانا ولایت خاں عرف بلّو خاں سردھنہ کے سب سے بڑے زمیندار تھے۔ ان کی ایک ہی بیٹی تھی جس کی شادی انھوں نے اپنے بھانجے عبدالحمید خاں سے کی۔ عبدالحمید خاں کے والد نعت خاں قصبہ منصور پور ضلع مظفر نگر کے رہنے والے تھے۔ عبدالحمید خاں نے شادی کے بعد اپنے خسر کے املاک کی دیکھ بھال کی غرض سے سردھنہ ہی میں رہائش اختیار کر لی تھی۔ یہیں طالب صاحب کی ولادت ہوئی۔

طالب صاحب نے ابتدائی تعلیم سردھنہ میں حاصل کی پھر میرٹھ کے اسکول میں داخل ہوئے۔ اسی دوران پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔ اپنے افرادِ خاندان کے ساتھ ۱۹۵۵ء میں پاکستان آئے اور یہاں عملی زندگی کا آغاز ہوا۔ تعلیم کی طرف بھی متوجہ ہے اور کراچی یونیورسٹی سے گریجویشن کرنے کے بعد اردو میں ایم۔اے کیا۔

طالب صاحب بتاتے ہیں کہ سردھنہ میں شعر و شاعری کا بہت زور تھا۔ ماہانہ طرحی مشاعرے پابندی سے ہوتے تھے جن میں قرب و جوار کے شعرا بھی کثرت سے شریک ہوتے تھے۔ انہیں مشاعروں نے غیر محسوس طریقے سے شعر گوئی کی طرف راغب کیا اور خود بھی شعر کہنے لگے۔ میرٹھ میں ندرت میرٹھی اور ہشیار میرٹھی جیسے اساتذۂ فن کی صحبتیں میسر آئیں جنہوں نے ذوقِ سخن میں نکھار پیدا کیا۔ بی۔اے کی تعلیم کے دوران اپنے استاد حکیم اسرار احمد کریوی کی ہدایت پر ریڈیو پاکستان کے ہفتۂ طلبہ کے موقع پر مشاعرے میں شریک ہوئے اور پہلا انعام حاصل کیا۔ اسی سال کراچی کے دوسرے کالجوں کے طلبہ کے مشاعروں میں شرکت کی اور ہر مشاعرے میں پہلا یا دوسرا انعام حاصل کر کے سب سے زیادہ انعام حاصل کرنے والے طالب علم شاعر قرار پائے اور جب یہ سلسلہ بڑھا تو کل پاکستان مشاعروں تک پہنچا۔ موصوف مختلف اصناف میں طبع آزمائی کرتے ہیں مگر غزل محبوب ہے۔

طالب صاحب قومی فضائی کمپنی پی۔آئی۔اے سے متعلق رہے۔ کئی ممالک میں فرائض ادا کئے اور ریٹائر ہونے کے بعد گزشتہ دس سال سے نیدرلینڈ میں مقیم ہیں۔ یہیں آپ کی اکلوتی بیٹی ترنم لعین کنول بھی ہیں جن کی شادی ان کے کزن محمد عظیم خاں سے ہوئی ہے۔ آپ کی اہلیہ کا تعلق بھوپال سے ہے۔ نمونۂ کلام:

غزل

دل میں عشق کا شعلہ بونے والا میں — پتہ نہ تھا کہ راکھ تھا ہونے والا میں
رات گئے تک ہیر کہانی سنتا ہوں — شام سے چادر تان کے سونے والا میں
دن بھر سورج سر پہ اٹھائے پھرتا ہوں — جگنو پکڑ کر خوف سے رونے والا میں
اونچے منڈیرے پنکھ سکھانے والی دھوپ — شبنم شبنم پنکھ بھگونے والا میں
گئے دنوں کا لمحہ لمحہ یاد کروں — گئے دنوں کو پا کر کھونے والا میں

متفرق اشعار

شعلے سے جگنو بن جانا کیسا ہے — اس کے آنچل میں چھپ جانا کیسا ہے
سونا چاندی بونے والے کیا جانیں — صحرا میں اک پیڑ لگانا کیسا ہے
گھر میں ہم روشنی اور تازہ ہوا رکھتے تھے — وہ بھی کیا دن تھے کہ دروازہ کھلا رکھتے تھے
بام و در کو مرے تعاقب میں — گھر سے نکلے ہوئے برس بیتے
ابھی پہلو سے اٹھ کر جو گیا ہے — اندھیروں میں اجالے بو گیا ہے
وہ اک آنسو جو چھلکے پھر ٹکا — سنا ہے وہ ستارا ہو گیا ہے
لذتیں وصل کی نصیب کہاں — قربِ دنیا کا فاصلہ ہے ابھی

کھیتوں پہ جب آس کا پنچھی پھر روپ بکھرائے ہے
سپنوں سے بوجھل انکھیوں میں سرسوں سی لہرائے ہے
برکھا رت کے اک چھینٹے سے گاؤں سارا مہک اٹھا
کچے گھروں کی سوندھی خوشبو تیری یاد دلائے ہے

بے برگ و بار کر گئیں اس کو ہوائیں
تلسی کا ایک پیڑ تھا میرے مکان میں
غالبؔ لہو میں ڈوب گئی بیسویں صلیب
اک فاختہ بھٹکتی رہی سائبان میں

"عازمین حج کو الوداع کہنے کے بعد"

اب کے برس بھی بچھڑے من کے روتے رہ گئے نین سکھی
اب کے برس بھی گاؤں والے پریم نگر کی اور گئے
پریم نگر جانے والوں کو دور تلک تکتے ہی رہے
آؤ چل کر ہاتھ دکھائیں آؤ برہمن پاس چلیں
ان دیکھی من موہنی صورت من مندر کی شوبھا ہے

اب کے برس بھی من دکھیاری کرتی رہ گئی بین سکھی
اب کے بھی شہر مکھ کے مالک لوٹ کے لیکھے چھین سکھی
پھر بیری یادوں سے لپٹ کروٹ کے رہے نین سکھی
میرے ہاتھ کی ریکھاؤں میں ہے کہیں سکھ چین سکھی
صلِ علیٰ کی مالا جپتے بیتے ہیں ان رین سکھی

میر عابد حسین

میر عابد حسین نے ریاست بہاولپور میں قابلِ ذکر خدمات انجام دیں۔ آپ مسلم لیگ کے سرکردہ رہنما اور تحریکِ پاکستان کے پرجوش کارکن تھے۔ آپ کا اصل وطن میرٹھ تھا۔ ۱۸۹۸ء میں مالیر کوٹلہ میں آپ کی ولادت ہوئی۔ سادات خاندانوں سے تعلق تھا۔ میر صاحب کے دادا مولانا میر محمد یامین مالیر کوٹلہ کے وزیرِ اعظم تھے۔ والد میر محمد یاسین حکومتِ پنجاب میں افسرِ مالیات تھے۔ وہ ۱۹۱۳ء میں ریاست بہاولپور میں آباد ہو گئے تھے۔ یہاں نئی زمینیں آباد کیں اور محکمہ ریلوے میں ٹھیکیدار رہے۔

الحاج میر عابد حسین پنجاب یونیورسٹی کے اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ کئی زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ ۱۹۳۸ء میں آپ کی خدمات کے صلہ میں امیر بہاولپور نے آپ کو "امتیاز بہاولپور" کے ایوارڈ سے نوازا تھا۔ مجلس بہاولپور کے نامزد رکن تھے۔ ۱۹۳۹ء میں مرکزی رورل بورڈ کے رکن مقرر ہوئے۔ میر عابد حسین نے ریاست میں مسلم لیگ کو فعال و مقبول بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ۱۹۳۸ء میں نئی مسلم لیگ صادق آباد کے صدر منتخب ہوئے۔ قیامِ پاکستان کے بعد مہاجرین کی آباد کاری کے لئے مقدور بھر حصہ لیا۔ سرکاری امداد کے بغیر مہاجرین کی بحالی کے لئے ۲۰۰ مکانات پر مشتمل ایک "مہاجر کالونی" صادق آباد میں آباد کی۔

میر عابد حسین صاحب کے فرزند میر زاہد حسین نے خاندانی روایات کو قائم رکھا۔ ان کا قائم کردہ "بیت الحکمت" بہاولپور کی مرکزی لائبریری کے بعد پورے بہاولپور ڈویژن کا سب سے بڑا کتب خانہ ہے۔ یہ ہر اعتبار سے معیاری اور اہلِ علم کے لئے قابلِ دید ہے۔

انسائیکلوپیڈیا پاکستانیکا ص ۱۶۰، ۱۶۱

مولانا شاہ محمد عارف اللہ قادری

مولانا شاہ محمد عارف اللہ قادری بن مولانا حکیم شاہ محمد حبیب اللہ قادری رضوی (۱۸۸۷ء…۱۹۳۸ء) بن مولانا شاہ محمد عظیم اللہ (م۔ ۱۹۲۳ء) کی ولادت ۱۳ شوال المکرم ۱۳۲۷ھ کے مطابق ۲۹ اکتوبر ۱۹۰۹ء بروز جمعہ میرٹھ میں ہوئی۔

مولانا محمد عارف اللہ قادری نے ابتدائی تعلیم مدرسہ امداد الاسلام صدر میرٹھ، مدرسہ قومیہ عربیہ اور انتہائی کتب میرٹھ کی قدیم درس گاہ مدرسہ اسلامیہ عربیہ میں پڑھیں۔ ۲۵ نومبر ۱۹۳۳ء کو آپ کی دستار بندی ہوئی۔ بعد ازاں عربی، فارسی اور انگریزی کے امتحانات الٰہ آباد یونیورسٹی سے پاس کئے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنے والد کے حکم پر جامع مسجد خیر المساجد میرٹھ میں خطابت کے فرائض انجام دینے لگے۔ تبلیغی دورے کئے اور اسلام کی دعوت دی۔ فن تقریر مولانا شاہ عبد العلیم صدیقی میرٹھی سے سیکھا اور جلد ہی ایک نامور مقرر کی حیثیت سے پہچانے جانے لگے۔ آپ شہر کے متعدد اداروں کے سرپرست اور رکن بن گئے۔

۱۳۵۱ھ مطابق ۱۹۳۲ء میں حضرت شاہ علی حسین کچھوچھوی (۱۸۵۰ء…۱۹۳۶ء) کے دست حق پرست پر بیعت کر کے تاج خلافت حاصل کیا۔ حضرت مولانا شاہ احمد رضا خان بریلویؒ (۱۸۵۶ء…۱۹۲۱ء) کے فیوض و برکات سے بہرہ ور ہونے کے لئے ۱۹۳۰ء میں والد گرامیؒ کے ہاتھ پر بیعت کر کے تمام رضوی اوراد و معمولات کی اجازت پائی۔

مولانا عارف اللہ شاہ نے تحریک پاکستان میں بھرپور طریقے سے حصہ لیا۔ مسلم لیگ کا پیغام ہر فرد تک پہنچانے کے لئے ۱۹۴۵ء میں میرٹھ میں سنی کانفرنس کا اہتمام کیا۔ ۱۲ دسمبر ۱۹۴۵ء کو بمبئی میں مسلم لیگ کی حمایت میں ایک کانفرنس کی صدارت کی۔ نواب محمد اسمٰعیل خاں کی زیر قیادت شہری مسلم لیگ پولیٹیکل کانفرنس میرٹھ منعقدہ ۳۱ دسمبر ۱۹۴۵ء تا ۲ جنوری ۱۹۴۶ء کو مجلس استقبالیہ کے صدر کی حیثیت سے تاریخی اہمیت کا خطبہ پڑھا جس میں آپ نے ۱۸۵۷ء سے تحریک پاکستان تک مسلمانوں کی جدوجہد آزادی پر اظہار خیال کیا۔ ۱۹۴۶ء میں آل انڈیا سنی کانفرنس منعقدہ بنارس کی کامیابی کے لئے ہندوستان کے مختلف اور دور دراز صوبوں کا دورہ کیا۔

۱۹۴۶ء پہلی مرتبہ حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔ جب واپس پہنچے تو معلوم ہوا کہ مسلم لیگ کے سرگرم رکن ہونے کے جرم میں گرفتاری کا حکم ہو چکا ہے۔ اطلاع ملتے ہی دہلی پہنچے اور براستہ بمبئی بحری

جہاز سے ۱۹۵۰ء میں پاکستان آ گئے۔ کچھ عرصہ کراچی اور خوشاب میں رہنے کے بعد مستقل طور پر راولپنڈی میں رہائش پذیر ہو گئے۔

راولپنڈی میں خطابت کا سلسلہ شروع کیا اور ملک بھر میں تبلیغی دورے بھی کرتے رہے۔ ۱۹۵۱ء میں جمعیت علمائے پاکستان راولپنڈی کے صدر منتخب ہوئے اور تازیست اس عہدے پر فائز رہے۔ "دار العلوم احسن البرکات" کا اجراء کیا۔ مارچ ۱۹۵۳ء میں ماہنامہ "سالک" جاری کیا جو بارہ سال تک دین و ملت کی خدمت کرتا رہا۔

۱۹۵۳ء اور ۱۹۷۴ء کی تحریک ختم نبوت میں جرأت مندانہ کردار ادا کیا۔ قید و بند کی صعوبتوں کا بھی مقابلہ کیا۔ ۱۹۵۹ء میں مارشل لاء کے نفاذ کے بعد اس وقت کے ڈپٹی کمشنر ایم۔ بی۔ اعوان ملک کے نامناسب رویے کی بنا پر مرکزی جامع مسجد راولپنڈی کی خطابت سے مستعفی ہو گئے۔ ملک کے طول و عرض سے خطابت کی پیش کشیں ہوئیں لیکن آپ نے بہ اصرار جامع مسجد واہ فیکٹری میں خطابت منظور کی جو آخر دم تک جاری رہی۔ ۱۹۶۵ء میں مجاہدین کشمیر اور متاثرین کے لئے امدادی سرگرمیوں میں حصہ لیا۔

اندرون ملک دوروں کے علاوہ مولانا عارف اللہ شاہ نے بیرون ملک بھی تبلیغی دورے کئے۔ ۱۹۶۸ء میں بغداد، نجف اشرف، کربلا اور کاظمین سے ہوتے ہوئے برطانیہ پہنچے۔ وہاں آٹھ ماہ قیام کیا۔ پورے ملک میں خطاب کیا اور لاتعداد عیسائیوں نے آپ کے دست حق پرست پر اسلام قبول کیا۔

۱۹۷۷ء کے عام انتخابات کے نتیجے میں "تحریک نظام مصطفیٰ" شروع ہوئی تو مولانا نے اس میں نمایاں حصہ لیا۔ اسی سال جنرل ضیاء الحق کی مارشل لاء حکومت نے آپ کو رویت ہلال کمیٹی کا چیئرمین مقرر کیا۔

مذہب و ملت کی خدمت کرتے ہوئے ۳۰ ربیع الاول ۱۳۹۹ھ مطابق ۲۸ فروری ۱۹۷۹ء بروز بدھ راولپنڈی میں آپ نے انتقال کیا۔ نماز جنازہ مفتی عبد القیوم ہزاروی نے پڑھائی۔ حضرت صابر براری نے قطعۂ تاریخ وفات کہا:

رخصت ہوئے جہاں سے جادو بیاں مقرر
مظلوم اس لئے ہیں یہ ۱ جوان گئے

تھا عالمانِ دیں میں اعلیٰ مقام ان کا
تھی منفرد جہاں میں حضرت کی شان گئے

گزری ہے عمر ان کی تبلیغ دین حق میں
دین مبیں کا ان کو روشن جہان گئے

وہ ہر جگہ ہماری کرتے تھے پیشوائی
حضرت کو اہلِ حق کا اک ترجمان گئے

صابر اگر ہے فکر تاریخ سالِ رحلت
" مولانا عارف اللہ جنت نشان گئے "

۱۳۹۹ھ

ماخذ: تحریک پاکستان اور علماء کرام ص ۳۰۳ تا ۳۰۸، تاریخ رفتگاں ص ۱۸۸، ۱۹۹

عائشہ خان

عائشہ خان

جانی پہچانی ٹی۔وی اداکارہ عائشہ خان ۳ جنوری ۱۹۴۱ء کو شاہجہانپور ضلع میرٹھ میں پیدا ہوئیں۔ آپ اعلیٰ پولیس افسر ریاست اللہ خان کی صاحبزادی ہیں۔ سات بہنیں اور دو بھائی ہیں۔ معروف ٹیلی ویژن اداکارہ خالدہ ریاست سب سے چھوٹی بہن تھیں۔

عائشہ خان کے والدین نے ۱۹۴۸ء میں پاکستان ہجرت کرتے ہوئے کراچی میں رہائش اختیار کی۔ آپ نے کراچی یونیورسٹی سے اردو آنرز ۱۹۶۳ء میں کیا۔ اسی سال آپ کی شادی وجاہت لطیف صاحب سے ہوئی۔ آپ کی اولاد میں دو بیٹے افضل لطیف اور احمد لطیف اور ایک بیٹی عالیہ لطیف اویس ہیں۔ افضل لطیف صاحب ڈپٹی کمشنر پشاور بھی رہے ہیں۔ احمد لطیف صاحب ایک بنک میں سینیئر اکاؤنٹنٹ ہیں، انہوں نے برطانیہ سے ایم۔بی۔اے کیا ہے۔

عائشہ خان نے بزم طلباء ریڈیو پاکستان سے ۱۹۶۹ء میں اپنی سرگرمیوں کا آغاز کیا اور اسی سال ٹیلی ویژن کے ڈرامے "گڑیا گھر" میں کام کیا۔ اس کے پروڈیوسر ظہیر بھٹی تھے۔ جب سے آج تک لاتعداد ڈراموں میں حصہ لے چکی ہیں۔ طویل دورانیے کے ڈراموں میں بھی عائشہ خان نے یادگار کردار ادا کیا ہے۔ ڈرامہ سیریل افشاں، "آنچ" اور "شام سے پہلے" میں عائشہ خان کی اداکاری بیحد پسند کی گئی۔ آپ مختصر کہانی نویس بھی ہیں۔ آپ کی تحریر کردہ کہانیوں کو بھی پذیرائی حاصل ہوئی ہے۔ طبیعت میں مشرقی رنگ نمایاں ہے۔ فطرتاً "متواضع، خوش اخلاق، محنتی اور قدردانِ علم و فن ہیں۔ کتب بینی بھی مشاغل میں شامل ہے۔ خودنمائی کو پسند نہیں کرتی۔ والدین کی تربیت نے آپ کی شخصیت کی تعمیر میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ اسی لئے اپنے والدین سے گہری عقیدت و محبت رکھتی ہیں۔

حافظ عبدالرحیم خان

حافظ محمد عبدالرحیم خاں

حافظ عبدالرحیم خان اپنے والد حافظ غلام رسول خان کے اکلوتے بیٹے تھے لہٰذا تمام جائیداد کے تنہا وارث ہوئے۔ ان کی تین بہنیں واصلہ، سائرہ اور کلثوم تھیں۔ ۱۸۸۱ء میں ان کی بہن سائرہ نے اپنے شرعی حصہ کا دعویٰ دائر کر دیا۔ اس زمانے میں لڑکیوں کے ترکہ پدری میں حصہ لینے کا رواج بہت کم تھا۔ اس لئے حافظ عبدالرحیم خان کو خلافِ توقع اس دعویٰ کا دائر ہونا نہایت شاق گزرا۔ خوب مقدمہ بازی ہوئی۔ الہ آباد ہائی کورٹ تک معاملہ گیا۔ ان کی بہن سائرہ کو کامیابی حاصل ہوئی۔ ان کا پورا دعویٰ مع خرچہ و واصلات منظور ہوا۔ جس کی وجہ سے حافظ عبدالرحیم خاں کافی زیربار ہوئے اور مقروض بھی ہو گئے۔

حافظ عبدالرحیم خان عربی اور فارسی کے عالم و فاضل تھے۔ انہیں فقراء و صلحاء سے ملنے کا بھی بہت شوق تھا۔ صوفیاء کرام کی بہت عزت کرتے تھے۔ علمِ طب میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے۔ سینکڑوں روپے کی ادویات خرید کر مریضوں میں مفت تقسیم کر دیا کرتے تھے۔ مزاج میں مروت بھی بہت تھی اور فقیر بھی درجہ کمال تھے۔ کوئی سائل ان کے پاس سے خالی ہاتھ نہ جاتا تھا۔ انہوں نے بہادر گڑھ کے لوگوں کی خرید و فروخت میں آسانی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ایک بازار بھی تعمیر کرایا۔ رفاہِ عام کو سامنے رکھتے ہوئے ایک وسیع مدرسہ مع بورڈنگ ہاؤس بنوایا اور اس میں اردو کا مڈل اسکول قائم کیا۔ یعنی کارہائے خیر کی انجام دہی اور مخلوقِ خدا کی فائدہ رسانی ان کا خاص مشغلہ تھا۔ بہادر گڑھ کے قدیم بازار میں مسجد نہ ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کو بڑی پریشانی ہوتی تھی۔ حافظ صاحب نے وہاں ایک چھوٹی خوشنما مسجد بنوائی جس کے بیچ کے در کی محراب کے باہر کی طرف پتھر پر یہ کتبہ نصب ہے:

بانیٔ این چشمۂ فیض است از فضلِ کریم
خانِ عالی طبع محسن مولوی عبدالرحیم

۱۲۹۳ء

عمر کے آخری حصے میں ایک عالی شان پختہ مکان کوٹھی کے نمونہ کا تعمیر کرا رہے تھے کہ وقتِ اجل آپہنچا۔ ۱۶ مارچ ۱۹۱۰ء کو ریل کے سفر کے دوران موضع کھیدر کے اسٹیشن پر ان کا انتقال ہوا۔ اس وقت ان کی عمر ستاون سال تھی۔ تدفین بہادر گڑھ کے خاندانی قبرستان میں ہوئی۔

حافظ عبد الرحیم خان کی اولاد میں چار لڑکے محمد عبید اللہ خان، محمد انعام اللہ خان، محمد ولی اللہ خان اور محمد احسان اللہ خان تھے محمد عبید اللہ خان نے "یادگارِ سلف" مرتب کی۔ یہ کتاب چوتھی بار ۱۹۳۹ء میں بلند شہر سے شائع ہوئی ہے۔

محمد ولی اللہ خاں

محمد عبیداللہ خاں

یادگارِ سلف ص ۱۱ تا ۱۵

عبدالوحید خاں

مورخ، محقق، مصنف اور معروف سیاستداں عبدالوحید خاں کی ولادت ۱۹۰۳ء میں میرٹھ میں ہوئی۔ آپ نے لکھنؤ یونیورسٹی سے بی۔اے کیا۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد عملی سیاست میں حصہ لینے لگے۔ ۱۹۳۸ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے رکن منتخب ہوئے۔ یو۔پی کی صوبائی مسلم لیگ کے جوائنٹ سیکریٹری اور پبلسٹی سیکریٹری مقرر ہوئے۔ مسلم لیگ کو فعال بنانے کے لئے سرگرمی سے کام کیا۔ قیام پاکستان کے بعد ہجرت کرکے لاہور آئے۔ ۱۹۴۸ء میں مہاجرین کے نمائندے کے طور پر پاکستان کی پہلی آئین ساز اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ صدر محمد ایوب خان کے مارشل لاء کے نفاذ تک اس عہدے پر فائز رہے۔ ۱۹۵۱ء کے عام انتخابات میں پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ جولائی ۱۹۶۲ء میں مغربی پاکستان کی کابینہ میں شامل ہو گئے اور ریلوے کا محکمہ آپ کے سپرد کیا گیا۔ اس کے بعد مرکزی کابینہ میں وزیر اطلاعات و نشریات مقرر کیا گیا۔ کونشن مسلم لیگ کے جنرل سیکریٹری بھی رہے۔ ۱۹۶۵ء کے صدارتی انتخابات کے بعد وزارت اور سیکریٹری شپ دونوں سے الگ کر دیئے گئے۔

سیاسی زندگی میں سرگرمی سے حصہ لینے کے باوجود خان صاحب نے قلم سے رشتہ قائم رکھا۔ آپ کی تحقیق کا خاص موضوع مطالعہ پاکستان تھا۔ آپ کی پہلی تصنیف "آزادی کی جھڑپ" تھی جسے آپ نے ۱۹۳۷ء کے آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس لکھنؤ میں پیش کیا۔ اس اہم تصنیف کے بنگلہ اور گجراتی زبانوں میں ترجمے بھی ہوئے۔ گجراتی ایڈیشن کا پیش لفظ قائداعظم نے لکھا تھا۔ آپ کی دوسری کتاب "تاریخ افکار و سیاست اسلامی" کے نام سے ۱۹۴۳ء میں شائع ہوئی۔ عبدالوحید خاں صاحب کی مشہور کتاب "آزادیٔ ہند دوسرا رخ" ہے جو مولانا ابوالکلام آزاد کی کتاب "آزادیٔ ہند" کے جواب میں لکھی گئی تھی۔

عبدالوحید خاں صاحب کی خدمات کے اعتراف میں حکومت پنجاب نے ۱۹۸۸ء میں "تحریک پاکستان گولڈ میڈل" سے نوازا۔

انسائیکلوپیڈیا پاکستانیکا، ص ۶۷۱

عزیز النساء بیگم

برصغیر پاک و ہند کی نامور اور تاریخ ساز شخصیت سرسید احمد خاں (م۔۱۸۹۸ء) کی والدہ عزیز النساء بیگم ایک دور اندیش مشرقی خاتون تھیں۔ آپ کے والد نواب دبیر الدولہ امین الملک خواجہ فرید الدین احمد بہادر شاہ ظفر کے دربار کے ایک نہایت معزز رکن تھے۔ آپ کے شوہر کا نام میر تقی تھا۔ اپنے والدین کی سب سے بڑی بیٹی تھیں۔ آپ نے قرآن مجید اور فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھی ہوئی تھیں لیکن طالب ہاشمی صاحب کے مطابق نہایت ذہین' روشن دماغ' دانش مند' سلیقہ شعار' رحم دل' بااخلاق اور نیک سرشت بی بی تھیں۔ انہوں نے اپنے بچوں کی تربیت بھی نہایت عمدگی سے کی اور ہمیشہ یہ مقصد پیش نظر رکھا کہ وہ بڑے ہو کر نیک اور سچے مسلمان بنیں۔

سرسید احمد خاں کو اپنے بچپن کے واقعات خوب یاد تھے۔ وہ بتاتے تھے کہ فارسی کی ابتدائی تعلیم میں نے اپنی والدہ سے حاصل کی۔ انہوں نے مجھے گلستان اور فارسی کی دوسری ابتدائی کتابیں پڑھائیں۔ والدہ نے مجھے بچپن میں بہت سے مفید اور اخلاقی سبق دیئے جو اب تک میرے ذہن پر نقش ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"جس زمانے میں میری عمر گیارہ برس کی تھی' میں نے ایک نوکر کو جو بہت بڈھا اور پرانا تھا' کسی بات پر تھپڑ مارا۔ جس وقت میری والدہ کو خبر ہوئی اور تھوڑی دیر بعد میں گھر گیا تو میری والدہ نے ناراض ہو کر کہا کہ اس کو نکال دو' جہاں اس کا جی چاہے چلا جائے۔ یہ گھر میں رہنے کے قابل نہیں رہا۔ چنانچہ ایک ماما میرا ہاتھ پکڑ کر گھر سے باہر لے گئی اور باہر سڑک پر چھوڑ دیا۔ اسی وقت ایک دوسری ماما میری خالہ کے گھر سے جو قریب تھا' نکلی اور مجھ کو میری خالہ کے گھر لے گئی۔ میری خالہ نے کہا' دیکھو تمہاری والدہ تم سے کس قدر ناراض ہیں اور اس سبب سے جو تم کو گھر میں رکھے گا' اس سے بھی خفا ہوں گی مگر میں تم کو چھپائے رکھتی ہوں اور کوٹھے پر ایک مکان میں چھپا دیا۔ تین دن میں اس کوٹھے پر چھپا رہا' میری خالہ میرے سامنے نوکروں اور ماماؤں سے کہتیں کہ دیکھنا" آپا جی کو خبر نہ ہو کہ یہاں چھپے ہوئے ہیں۔ تین دن کے بعد میری خالہ میری والدہ کے پاس قصور معاف کرانے کے واسطے لے گئیں۔ انہوں نے کہا کہ اگر اس نوکر سے معاف کرائے تو میں معاف کروں گی اور نوکر کو ڈیوڑھی میں بلایا گیا۔ میں نے اس کے آگے ہاتھ جوڑے تب تقصیر معاف ہوئی۔"

محترمہ عزیز النساء کے بچے بڑے ہو گئے تب بھی انہوں نے ہمیشہ ان کے اخلاق و کردار پر نظر رکھی۔ اگر ان کے طرز عمل میں کوئی خامی دیکھتیں تو اس کی اصلاح کرنے کی کوشش کرتیں اور ہمیشہ نصیحتیں

کرتی رہتیں۔ اس کی ایک جھلک ایک واقعہ میں دیکھئے۔ سرسید احمد خاں کا اپنے ایک دوست سے بہت میل جول تھا۔ دونوں کی گھروں میں آمدورفت تھی۔ ایک دفعہ وہ دوست ناراض ہو گئے اور سرسید کے ہاں آنا جانا چھوڑ دیا۔ سرسید کچھ عرصہ ان کے یہاں جاتے رہے لیکن پھر انہوں نے بھی جانا چھوڑ دیا۔ ان کی والدہ کو خبر ہوئی تو انہوں نے اس کا سبب پوچھا۔ سرسید نے واقعہ بیان کیا تو انہوں نے کہا کہ "نہایت افسوس ہے کہ جس بات کو تم اچھا نہیں سمجھتے وہی بات تم بھی کرتے ہو۔ جب دوستی ہے تو اسے پورا کرنا چاہئے۔ یہ تمہارا فرض ہے اور اس دوستی کا پورا برتاؤ کرنا اس کا فرض ہے۔ تم دوسرے شخص کے فرض ادا کرنے کے ذمہ دار کیوں ہوتے ہو۔ تم کو بدستور اپنا فرض ادا کرنا چاہئے' اس سے تم کو کیا کہ دوسرا بھی اپنا فرض ادا کرتا ہے یا نہیں۔

ایک اور دفعہ ایک ایسا شخص جس پر بھی سرسید احمد خاں نے بہت احسان کیا تھا' اس نے محسن کشی کرتے ہوئے نیکی کا بدلہ بدی سے دیا۔ اتفاق سے وہ تمام ثبوت سرسید کے ہاتھ آ گئے جو اس کو عدالت سے سخت سزا دلا سکتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اس سے انتقام لینے کا ارادہ کر لیا۔ ان کی والدہ کو معلوم ہوا تو انہوں نے بلا کر کہا "بیٹے اگر تم اس کو معاف کر دو تو یہ ایک احسن عمل ہو گا۔ اگر تم اس کو اس کی بداعمالی کی سزا حاکم سے دلوانا چاہتے ہو تو یہ بڑی نادانی کی بات ہے۔ آخر تم اس کو ہر نیکی کا بدلہ دینے والے احکم الحاکمین کی گرفت سے چھڑا کر دنیا کے ضعیف حاکموں کے پنجے میں کیوں دینا چاہتے ہو؟" سرسید کہتے ہیں کہ والدہ کی اس نصیحت نے میرے دل پر بڑا اثر کیا اور میں نے اس شخص سے انتقام لینے کا خیال چھوڑ دیا۔ یہی نہیں اس کے بعد بھی کسی شخص سے بدلہ لینے کا خیال کبھی میرے دل میں پیدا نہیں ہوا اگرچہ اس نے میرے ساتھ کیسی ہی برائی کیوں نہ کی ہو۔

عزیز النساء بیگم ایک دور اندیش خاتون تھیں۔ مسائل کا باریک بینی سے جائزہ لیتی تھیں اور جذباتی یا وقتی فیصلے نہیں کرتی تھیں۔ ان کے والد دبیر الدولہ خواجہ فرید الدین نے وزارت سے استعفیٰ دیا تو کچھ عرصے بعد پنجاب کے حکمراں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے لاہور سے اپنے ایک معتمد کو تیس ہزار روپے دے کر ان کے پاس دلی بھیجا کہ یہ رقم سفر خرچ کے طور پر قبول کر لیں اور لاہور آ کر اس کے دربار سے وابستہ ہو جائیں۔ خواجہ صاحب کے تمام احباب اور عزیز و اقارب کی خواہش تھی کہ وہ مہاراجہ کی پیش کش قبول کر لیں۔ خود خواجہ صاحب بھی یہی رائے رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنی بیٹی عزیز النساء سے مشورہ کیا تو انہوں نے اس کے خلاف رائے دی اور کہا کہ آپ کے پاس اللہ کا دیا بہت کچھ ہے جس سے آپ باقی ماندہ زندگی نہایت آرام اور راحت سے گزار سکتے ہیں۔ یہ بات خلاف مصلحت معلوم ہوتی ہے کہ آپ لاہور جا کر رنجیت سنگھ کی حکومت کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لیں اور ہم سب انگریز کی عمل داری میں رہیں۔ معلوم نہیں کل حالات کیا رخ اختیار کریں۔ دوسرے یہ کہ آپ کے بڑھاپے کا زمانہ ہے۔ بہتر یہی ہے کہ آپ یہیں رہیں۔ خواجہ صاحب کا اپنی بیٹی کی باتوں کا ایسا اثر ہوا کہ انہوں نے مہاراجہ کی پیش کش قبول کرنے سے معذرت کر لی اور رقم واپس بھیج دی۔

محترمہ نہایت رحم دل تھیں۔ جب کسی کو پریشانیوں میں دیکھتیں تو ہر ممکن طریقے سے اس کی مدد کرتیں انہوں نے اپنے مکان کا ایک حصہ غریب اور بے سہارا عورتوں کے رہنے سہنے اور علاج کے لئے وقف کر رکھا تھا۔ جو اپنے لئے پسند کرتیں وہی دوسروں کے لئے۔

عزیز النساء بیگم کا دستِ سخاوت بہت کشادہ تھا لیکن وہ کسی مقصد کے لئے منت یا نیاز نہیں مانتی تھیں۔ نہ ہی تعویز گنڈوں وغیرہ پر ان کا اعتقاد تھا۔ سرسید احمد خاں کا بیان ہے کہ میرے ننھیال والوں کو شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ اور ان کے خاندان سے بڑی عقیدت تھی۔ شاہ صاحب اور ان کے خاندان کے بزرگ لڑکوں کو بعض بیماریوں سے محفوظ رکھنے کے لئے ایک گنڈا دیا کرتے تھے' جس میں ایک تعویز ہوا کرتا تھا۔ اس تعویز میں ایک حرف یا ہندسہ سفید مرغ کے خون سے لکھا جاتا تھا اور جس لڑکے کو پہنایا جاتا تھا اس کو بارہ برس کی عمر تک انڈا یا مرغی کا گوشت کھانے سے منع کیا جاتا تھا۔ سید حامد اور سید محمود میرے دونوں بیٹوں کو بھی ان کی ننھیال والوں نے وہ گنڈا پہنایا مگر میری والدہ کو یہ خیال تھا کہ اس گنڈے کے سبب سے انڈا یا مرغی نہ کھانا اور یہ سمجھنا کہ اگر کھائیں گے تو کوئی آفت آئے گی' خدا پر ایمان رکھنے کے برخلاف ہے۔ وہ دونوں لڑکوں کو جب بھی وہ ان کے ساتھ کھاتے اور کوئی ایسی چیز بھی موجود ہوتی جس میں انڈا پڑا ہو یا مرغی کا سالن یا مرغ پلاؤ ہوتا تو بے تامل ان کو کھلا دیتیں۔"

۱۸۵۷ء میں دلی میں جنگِ آزادی کا آغاز ہوا تو سید صاحب بجنور میں صدر امین تھے لیکن ان کی والدہ اور ایک نابینا خالہ اپنے گھر دلی میں تھیں۔ جب انگریزوں نے دلی کو دوبارہ فتح کیا تو انگریز سپاہی گھروں میں گھس آئے اور لوگوں کا مال و اسباب لوٹ لیا۔ اس دوران عزیز النساء کا گھر بھی نہ بچ سکا اور وہ اپنی بہن کو لے کر زین کی کوٹھڑی میں چلی گئیں اور آٹھ دس روز سخت مصیبت میں گذارے۔ سرسید احمد خان نے اس کا حال اس طرح بیان کیا ہے۔

"اس عرصے میں' میں میرٹھ آگیا تھا۔ میرٹھ سے دہلی پہنچا اور اپنی والدہ کے پاس گیا۔ اس وقت تین دن سے ان کے پاس کھانے کو کچھ نہ تھا۔ گھوڑے کا دانہ کچھ مل گیا' اسی پر بسر کی تھی۔ دو دن سے پانی بھی ختم ہو چکا تھا اور پانی کی نہایت تکلیف تھی۔ میں نے کوٹھڑی کا دروازہ کھٹکھٹایا اور آواز دی۔ انہوں نے دروازہ کھولا۔ پہلا لفظ جو ان کی زبان سے نکلا یہ تھا کہ "ہیں! تم یہاں کیوں آگئے یہاں تو لوگوں کو مار ڈالتے ہیں۔ تم چلے جاؤ' ہم پر جو گزرے گی' گزرے گی۔" میں نے کہا" آپ خاطر جمع رکھئے۔ مجھے کوئی نہیں مارے گا۔ میرے پاس سب حاکموں کی چٹھیاں ہیں اور میں ابھی قلعے سے انگریزوں اور دہلی کے گورنر سے مل کر آیا ہوں۔ ان کی طمانیت ہوئی اور معلوم ہوا کہ دو دن سے مطلق پانی نہیں پیا ہے۔ میں پانی کی تلاش میں نکلا۔ پانی اس طرف کہیں نہیں ملا۔ ناچار پھر قلعے میں گیا اور وہاں سے ایک صراحی پانی لے کر چلا جب اپنے گھر کے قریب بازار میں پہنچا کہ لاوارث بڑھیا سڑک پر بیٹھی ہے اور اس کے ہاتھ میں مٹی کی صراحی اور آب خورہ ہے' اور کسی قدر بدحواس ہے۔ معلوم ہوا کہ وہ پانی کی تلاش میں نکلی تھی۔

تھوڑی دور چل کر بیٹھ گئی اور پھر اٹھا نہ گیا مجھ کو معلوم تھا کہ وہ بھی پیاسی ہے۔ دو دن سے پانی نہیں ملا۔ میں نے اس کے آب خورے میں پانی دیا اور کہا پانی پی لے۔ اس نے کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے آبخورے کا پانی صراحی میں ڈالا اور کچھ گرا دیا اور گھر کی طرف اشارہ کیا اور کچھ کہا جس کا مطلب یہ تھا کہ بیگم صاحب پیاسی ہیں۔ ان کے لئے پانی لے جاؤں گی' اور اسی غرض سے پانی صراحی میں ڈالتی تھی۔ میں نے کہا' میرے پاس پانی بہت ہے۔ میں لے آیا ہوں تو پانی پی لے۔ پھر آبخورے میں پانی دیا اس نے پیا اور لیٹ گئی۔ میں جلدی جلدی گھر کی طرف آیا اور اپنی والدہ اور خالہ کو تھوڑا تھوڑا پانی پینے کو دیا۔ انہوں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اب میں گھر سے نکلا کہ سواری کا بندوبست کر کے ان کو میرٹھ لے جاؤں۔ جب اس مقام پر پہنچا جہاں بڑھیا زمین پر لیٹی ہوئی تھی تو معلوم ہوا کہ وہ مر چکی ہے۔ سارے شہر میں باوجود یہ کہ حکام نے بھی احکام جاری کئے لیکن کہیں سواری نہ ملی۔ آخر کار حکام قلعہ نے اجازت دی کہ شکرم جو سرکاری ڈاک میرٹھ کو لے جاتی ہے۔ مجھ کو دے دی جائے میں وہ شکرم لے کر گھر پر آیا اور اپنی والدہ اور خالہ کو اس میں اٹھا کر میرٹھ لے آیا۔"

میرٹھ پہنچ کر عزیز النساء بیگم بیمار ہو گئیں۔ ایام علالت میں ان کی بیٹی' نواسیاں' پوتے پوتیاں' دیگر عزیز اور بہوئیں جو مختلف مقامات پر چلے گئے تھے' سب میرٹھ پہنچ گئے اور انہوں نے سب کو صحیح سالم دیکھ لیا۔ لیکن وقتِ آخر آ چکا تھا۔ زیادہ دن نہ جی سکیں اور سید صاحب کو ضروری وصیتیں کر کے میرٹھ ہی میں فوت ہو گئیں۔

سرسید کا بیان ہے کہ میری والدہ کی نصیحتیں نہایت حکیمانہ ہوتی تھیں مثلاً" وہ کہتی تھیں کہ مصیبتیں جو انسان پر پڑتی ہیں اس میں کچھ خدا کی مصلحت ہوتی ہے مگر بندے اس کی حکمت کو نہیں سمجھ سکتے۔ اگر کسی نے تمہارے ساتھ نیکی کی ہو اور پھر برائی کرے یا دو دفعہ نیکی کی ہو اور دو دفعہ برائی کرے تو تم کو آزردہ نہ ہونا چاہئے کیونکہ ایک یا دو دفعہ کی نیکی کرنے والا کیسی ہی برائی کرے' اس کی نیکی کے احسان کو بھلایا نہیں جا سکتا۔

وہ فرماتی تھیں کہ جہاں جہاں تم جانا لازمی سمجھتے ہو اور ہر حالت میں تم کو وہاں جانا لازمی ہو گا تم وہاں کبھی سواری پر جایا کرو اور کبھی پیادہ پا۔ زمانے کا کچھ اعتبار نہیں ہے۔ کبھی کچھ ہے اور کبھی کچھ۔ پس ایسی عادت رکھو کہ ہر حالت میں اسے نباہ سکو۔

تاریخ اسلام کی چار سو باکمال خواتین' ص ۵۲۲ تا ۵۲۸' اعلم کراچی۔ اپریل تا جون ۱۹۹۸ء

ڈاکٹر عقیلہ کیانی

پروفیسر ڈاکٹر عقیلہ کیانی

میرٹھ کی متعدد خواتین نے اپنے دور کے تقاضوں کو محسوس کرتے ہوئے اپنے ذمہ دارانہ عمل سے زندگی کو بامقصد بنایا۔ فہم و فراست، دوراندیشی اور تعلیم کی اہمیت و افادیت کو سمجھتے ہوئے تعلیم کے فروغ میں سرگرمی سے حصہ لے کر انہوں نے روشن مثالیں قائم کیں اور ثابت کیا کہ زندگی کا کوئی شعبہ عورت کی دسترس سے باہر نہیں ہے۔ انہیں قابل ذکر خواتین میں ڈاکٹر عقیلہ کیانی کا نام شامل ہے۔

محترمہ عقیلہ کیانی ایک روشن خیال خاتون ہیں۔ اعلیٰ تعلیم نے ان کی خداداد صلاحیتوں کو دوچند کیا ہے۔ ان کی خدمات کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے نئی نسل کی تعلیم و تربیت پر بھرپور توجہ دی ہے۔

ڈاکٹر عقیلہ کیانی کی ولادت میرٹھ میں ۲۱ مارچ ۱۹۳۱ء کو ہوئی۔ ان کے والد مرزا شاکر حسین کا شمار عمائدین شہر میں ہوتا تھا۔ وہ معروف بیرسٹر تھے۔ ان کا تعلق مغلیہ خاندان سے تھا۔ شاکر حسین صاحب کے والد خضر مرزا گلی قاسم جان دہلی میں سکونت رکھتے تھے۔ مرزا غالب کی اہلیہ امراؤ بیگم بھی اسی خاندان کی فرد تھیں۔ ڈاکٹر عقیلہ کیانی چار بہنیں ہیں اور ان بہنوں کا ایک ہی بھائی تھا۔ اب صرف ان کی ایک بہن ڈاکٹر نعیمہ کینیڈا میں ہیں۔ ڈاکٹر صاحبہ تقسیم ہند کے زمانے میں لندن میں زیر تعلیم تھیں۔ انہوں نے پاکستانی شہریت پسند کی اور ۱۹۴۹ء میں براہ راست پاکستان ہی آ گئیں۔

محترمہ عقیلہ کیانی نے تعلیمی مدارج طے کرتے ہوئے لندن یونیورسٹی سے ایم۔ اے (ایجوکیشن)، کولمبیا یونیورسٹی امریکہ سے ایم۔ اے (سوشیالوجی) اور یونیورسٹی آف برٹش کولمبیا (کینیڈا) سے ایم۔ اے (سوشل ورک) کیا۔ اعلیٰ تعلیم کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے سوشل سائنس میں فلوریڈا (امریکہ) سے ڈاکٹریٹ کرکے اپنی تعلیم مکمل کی۔ قوم و ملت کی اہم ضرورت تعلیم ہے، سو انہوں نے نئی نسل کی تعلیم و تربیت کے اہم مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے درس و تدریس کا آغاز کیا اور طویل عرصہ سے یہ خدمت بڑے اخلاص کے ساتھ جاری

رکھے ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر عقیلہ کیانی ۱۹۵۸ء سے ۱۹۹۳ء تک اکیڈمی فار رورل ڈویلپمنٹ پشاور میں سبجیکٹ اسپیشلسٹ رہیں، پھر ۱۹۶۳ء سے ۱۹۷۳ء تک کراچی یونیورسٹی کے سوشل ورک ڈیپارٹمنٹ میں صدر شعبہ کی حیثیت سے فائز رہیں۔ ۱۹۷۳ء سے ۱۹۸۱ء کی مدت میں سوشیالوجی ڈیپارٹمنٹ کی چیئرمین اور پروفیسر کی حیثیت سے وابستہ رہیں۔ ۱۹۷۸ء سے ۱۹۸۱ء کے دوران میں بلومبرگ کالج (امریکہ) اور ۱۱۱۔ کا یونیورسٹی کی ایسوسی ایٹ پروفیسر رہیں۔ ایک سال امیگریشن سروسز کینیڈا کے ایک خصوصی پروجیکٹ پر کام کیا۔ محترمہ نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف پبلک ایڈمنسٹریشن کراچی میں گیسٹ لیکچرار بھی رہیں۔

اپنی ان اہم خدمات کے ساتھ ساتھ مختلف تنظیموں میں بھی ڈاکٹر عقیلہ کیانی نے موثر کردار ادا کیا۔ ۱۹۶۶ء میں دو سال کے لیے پاکستان سوشیالوجیکل ایسوسی ایشن کی صدر منتخب ہوئیں۔ اسی سال پاکستان فیڈریشن آف یونیورسٹی وومن کی بھی صدر ہوئیں اور ۱۹۷۲ء تک یہ فرائض سنبھالے رہیں۔ پاکستان ایسوسی ایشن آف سوشل ورکرز کی ۱۹۶۸ء میں صدر اور اسی سال کمیٹی آف لیگل اینڈ اکنامکس اسٹیٹس آف وومن کی ممبر بنیں اور ۱۹۷۳ء تک رہیں۔ ڈاکٹر صاحبہ سارپ ٹمسٹ کلب آف کراچی کی بانی صدر ہیں۔ اس کے علاوہ پاکستان سینئر سٹیزنز ایسوسی ایشن کے بانی ممبران میں آپ کا نام شامل ہے۔ اس ادارے کی نائب صدر بھی رہ چکی ہیں۔

محترمہ تحقیقی کاموں سے گہری دلچسپی رکھتی ہیں۔ آپ کے تحقیقی کام کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ ڈاکٹر صاحبہ کے مقالات و مضامین بڑی تعداد میں شائع ہوئے ہیں جنہیں بڑی قدر سے دیکھا گیا ہے۔ آجکل اپنی سوانح ترتیب دے رہی ہیں۔

ڈاکٹر عقیلہ کیانی کی شادی ۱۹۵۵ء میں فلائٹ لیفٹیننٹ عبدالحمید کیانی صاحب سے ہوئی۔ آپ کی اولاد میں دو بیٹے خالد ندیم کیانی اور کمیل سنگین کیانی کے علاوہ ایک بیٹی لینا کیانی ہیں۔ خالد ندیم کیانی عالم جوانی میں داغ مفارقت دے گئے جن کی یاد میں ان کے دوستوں نے امریکہ میں خالد ندیم میموریل فنڈ قائم کیا ہوا ہے۔ اس فنڈ سے مستحق طلبہ کی مالی مدد کی جاتی ہے۔ خالد ندیم کیانی انگریزی کے اچھے شاعر تھے۔ ان کے کلام کا مجموعہ بھی شائع ہوا ہے۔ ڈاکٹر عقیلہ کیانی صاحبہ کینیڈا میں مقیم ہیں اور وہاں بھی سینئر سٹیزنز کلب اور رائٹرز کلب کی رکن ہیں۔ انگریزی کی بہت اچھی مقررہ ہیں۔

علی امام نقوی

علی امام نقوی

علی امام نقوی اردو کے قابلِ ذکر افسانہ نگار ہیں۔ رسائل میں آپ کی تخلیقات مسلسل شائع ہو رہی ہیں۔ محترم قدرت نقوی نے بتایا ہے کہ ان کا میرٹھ سے گہرا تعلق ہے۔ آپ کی ولادت اسکول سرٹیفکیٹ کے مطابق ۹ نومبر ۱۹۴۵ء کو ہوئی۔ شہر مولد بمبئی ہے۔ اسماعیل بیگ ہائی اسکول میں تعلیم حاصل کی ہے۔

علی امام نقوی کے افسانوں کے کئی مجموعے منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ نئے مکان کی دیمک : ۱۹۸۰ء' مباہلہ : ۱۹۸۸ء گھٹتے بڑھتے سائے : ۱۹۹۳ء' اور موسم عذابوں کا : ۱۹۹۸ء افسانوی ادب میں اضافہ ہیں۔ دو ناول تین بتی راما : ۱۹۹۸ء' اور بساط : ۱۹۹۸ء بھی منظرِ عام پر آئے ہیں۔

انیس امروہوی نے علی امام نقوی کے افسانوں کا تجزیہ کرتے ہوئے تحریر کیا ہے۔ "علی امام نقوی ان افسانہ نگاروں میں سے ایک ہیں 'جنہوں نے بندھے ٹکے ضابطوں کے بجائے بیانیہ کی نئی راہیں تلاش کی ہیں۔ ان کی کہانیوں کے موضوعات زندگی کے تلخ حقائق سے ماخوذ ہیں۔ وہ پریوں 'شہزادیوں اور مافوق الفطرت مخلوق کی کہانیاں نہیں سناتے۔ بلکہ زندگی کا افسانہ سناتے ہیں۔ اس لئے ان کی کہانی ان لوگوں کے لئے دلچسپی فراہم کرتی ہے جو زندگی سے بھاگنے کے بجائے اس سے الجھنے کا سلیقہ رکھتے ہیں"۔ آپ بمبئی میں مقیم ہیں۔

عنایت شیر خاں

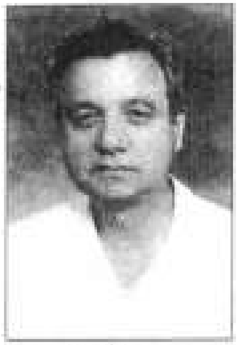

عنایت شیر خاں

عنایت شیر خاں بن شیر علی خاں کی ولادت ۲ مئی ۱۹۳۹ء کو میرٹھ میں ہوئی۔ آپ چار بھائی اور چار بہنیں ہیں۔ عنایت صاحب سنجیدگی و متانت کا پیکر اور علمی و ادبی ذوق رکھنے والی پرکشش شخصیت کے مالک ہیں۔

آپ نے اپنے والد کی ملازمت کی وجہ سے دوسرے بہن بھائیوں کی طرح مختلف شہروں الہ آباد، سیتاپور اور بدایوں میں تعلیم حاصل کرتے ہوئے کانپور سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ پاکستان کے قیام کے بعد ۱۹۵۵ء میں ہجرت کی اور کراچی میں تعلیمی سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کراچی یونیورسٹی سے جنرل ہسٹری میں ۱۹۵۹ء میں گریجویشن کیا۔ دورانِ تعلیم غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتے رہے۔ یونیورسٹی کی طلبہ یونین میں جوائنٹ سکریٹری منتخب ہوئے۔

عنایت صاحب کو ۱۹۶۰ء میں پاکستان آرمی میں کمیشن ملا۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں قصور اور ۱۹۷۱ء کے معرکہ میں سیالکوٹ کے محاذ پر فرنٹ لائن میں رہے۔ پڑھنے لکھنے کا شوق بچپن سے ہی تھا۔ اپنے اس شوق کی تکمیل کی خاطر ۱۹۸۵ء میں ریٹائرمنٹ لے کر تصنیف و تالیف میں منہمک ہو گئے۔

آپ نے ہندوستان کے مشہور انگریز شکاری جم کاربٹ کی انگریزی تصنیف کا اردو میں ترجمہ کیا جو کئی رسائل میں قسط وار شائع ہوا اور دلچسپی سے پڑھا گیا۔ موصوف کا ایک اہم کام انگریز خاتون لیڈی ہالش کی انگریزی تصنیف امام شامل کا اردو ترجمہ ہے جو "شیرِ داغستان" کے نام سے ۱۹۹۶ء میں منظرِ عام پر آیا۔ اسے آرمی ایجوکیشن پریس نے چھاپا ہے۔ یہ کتاب ۲۵۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ انیسویں صدی کے نصف آخر کے مشہور امریکن ٹیکروڈاکٹر کارو آرٹسٹ بھی تھے اور سائنس داں بھی، عنایت صاحب نے ان کی کتاب کو بھی اردو میں منتقل کیا ہے جو زیرِ طبع ہے۔ یہ کتاب خصوصیت سے بچوں کے لئے ہے۔ افسانہ نویسی بھی آپ کے مشاغل میں شامل ہے۔

عنایت شیر خاں صاحب کی شادی ایرانی نژاد خاتون محترمہ حفیظہ سے ۱۹۶۶ء میں ہوئی۔ آپ کی اولاد میں شہریار عنایت پاکستان آرمی میں میجر اور اسفندیار بینک میں افسر ہیں۔ ایک صاحبزادی ہادیہ خان ہیں۔ کراچی میں مقیم ہیں۔

غلام احمد مدنی

غلام احمد مدنی

پیکر خلوص و جرات جناب غلام احمد مدنی برصغیر کے معروف مسلم رہنما نواب محمد اسمٰعیل خاں کے فرزند اکبر تھے۔ آپ کی ولادت ۳ مارچ ۱۹۱۳ء کو میرٹھ میں ہوئی۔ فیض عام اسکول میرٹھ میں تعلیمی مراحل طے کرتے ہوئے میرٹھ کالج پہنچے' اور پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے گریجویشن کیا اور گولڈ میڈل حاصل کیا۔ ۱۹۳۵ء میں آل انڈیا سپیریئر سروس کے امتحان میں شامل ہوئے اور تیسری پوزیشن حاصل کی۔ تربیت کے لے سینٹ کیتھرینس کالج کیمبرج' برطانیہ گئے۔ وہاں سے واپسی پر پہلا تقرر جوائنٹ مجسٹریٹ بریلی کی حیثیت سے ۱۹۳۷ء میں ہوا۔ یکے بعد دیگرے ہردوئی' فیض آباد اور جونپور میں انھیں فرائض سے عہدہ برا ہوتے رہے۔ ۱۹۴۵ء میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ جالام اور ایک سال بعد ڈپٹی سیکریٹری کے عہدے پر دہلی میں تقرر ہوا۔ قیام پاکستان کے بعد ۱۹۴۷ء میں پاکستان تشریف لائے۔ یہاں پہلی تقرری کراچی میں ڈپٹی سیکریٹری "ورکس" کے عہدے پر ہوئی۔ اس کے بعد جوائنٹ سیکریٹری ایجوکیشن کی حیثیت سے کراچی اور ڈھاکہ میں خدمات انجام دیں اور اپنی بہترین کارکردگی کی وجہ سے ۱۹۵۴ء میں ڈھاکہ کے کمشنر بنائے گئے پھر چیئرمین ڈی۔ آئی۔ ٹی بھی رہے۔ ۱۹۶۰ء میں کمشنر کراچی کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ دو سال بعد کمشنر پشاور بنائے گئے اور ۱۹۶۳ء میں بعض امور سے اختلاف کرتے ہوئے مستعفی ہوئے مگر معاملات سلجھ جانے کے بعد چیئرمین ڈی۔ آئی۔ ٹی دو سال رہنے کے بعد چیئرمین واپڈا مشرقی پاکستان ۱۹۶۶ء سے ۱۹۶۹ء تک رہے اور ۱۹۷۰ء میں ریٹائر ہوئے۔

جناب جی۔ اے۔ مدنی نے دوران ملازمت اپنی خداداد صلاحیتوں کو بھرپور استعمال کیا۔ ڈھاکہ میں بھارت سے آئے ہوئے مہاجرین کی آبادکاری کے لئے آپ نے انتھک محنت کی اور ان کی رہائش کے لئے دو کالونیاں محمد پور اور میرپور آباد کیں جہاں ہزاروں خاندان آباد ہوئے۔ چیئرمین ڈی۔ آئی۔ ٹی کی حیثیت سے ڈھاکہ کی ترقی کے لئے ماسٹر پلان بنایا جو بہت موثر ثابت ہوا۔ حکومت بنگلہ دیش نے آپ کی انھیں

یادگار خدمات کے اعتراف میں "مدنی ایونیو" کے نام سے شہر کے ایک مرکزی علاقے کو آپ کے نام سے منسوب کیا ہے۔ جناب غلام احمد مدنی نے کراچی میں مسجد ِ خضراء کی تعمیر و توسیع کے ذرائع پیدا کئے اور آخری وقت تک اس کے ٹرسٹی رہے۔ جب پشاور میں کمشنر کا عہدہ سنبھالا تو یہاں بھی قابلِ ذکر خدمات انجام دیں اور "باب ِ خیبر" کی تعمیر کرائی۔ ڈھاکہ کی مشہور "مسجد بیت المکرم" کی تعمیر بھی ان کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔

جناب جی۔ اے۔ مدنی نے مختلف ممالک میں منعقد ہونے والی کانفرنسوں اور سیمینارز میں پاکستان کی نمائندگی کا اعزاز حاصل کیا۔ یورپ' امریکہ' روس اور مشرقِ وسطیٰ کے مطالعاتی دورے کئے۔ آپ کی ہمہ گیر ملکی و قومی خدمات کا اعتراف سرکاری سطح پر بھی کیا گیا اور عوامی سطح پر بھی۔ ۱۹۶۱ء میں حکومت

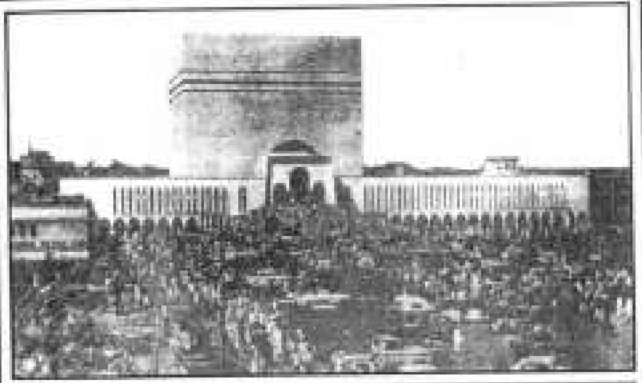

مسجد بیت المکرم، ڈھاکہ

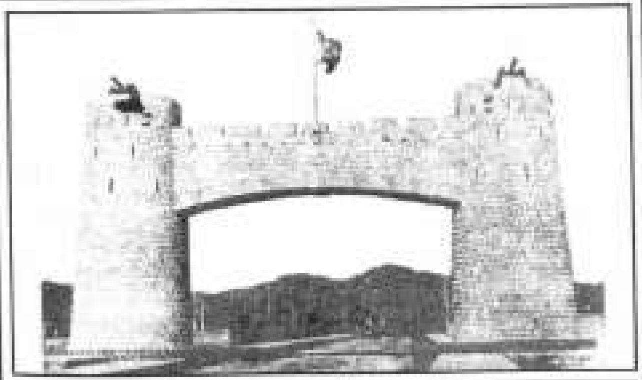

باب خیبر، پشاور

پاکستان نے "ستارہ قائد اعظم" کے بڑے اعزاز سے نوازا اور پھر ۱۹۶۹ء میں "ستارۂ پاکستان" عطا کیا گیا۔

سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد وہاں سے آنے والے پاکستانیوں کی آباد کاری کے لئے ۱۹۷۲ء میں کراچی میں "اورنگی ٹاؤن" کے لئے زمین کے حصول میں پوری توانائی صرف کی۔ آج یہ بستی کراچی کی گنجان آبادی والا علاقہ ہے۔ سول سروس سے سبکدوش ہو کر عوامی فلاح و بہبود کے کاموں کو منظم کرنے اور صحت مند سیاست کو فروغ دینے کے لئے آپ نے ۱۹۷۰ء میں منعقد ہونے والے صوبائی الیکشن کے انتخابات میں حصہ لیا اور کامیاب ہوئے۔ دوسرے انتخابات میں بھی منتخب ہوئے۔ اس طرح ۱۹۷۷ء تک آپ نے عوامی نمائندگی کا حق ادا کیا۔ جذبہ خدمت سے سرشار وطن کا مایہ ناز سپاہی ۱۶ دسمبر ۱۹۷۹ء کو کراچی میں مالکِ حقیقی کے پاس پہنچا۔ آپ کے انتقال کی خبر آناً فاناً شہر بھر میں پھیل گئی۔ ملک کے تمام اخبارات نے آپ کے انتقال کی خبر تفصیل سے شائع کی اور قومی اخبارات نے اپنے اداریوں اور معززینِ وطن نے اپنے بیانات میں غلام احمد مدنی صاحب کی اصول پسندی' مسلسل انتھک محنت' جذبہ حب الوطنی اور دور اندیشی کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ آپ کی خدمات اور ملتِ اسلامیہ سے اخلاص کا اندازہ لگانے کے لئے چند قومی اخبارات کے اداریوں سے اقتباسات دیکھیے جو آپ کی وفات پر لکھے گئے۔

روزنامہ "جنگ" کراچی :...... مرحوم پہلودار شخصیت کے مالک تھے ان کی شخصیت کا ایک پہلو تو یہ تھا کہ وہ ایک اعلیٰ عہدیدار تھے اور سرکاری ملازمت کے طویل دور میں انہوں نے مختلف نوع کے سرکاری فرائض کو بہ طریقِ احسن سرانجام دیا لیکن ان کی زندگی کا دوسرا پہلو جس میں وہ سندھ اسمبلی کے ایک اہم رکن کی حیثیت سے نظر آتے تھے' کم اہم نہیں تھا۔ جی۔ اے۔ مدنی نے زندگی کے ان دونوں شعبوں میں اپنی ذمہ داریوں کو اپنے اسلاف کی روایات کے عین مطابق سرانجام دیا۔ وہ جب تک سرکاری ملازم رہے انہوں نے کسی حاکمِ وقت کا دباؤ نہیں مانا........ اسی طرح میدانِ سیاست میں بھی وہ اپنے اسلاف کی آزادی اور خودداری کی جھلکیاں پیش کرتے رہے اور جب سابق دور حکومت میں انہیں وزارت کی پیش کش کی گئی تو انہوں نے اس پیش کش کو اپنے سیاسی منصب کے شایانِ شان نہیں سمجھا...... ان کی وفات سے نواب اسمٰعیل خاں کے خاندان کی ایک روشن شمع ہی نہیں بجھی ہے بلکہ ملتِ پاکستان بھی ایک فرض شناس فرزند کے وجود سے محروم ہو گئی۔

اداریہ : ۱۸ دسمبر ۱۹۷۹ء

روزنامہ "حریت" کراچی :...... ایک اعلیٰ سرکاری ملازم اور ایک سیاستدان دونوں حیثیتوں سے انہوں نے اپنے ضمیر کی آواز کو بچایا اور اپنے کردار کو داغدار نہیں ہونے دیا۔ مرحوم ایک بہترین سرکاری ملازم اور ایک با اصول اور باکردار سیاست داں کے علاوہ ایک خوش گفتار' ملنسار اور ہمدرد انسان تھے۔

اداریہ : ۱۹ دسمبر ۱۹۷۹ء

روزنامہ "جسارت" کراچی : بی۔ اے۔ مدنی کا انتقال اہلِ کراچی کے لئے ہی نہیں بلکہ تمام محب وطن عناصر کے لئے صدمہ کا باعث ہے۔ مرحوم ایک طرف اپنے والد نواب اسمٰعیل خاں کی وساطت سے تحریکِ پاکستان سے گہری وابستگی رکھتے تھے اور دوسری طرف انڈین سول سروس کے ایک تجربہ کار رکن کی حیثیت سے ان لوگوں میں شامل تھے۔ جنہوں نے قیامِ پاکستان کے فوراً بعد قائداعظم کی زیرِ نگرانی نظم و نسق کا ڈھانچہ کھڑا کرنے میں انتہائی محنت و لگن سے کام کیا.......

اداریہ : ۱۸ دسمبر ۱۹۷۹ء

خواجہ غلام الثقلین

خواجہ غلام الثقلین کا سلسلۂ نسب حضرت ایوب انصاریؓ سے ملتا ہے۔ آپ اور خواجہ الطاف حسین حالی ایک ہی دادا کی اولاد میں سے ہیں۔ پانی پت میں انصاری قوم کی ایک شاخ ساتویں صدی ہجری سے آباد ہے۔ اس وقت غیاث الدین بلبن دہلی کے تخت پر متمکن تھا۔ شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری معروف بہ پیر ہرات کی اولاد میں سے ایک بزرگ خواجہ ملک ہرات سے ہندوستان آئے جو علوم متعارفہ میں اپنے تمام معاصرین میں ممتاز تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب چھتیس واسطے سے ملک محمود شاہ انجو ملقب آق خواجہ تک پہنچتا ہے جو غزنوی دور میں فارس و کرمان و عراق و عجم کا فرماں روا تھا۔ غیاث الدین بلبن اور اس کے بیٹے سلطان محمد نے کاملانِ فن کی قدردانی کو شعار بنایا ہوا تھا۔ سوا ہی شہرت نے خواجہ ملک کو ہندوستان آنے پر آمادہ کیا۔ ان کو بلبن نے چند عمدہ دیہات پرگنہ پانی پت میں اور معتدبہ اراضی سواد قصبہ پانی پت میں عنایت کی مگر خواجہ غلام الثقلین کے دادا، پردادا کو خاندانی نیک نامی اور عزت و توقیر کے علاوہ کچھ نہیں ملا۔

خواجہ غلام الثقلین کے والد خواجہ غلام عباس کا نکاح مولانا الطاف حسین حالی کی بھانجی سے ہوا تھا۔ خواجہ غلام عباس کے تین بیٹے غلام الحسنین، غلام الثقلین اور غلام السبطین ہوئے۔ غلام الحسنین عالمِ دین اور مصنف تھے۔ وہ ۱۹۳۸ء میں فوت ہوئے۔ سب سے چھوٹے غلام السبطین تجارت و ملازمت کرتے تھے۔ اردو کے نامور افسانہ نگار، ناول نگار اور فلم ساز خواجہ عباس احمد انہی کے بیٹے ہیں۔ غلام السبطین کا انتقال ۱۹۳۲ء میں ہوا۔

خواجہ غلام الثقلین ۱۸۷۲ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وہیں پائی۔ ۱۸۸۴ء میں مولانا حالی کے ساتھ دہلی آئے۔ دسویں جماعت دہلی میں پاس کی۔ ۱۸۸۹ء میں ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ میں داخل ہوئے۔ بی۔ اے کیا اور قانون کا امتحان بھی پاس کیا۔ آپ نے اسلامی ممالک کا سفر کیا اور "روزنامچہ سیاحت" تحریر کیا جس میں عراق، سعودی عرب، ایران، شام، مصر اور قسطنطنیہ کے حالات ملتے ہیں۔ آپ نے اصلاحِ تمدن کے لئے شب و روز کام کیا۔ شاہ ایڈورڈ ہفتم کے جشنِ تاج پوشی کے موقع پر دسمبر ۱۹۰۲ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ جلسہ ہزہائی نس سر آغا خاں کی صدارت میں دہلی میں ہوا تھا۔ اس موقع پر خواجہ صاحب نے اصلاحِ تمدن پر ایک موثر تقریر کی۔ کانفرنس نے اس کام کو اپنے پروگرام میں نہ صرف شامل کیا بلکہ ایک علیحدہ شعبہ بھی قائم کر دیا اور خواجہ صاحب کو اس کا سیکریٹری

مقرر کیا۔ اسی مقصد کے حصول کے لئے آپ نے جنوری ۱۹۰۳ء میں میرٹھ سے ایک رسالہ "عصر جدید" جاری کیا۔ پہلے یہ ماہنامہ تھا مگر بعد میں ہفت روزہ کر دیا گیا تھا۔ یہ رسالہ ابتدا میں منشی محمد بلال کی نگرانی میں اہتمام کے ایک پریس میں چھپنا شروع ہوا تھا۔ جولائی ۱۹۰۳ء سے مطبع نور مرقع نور الانوار میرٹھ میں چھپنے لگا۔

خواجہ صاحب نے ۱۹۰۹ء میں منعقدہ صوبائی الیکشن میں آفتاب احمد خان کا مقابلہ کیا مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ آپ نے ہمت نہیں ہاری اور دوسرے الیکشن میں کامیابی حاصل کر کے اسمبلی میں عوام کے جذبات کی ترجمانی کا حق ادا کیا۔

خواجہ غلام الثقلین نہایت صاف ذہن اور معتدل خیالات کے آدمی تھے۔ کتب بینی کا بیحد شوق رکھتے تھے۔ آپ کی تحریر ادب و ظرافت سے پُر ہوتی تھی۔ جو آپ کے انداز خطابت کو دلکش بنا دیتی تھی۔ آپ اپنے انتقال سے ایک سال پہلے محسوس کرنے لگے تھے کہ صحت جواب دے رہی ہے مگر مسلسل کام جاری رکھا اور طویل سفر بھی کئے۔ اسی وجہ سے باقاعدہ علاج ممکن نہ ہوا اور صرف ۴۳ سال کی عمر میں ۳ ستمبر ۱۹۱۵ء کو جمعہ کے روز رات دس بجے دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے۔ دوسرے دن درگاہ پیری متصل عید گاہ پانی پت میں تدفین ہوئی۔

خواجہ صاحب کے مشاغل علمی میں تصنیف و تالیف شامل تھی مگر صرف چند کتابیں ہی منظر عام پر آسکیں جن میں "روزنامچہ سیاحت" ہمارے بہبود کے مسائل اور تاریخ مسئلہ سود (انگریزی) شامل ہیں۔

خواجہ غلام الثقلین کی شادی مولانا حالی کے بڑے صاحبزادے خواجہ اخلاق حسین کی صاحبزادی مشتاق فاطمہ سے ہوئی تھی۔ جن سے دو صاحبزادے غلام السیدین' اظہر عباس اور تین صاحبزادیاں مختار فاطمہ' سیدہ خاتون اور صداق فاطمہ ہوئیں۔ خواجہ صاحب کی ذات میرٹھ میں ادب و صحافت کے فروغ میں بڑی معاون رہی۔

ماخذ : تاریخ صحافت اردو' جلد چہارم ص ۲۰۷ تا ۲۱۷

حافظ غلام رسول خان

حافظ غلام رسول خان خلف رسالدار ذکریا خان نہایت سنجیدہ' بیدار مغز' دیندار اور متقی بزرگ تھے۔ آپ کے جد ولایت خان تھے جن کی زمینیں موضع پوٹھ ضلع میرٹھ میں تھیں اور وہ وہیں سکونت رکھتے تھے۔ ذکریا خان ۱۸۲۵ء میں ابتداً حکومت کی گیارہویں ارریگولری میں براہ راست رسالداری پر مامور ہوئے تھے۔ ذکریا خان کے والد اولیاء خان عرف آلو خان بھی نیک مزاج اور آزاد منش بزرگ تھے۔

حافظ غلام رسول خان ۱۸۵۷ء میں تحصیل سول ضلع اعظم گڑھ میں تحصیلدار تھے۔ وہاں باغیوں نے ایسی یورش کی اور بدامنی پھیلائی کہ اہلیان پولس بخوف جان تھانہ جات کو چھوڑ کر بھاگ گئے۔ حافظ غلام رسول خان اس خطرناک موقع پر مستعدی سے انتظام میں مصروف رہے اور سرکاری خزانہ و تحصیل کو باغیوں کی دست برد سے بچایا۔ بعد میں ضلع کے حکام نے ایک جماعت توڑے دار بندوقچیوں کی ان کے پاس بھیج دی' اس کو ساتھ لے کر انہوں نے کمال استقلال سے باغیوں کا صفایا کیا اور عوام کا اعتماد بحال کیا۔ باشندوں نے اس کارروائی کو سراہا۔ اس خدمت کو پیش نظر رکھتے ہوئے حکومت نے دو موضعے مسلم نبنجند جزوی اور موضع چندیانہ کی تحصیل الوپ کی جاگیر عطا کی۔

حافظ غلام رسول خان ایک دیانت دار شخص تھے۔ ان کے زہد و تقویٰ کا یہ عالم تھا کہ دوران ملازمت کسی بدعنوانی میں مبتلا نہیں ہوئے۔ انہوں نے اپنے وطن موضع بہادر گڑھ میں بیرون دروازہ کوٹ مشرق کی طرف ایک عالی شان مسجد معہ چاہ پختہ تعمیر کرائی۔ تحصیل سگڑی ضلع اعظم گڑھ میں تعیناتی کے دوران قصبہ علی پور میں خود نماز جمعہ کی امامت کرتے تھے۔ ۱۸۷۳ء میں تحصیل سگڑی میں تحصیلدار تھے' اچانک بعارضہ فالج علیل ہو گئے اور رخصت پر بہادر گڑھ آگئے جہاں ۳۰ نومبر ۱۸۷۳ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔

حافظ صاحب کی شادی خان پور میں اسد اللہ خان ولد شیخ محمدی افغان بازید خیل کی دختر آمنہ بی بی سے ہوئی تھی۔ ان کے بطن سے حافظ محمد عبدالرحیم خان اور تین لڑکیاں واصل بی بی' ساترہ بی بی' اور کلثوم بی بی ہوئیں۔

یادگار سلف ص ۱۱۸

شیخ غلام محی الدین

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ خیز زمانہ میں میرٹھ چھاؤنی خطرہ میں گھری ہوئی تھی۔ میرٹھ کے مشہور رئیس الٰہی بخش صاحب نے اپنے خاندان کے تمام افراد کو شہر میرٹھ کے مشہور چھتروالوں کی خاندانی حویلی متصل خیر نگر بازار میں منتقل کر دیا تھا۔ اسی دوران اس حویلی میں شیخ غلام محی الدین صاحب پیدا ہوئے۔ آپ خان بہادر حافظ عبدالکریم صاحب کے فرزند اکبر تھے۔ شیخ الٰہی بخش صاحب نے لاولد ہونے کی بنا پر اپنے بھتیجے شیخ غلام محی الدین کو مثل اولاد کے سمجھا۔ شیخ غلام محی الدین نے مولانا عبدالسمیع بیدلؒ سے فارسی وغیرہ پڑھی۔ کلام پاک ناظرہ پڑھا۔ آپ ہمدردی اور محبت کا پیکر تھے۔ مشرقی تہذیب وتمدن کے پابند تھے۔ ڈیوک آف کناٹ سے آپ کی پُرخلوص دوستی اور گہرے تعلقات تھے۔ ایک مرتبہ ڈیوک کی شاندار دعوت کی تھی جو ایک یادگار تقریب قرار دی گئی۔

شیخ غلام محی الدین نے ریاست کے انتظامی امور میں کافی دلچسپی لی اور ان کو نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ نواب صاحب ٹونک کو علم جعفر پر پورا عبور حاصل تھا۔ وہ ایک مرتبہ اپنے پیر و مرشد حضرت مولانا کل حسن قلندری قادریؒ سے شرفِ ملاقات کے لئے میرٹھ تشریف لائے تو یہاں شیخ الٰہی بخش صاحب سے بھی ملے۔ اس وقت شیخ غلام محی الدین کم سن تھے۔ نواب صاحب نے ان کو دیکھ کر علم جعفر کا حساب لگا کر ان کے متعلق فرمایا کہ ان کے ۸۔ ۱۸۔ ۲۸ عمر کے سال اگر خیریت سے گذر گئے تو یہ لڑکا بڑا اقبال مند ہوگا۔ سال گذرتے گئے جب اٹھائیسواں سال آیا تو آپ دق کے مرض میں مبتلا ہو گئے اور اپنے تایا جناب الٰہی بخش کے انتقال کے تین سال بعد ۱۸۸۵ء میں انتقال کر گئے۔ اپنے خاندانی احاطہ قبرستان حضرت شاہ پیر میرٹھیؒ میں تایا کے متصل مدفون ہوئے۔ آپ کے وارثان میں صاحبزادگان حاجی شیخ نظام الدین (م ۱۹۵۸ء) اور حاجی شیخ علاؤالدین (م ۱۹۷۱ء) کے علاوہ دو صاحبزادیاں تھیں۔

حضرت شاہ عبدالسمیع بیدل کی متعدد تصانیف ہیں ان میں "حمد باری" زیادہ مشہور ہے۔ اس کتاب میں شیخ غلام محی الدین نے قطعہ سالِ تالیف لکھا ہے جو حسب ذیل ہے :

لکھ چکے جب جناب مولانا — یہ رسالہ نیا بطرزِ انیق
کل نصابوں پہ اسکو سمجھا فوق — جس نے دیکھا اسے یہ فکرِ عمیق
کس وضاحت کا ہے بیاں اس میں — کس بلاغت کی اس میں ہے تدقیق
بندہ عاجز غلام محی الدین — فکرِ تاریخ میں ہوا جو غریق
چنک کے ہاتف نے کان میں یہ کہا — "ہے یہ اچھی کتاب پُر تحقیق"

۱۲۸۷ھ

فاروق احمد خاں رئیس احمد خاں نظامی قوال

فاروق احمد خاں نظامی

رئیس احمد خاں نظامی

کلاسیکل میوزک میں پہچان "گھرانہ" سے ہوتی ہے برصغیر میں لاتعداد گھرانے موجود ہیں۔ ایسے ہی گھرانوں میں ایک مشہور گھرانہ "ہاپوڑ گھرانہ" ہے جس کے جد امجد استاد میاں شادی خاں اور استاد میاں مراد خاں اٹھارہویں صدی میں اپنے وقت کے ایک عظیم گائیک گزرے ہیں۔ اس گھرانے کے دوسرے بڑے گائیک استاد میاں بہادر علی خاں اور استاد میاں دلدار خاں کا شمار بھی برصغیر کے نامور اساتذہ میں ہوتا ہے۔ یہ حضرات کلاسیکی محافل کے علاوہ درگاہ حضرت نظام الدین اولیاء سے وابستہ رہے۔ استاد میاں دلدار خاں کے صاحبزادگان استاد میاں فاروق احمد نظامی' استاد میاں محمد احمد نظامی' استاد میاں محمود احمد خان نظامی' استاد میاں خلیق احمد خان نظامی اور استاد میاں رئیس احمد خان نظامی کلاسیکی موسیقی کے علاوہ قوالی میں بہت مشہور ہوئے۔

استاد میاں فاروق احمد خاں نظامی موسیقی میں کامل مہارت رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنے تمام بھائیوں کو موسیقی اور قوالی کے فنون کی تعلیم دی' جس کی وجہ سے ان سب بھائیوں کی شہرت دور دور تک ہوئی۔ یہ سب بھائی شائقین میں مقبول رہے۔

استاد میاں محمد احمد خاں نظامی ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۵ء تک آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن لکھنؤ سے بحیثیت میوزک کمپوزر منسلک رہے۔ ان کے بھائی استاد میاں محمود احمد نظامی "من رنگ" نے بے شمار راگوں میں مشکل بندشیں باندھیں جو آج تک کلاسیکی محافل میں گائی جاتی ہیں۔ استاد میاں خلیق احمد خاں نظامی بھی فنِ موسیقی کے ساتھ قوالی میں نمایاں مقام رکھتے تھے۔ یہ قول صوفیاء کرام وہ قوالی کے اتار چڑھاؤ

اور تکرار قوالی میں ایک بے مثل نگینہ تھے۔

استاد میاں رئیس احمد خاں نظامی پیدائشی گویئے ہیں۔ دس سال کی عمر سے اس فن میں ہیں۔ انہوں نے ان فنون کی تعلیم اپنے بڑے بھائیوں سے حاصل کی۔ موصوف ہمیشہ اپنے گائیکی میں سب سے زیادہ مشکل تالیں 'صول فاختہ' 'چوتالہ' 'فرودست اور دھمار جیسی تالیں استعمال کیں۔ حضرت امیر خسرو کے سات سو سالہ جشنِ ولادت پر ریڈیو پاکستان نے قوالی کا پروگرام نشر کیا جس میں فاروق احمد خاں نظامی اور رئیس احمد خاں نظامی نے حضرت امیر خسرو کی خاص بندشیں 'قول' 'قلبانہ' 'نقش' 'گل' 'ترانہ' ریکارڈ کرائیں جو ریڈیو پاکستان نے اپنے پاس کلچر کے سرمائے کے طور پر محفوظ کر لیے۔ ان دونوں بھائیوں کا گروپ گذشتہ پچاس سال سے ریڈیو اور بتیس سال سے پاکستان ٹیلی ویژن کا اول درجہ کا فارمر گروپ ہے۔ تحریکِ پاکستان کے زمانے میں اس گروپ نے تحریک کو فروغ دینے کے لئے بمبئی' حیدر آباد دکن' احمد آباد' مدراس اور دہلی وغیرہ میں کئی پروگرام کئے جن کی تمام آمدنی قائد اعظم کو پیش کی گئی۔ محترمہ فاطمہ جناح' سردار عبدالرب نشتر' آئی آئی چندریگر' حسین شہید سہروردی اور برصغیر کی دیگر متعدد اہم

خلیل احمد خاں نظامی

محمد احمد خاں نظامی

محمود احمد خاں نظامی

شخصیات کے سامنے یہ گروپ اپنے فن کا مظاہرہ کر چکا ہے۔

۱۹۵۶ء میں ادارہ فروغِ علم و فن نے انہیں شبابِ موسیقی کا خطاب دیا۔ حضرت قنبر علی شاہ جوہری' حضرت موحد الدین گوالیاری' حضرت حیرت شاہ وارثی' حضرت بابا ذہین شاہ تاجی' اور خواہر زادگان حضرت نظام الدین اولیاء نے بھی مختلف خطابات عطا فرمائے ہیں۔ آج کل استاد رئیس احمد خان نظامی کے صاحبزادے انیس احمد خان نظامی اپنے خاندانی ورثہ کے امین ہیں۔ وہ بھی ریڈیو اور ٹی۔ وی کے اول درجہ کے فنکاروں کی صف میں شامل ہیں۔

بہ شکریہ: اظہار باجوڑی

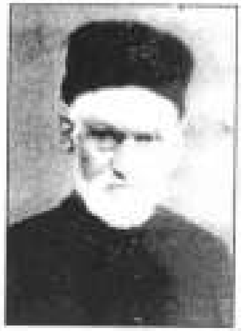

فتح محمد خاں

فتح محمد خاں

فتح محمد خاں کے آباء و اجداد کا پیشہ سپہ گری تھا۔ ان کا شجرہ نسب حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سینتالیسویں پشت سے ملتا ہے۔ حضرت عمر کی بیسویں پشت سلطان عمر شاہ تک ایک اولاد نرینہ کا سلسلہ رہا۔ ان کی دو اولادیں سلطان محمد شہاب الدین اور سلطان محمد شاہ فاتح ٹھاٹھیر ہوئیں۔ اس کے بعد پھر ایک اولاد کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ ستائیسویں پشت میں مولانا محمد عمر نجف خاں کے ہاں دو اولادیں ہوئیں۔ سینتیسویں پشت میں حکیم بدر الدین علی خاں شہسوانی کے ہاں پانچ اولادیں ہوئیں اور ان کے بڑے فرزند حکیم خورشید حسن خاں کے ہاں چار اولادیں ہوئیں۔ انہیں کی نسل میں لال محمد خاں کے پڑپوتے پیرداد خاں مغلیہ حکومت کے آخری دور میں وزیر تھے۔ وہ بہادر شاہ ظفر کے خاص مصاحبوں میں سے تھے اور بادشاہ کو بچانے میں بھی انہوں نے نمایاں کردار ادا کیا۔ یہ فتح محمد خاں کے دادا تھے۔ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں شریک ہونے کے جرم میں انہیں بلند شہر کے "کالے آم" کے میدان میں پھانسی دے دی گئی تھی۔ فتح محمد خاں کے والد پیر محمد خاں بھی فوج میں میجر تھے۔

فتح محمد خاں اپنے والد کے اکلوتے بیٹے تھے جو ان کے انتقال کے وقت کمسن تھے۔ ان کی پرورش والدہ عائشہ خانم نے کی۔ تعلیمی مراحل ختم ہی ہوئے تھے کہ شفیق والدہ بھی رخصت ہو گئیں۔ عزیزوں کی ناانصافیوں سے تنگ آ کر حیدر آباد دکن چلے گئے۔ وہاں ملٹری کا کورس مکمل کر کے سیکنڈ لیفٹیننٹ کی حیثیت سے آرکیٹیکٹ کے منصب پر فائز ہوئے اور میجر کے عہدے تک ترقی کی۔ صاف گوئی کی وجہ سے ملازمت سے سبکدوش ہو گئے اور پھر میرٹھ چلے آئے۔

۱۹۱۱ء میں جارج پنجم کی تاج پوشی کی تیاری ہو رہی تھی۔ اس دور میں ان کو میرٹھ میں چیف آرکیٹیکٹ کے عہدے پر مقرر کیا گیا۔ انہوں نے یہاں یادگار خدمات انجام دیں۔ میرٹھ کا مشہور گھنٹہ گھر ان ہی کے

بنائے ہوئے نقشے سے ۱۹۱۳ء میں تعمیر ہوا۔ اجمیر کے گھنٹہ گھر کا نقشہ بھی انہوں نے ہی بنایا تھا۔ خاں صاحب کام کے معاملے میں کسی رعایت کے قائل نہ تھے اور نہ ہی رشوت لیتے تھے۔ ان کی دیانتداری کی وجہ سے افسران نالاں رہتے تھے۔ بحالت مجبوری ۱۹۱۸ء میں ملازمت سے مستعفی ہو کر دہلی چلے گئے اور پھر وہیں کے ہو رہے۔ دہلی میں ہی ۱۹۳۹ء میں ان کا انتقال ہوا۔ دلی کے نئے قبرستان نزد فیروز شاہ کوٹلہ میں سپرد خاک کئے گئے۔

فتح محمد خاں صاحب عربی، فارسی اور انگریزی کے عالم اور صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے۔ ان کی لکھی ہوئی دو کتابیں ۱۹۴۷ء کے ہنگامے میں ضائع ہو گئیں۔ ان کی جسمانی یادگار تین اولادیں حسن بانو، فیروز محمد خاں اور فریدہ خانم ہیں۔ حسن بانو کی شادی میرٹھ میں گھڑیوں کے تاجر عبدالعزیز صاحب سے ہوئی۔ فریدہ خانم پٹنہ کے مشہور معالج ڈاکٹر میجر مصحف علی ہاشمی کے صاحبزادے احسان علی ہاشمی سے منسوب ہوئیں۔ محترمہ فریدہ ہاشمی کراچی کی مشہور لیڈی ڈاکٹر ہیں۔ فیروز محمد خاں نے برصغیر میں ایک نامور آرٹسٹ کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔ ان کے تین صاحبزادے جاوید احمد، اقبال پرویز اور سلیم احمد کے علاوہ تین بہنیں کراچی میں ہیں۔

حکیم محمد فخر الدین

حکیم محمد فخر الدین کے خاندان کا تعلق قوم بنی اسرائیل سے تھا۔ یہ خاندان سکندرآباد ضلع بلند شہر سے ہجرت کر کے میرٹھ میں آباد ہوا اور محلہ بنی اسرائے جو بنی اسرائیل کا مخفف ہے آباد کیا۔ آپ کے والد حکیم محمد فصیح الدین رنج وطبیب نے فن طبابت کو اختیار کیا اور بڑی نیک نامی اور شہرت حاصل کی۔ وہ ایک حاذق و ہر دل عزیز طبیب تھے۔ فن شاعری میں بھی اعلیٰ مقام رکھتے تھے۔ رنج وطبیب تخلص فرماتے تھے۔ شاعرات کے پہلے تذکرہ نگار کی حیثیت سے ان کو اردو میں منفرد حیثیت حاصل ہے۔

حکیم محمد فخر الدین کی ولادت ۱۲۷۶ھ/۱۸۶۰ء میں ہوئی۔ ان کی ولادت کا قطعہ تاریخ کلیاتِ رنج میں موجود ہے۔

جب تولد ہوا مرے گھر میں — میرا تفریح روح ولختِ جگر
جلوہ آرا ہوئے نشاط و سرور — بن گیا آفتاب نورِ نظر

چمنِ عشق میں بہار آئی
نخلِ تازہ بن گیا گلِ تر
تیری نعمت کا شکر کیا ہو ادا
اے خداوندِ اعظم و اکبر

تیری رحمت کا یہ تماشا ہے — مجھے حاصل ہوا ہے کیفِ پسر
میرا نورِ نگاہ فخر الدین — بہ جاہ و شان و شوکتِ اختر
بہ عیش و عشرت و آرام — پائے عالم میں کیفِ عمرِ خضر
دل نے تاریخ کا جو فکر کیا — اور گیا سوئے طارمِ اخضر
بے سر امتحاں سروش اے رنج
بول اٹھا کہ لکھ تکو اختر
۱۲۷۶ھ

حکیم فخر الدین کو طبابت ورثہ میں ملی۔ اس ماحول میں بچپن گزرا، لہٰذا آپ کا ذہن بھی اس فن کی طرف گیا۔ خوش قسمتی سے استادِ وقت حکیم بلدیو سہائے سے فیض حاصل کرنے کا موقع ملا۔ آپ اپنی جودتِ طبع کی وجہ سے ایک اعلیٰ پایہ کے طبیب ثابت ہوئے اور تمام عمر انسانیت کی خدمت میں گزاری۔ میرٹھ کے شہری حلقہ میں آپ کو قدر و منزلت حاصل تھی۔ حکیم صاحب کے علاج و معالجہ کے اذکار ابھی تک زبان زد ہیں۔

حکیم محمد فخر الدین کا شمار شہر کے معتبر حضرات میں ہوتا تھا۔ وہ میونسپل کمشنر بھی رہے۔ فنِ شاعری سے تعلق بھی ورثہ میں ملا تھا۔ شاد و فخر تخلص فرماتے تھے۔ یوں تو موصوف کو جملہ اصنافِ سخن پر عبور حاصل تھا لیکن قطعاتِ تاریخ کہنے میں خاص مہارت حاصل تھی۔ اپنے والد کے انتقال کے بعد آپ نے ان کا کلیات ترتیب دیا اور مخزن الفصاحت المعروف بہ کلیاتِ رنج کے عنوان سے شائع کیا۔ حکیم محمد فخر الدین کا انتقال بہ عمر پچپن سال ۲۹ نومبر ۱۹۱۷ء کو ہوا۔ تدفین آبائی قبرستان شاہ سلطان بیرون لسارڑی گیٹ میں ہوئی۔ مولانا ندرت میرٹھی نے تاریخ وفات کہی:

لبِ جبریل سے صادر یہ ہوا حکمِ خدا
بہرِ محمود کھلے قفل درِ باغِ نعیم

حکیم صاحب کے چار فرزند عرفان الحق، حکیم محمود الحق، مسعود الحق اور امتیاز الدین ہوئے۔ ان میں صرف محمود الحق صاحب نے اپنا آبائی پیشہ طبابت اختیار کیا۔ ان کا شمار بھی ممتاز اطباء میں ہوتا تھا۔ وہ بھی شہر میں بہت مقبول تھے۔ ۱۹۱۸ء سے اپنے انتقال تک یعنی ۳۳ سال آنریری مجسٹریٹ رہے اور خان صاحب کے خطاب سرفراز رہے۔ حکیم محمود الحق کے بھی چار بیٹے حکیم رضی الدین، حکیم سیف الدین، منصور الدین احمد اور صبیح الدین ہوئے جن میں حکیم سیف الدین احمد صاحب اپنے خاندان کی عظمت اور روایات کا امین ہیں۔

رنج میرٹھی: حیات شخصیت اور کارنامے، حکیم فصیح الدین رنج میرٹھی حیات بشیر

حافظ فرید الدین الوجیہہ

حاجی حافظ فرید الدین احمد الوجیہہ

خان بہادر حاجی محمد وجیہہ الدین ایم ایل اے میرٹھ کی ان قابلِ قدر شخصیات میں شامل ہیں جنہوں نے دین و ملت کی بیش بہا خدمت کی اور اپنی ایثار پرور طبیعت کی وجہ سے سماجی حلقوں میں بھی محترم رہے۔ آپ کی اولاد میں حاجی حافظ فرید الدین الوجیہہ نے وراثت کا حق ادا کیا۔

حاجی حافظ فرید الدین احمد الوجیہہ کا پنجابی سوداگران سے تعلق ہے۔ آپ ۱۹۱۷ء میں صدر میرٹھ کے علاقہ میں پیدا ہوئے۔ دارالعلوم امداد الاسلام اور فیضِ عام انٹر کالج میں تعلیم حاصل کی۔ اس خاندان میں اسلحہ کی تجارت آپ کے والد نے شروع کی تھی۔ اس لئے اسی کاروبار سے تعلق رکھتے ہوئے اپنے والد کی تجارتی سرگرمیوں میں ہاتھ بٹاتے رہے اور بعد میں کلی طور پر یہ ذمہ داریاں سنبھالیں۔

آپ نے تجارت کے ساتھ ساتھ دینی و سماجی زندگی میں بھی سرگرم حصہ لیا۔ میرٹھ مرکنٹائل ایسوسی ایشن میرٹھ، شہری مسجد کمیٹی دہلی، قدیم مساجد بحالی کمیٹی نئی دہلی، دہلی لائبریری سوسائٹی دہلی کے ممبر اور آل انڈیا آرمس اینڈ ایمونیشن ڈیلرز ایسوسی ایشن کے اعزازی ممبر رہے۔ پاکستان ہجرت کرنے کے بعد اپنی کمپنی پائنیر آرمس (پرائیویٹ) لمیٹڈ کراچی کے مینیجنگ ڈائریکٹر، پیر الٰہی بخش اینڈ کمپنی (پرائیویٹ) لمیٹڈ اور نیشنل کارٹریج کمپنی لمیٹڈ کے ڈائریکٹر رہے۔ پاکستان ایسوسی ایشن آف آرمس اینڈ ایمونیشن امپورٹرز، دارالامان کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی، جمعیت پنجابی سوداگران دہلی رجسٹرڈ کراچی، انجمن مسلمانان پنجاب کراچی کے ممبر اور انجمن پنجابی سوداگران کراچی کے ممبر و خازن رہے۔ کئی بار حجازِ مقدس کا سفر کیا۔ آپ کو حضرت مولانا بدر عالم میرٹھی سے بیعت کا شرف بھی حاصل تھا۔

۱۹ جون ۱۹۹۲ء مطابق ۱۷ ذی الحج ۱۴۱۲ھ کو کراچی میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ آپ کی تدفین دارالعلوم کورنگی کے قبرستان میں ہوئی۔ اس قبرستان میں مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیعؒ، حضرت مولانا عبدالحیؒ

حافظ محمد بدرالدین الوجیہ

انصار فرید الوجیہ

مولانا سحبان محمودؒ، مولانا محمد ادریس میرٹھیؒ اور حسن عسکری جیسی شخصیات محو خواب ہیں۔ آپ کی اولاد میں پانچ بیٹیوں کے علاوہ دو صاحبزادے حافظ انصار فرید الوجیہ اور حافظ بدرالدین الوجیہ یادگار ہیں اور اپنے خاندان کی روایات کے امین ہیں۔

فضل احمد صدیقی

میرٹھ کی قابل فخر شخصیات میں فضل احمد صدیقی کا نام بھی بہت نمایاں ہے۔ آپ ایک فعال اور متحرک شخص تھے۔ زندگی کے آخری لمحات تک خدمت میں مصروف رہے۔

فضل احمد صدیقی ۸ دسمبر ۱۹۱۱ء کو میرٹھ کے ایک زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابھی عمر کے چند سال ہی گزرے تھے کہ والد مولوی نور احمد صاحب انتقال کر گئے۔ بچپن میرٹھ کی تحصیل باغپت کے گاؤں کاٹھ کی آبائی حویلی میں گزرا۔ تعلیم کا شوق پورا کرنے کے لئے میرٹھ شہر آئے۔ یہاں فیض عام ہائی اسکول سے میٹرک کیا۔ اسی دوران فیض عام ہائی اسکول انٹر کالج ہو گیا۔ تعلیمی سلسلہ جاری رکھتے ہوئے اسی تعلیمی ادارے سے انٹر کرنے کے بعد بی۔ اے۔ کیا۔ بہت ذہین اور محنتی شروع سے ہی تھے اس لئے تعلیم بھی توجہ سے حاصل کی اور ہر امتحان میں فرسٹ ڈویژن حاصل کی۔ پچھلی جماعت سے بی۔ اے تک ان کے دوست اور ہم عصر حکیم تی۔ اے۔ مدنی خلف نواب محمد اسمٰعیل خاں اور آفتاب احمد خان رہے۔

فروری ۱۹۳۸ء میں شادی کے بعد بمبئی منتقل ہوئے جہاں آل انڈیا ریڈیو سے منسلک ہو گئے۔ ساتھ ہی ایم۔ اے (فارسی اور اردو) اور قانون کی اسناد بمبئی یونیورسٹی سے حاصل کیں۔ یہیں ممتاز قانون داں شریف الدین پیرزادہ سے دوستی اور ہم پیشہ ہونے کے ناطے قربت ہوئی جو آخر تک قائم رہی۔ شعر و ادب کا شوق ان کو کچھ عرصہ فلمی دنیا کے لئے گیت لکھنے لے گیا۔ اس زمانے کے ہیرو صادق اور منتخب جارچوی کے ساتھ کچھ عرصہ رہے اس تمام عرصہ میں آل انڈیا ریڈیو سے وابستگی برقرار رکھی۔

پاکستان کے قیام کے ساتھ ہی بمبئی سے بحری جہاز سے کراچی پہنچے اور ڈان اردو کے پہلے ایڈیٹر بنے۔ الطاف حسین اس اخبار کے چیف ایڈیٹر تھے۔ تین سال بعد جب یہ اخبار بند ہوا تو اپنے شوق کو ملحوظ رکھتے ہوئے ریڈیو پاکستان سے نیوز ایڈیٹر کی حیثیت سے منسلک ہو گئے۔ اس کے ساتھ ساتھ شعر و ادب سے تعلق برقرار رکھا۔ آپ کی پہلی تصنیف "خون نابہ کشمیر" ۱۹۵۰ء میں شائع ہوئی۔ کچھ عرصہ بعد "پاکستان ہمارا" لکھی۔ ان دونوں تصانیف کی اس زمانے میں بہت پذیرائی ہوئی۔

فضل احمد صدیقی صاحب کے مضامین ڈان اردو اور پھر ڈان انگریزی میں پابندی سے شائع ہوتے رہے۔ انگریزی میں زیادہ تر FASIHI (فضل احمد صدیقی حریاں) کے نام سے لکھتے تھے۔ مزاح میں بیش تکلص کرتے تھے۔ ۱۹۵۳ء میں انگریز میونسپل کمشنر HOWROID نے افسر اطلاعات مقرر کیا تو ریڈیو کو خیرباد کہا۔ ۱۹۶۹ء

میں بلدیہ عظمیٰ کراچی سے ریٹائرمنٹ لی۔ بلدیہ کے شہری استقبالیے جو غیر ملکی بادشاہوں اور حکومتی سربراہوں کو دیے جاتے تھے فضل احمد صدیقی صاحب کی ذمہ داری تھے اور آج بھی ان تقریبات کو یادگار سمجھا جاتا ہے۔ ان کے مشاعرے بھی آپ ہی کے زیرِ انتظام ہوتے تھے۔ آج بھی ان مشاعروں کو یاد کیا جاتا ہے۔ آپ کے مضامین کتابی شکل میں انشائیے کے نام سے شائع ہوئے۔

بمبئی کے قیام کے دوران فضل احمد صدیقی صاحب نے سابق وزیرِ اعظم پاکستان ذوالفقار علی بھٹو کو پڑھایا تھا۔ ۱۹۷۳ء میں بھٹو صاحب نے بطورِ خاص صدیقی صاحب کو پاکستان کی تحریک پر ریسرچ کے لئے اسلام آباد میں مقرر کیا۔ اسلام آباد سے ۱۹۷۶ء میں صحت کی خرابی کے باعث واپس کراچی آ گئے۔

خطبہ حجۃ الوداع کا آپ نے انگریزی میں ترجمہ کیا جسے حکیم سعید صاحب نے کتابی شکل میں شائع کیا۔ عمر کے آخری حصہ میں گاہے بگاہے ٹی۔وی اور ریڈیو کے مذاکروں میں شرکت کرتے تھے۔

۱۸ اگست ۱۹۷۹ء کو یادگار خدمات انجام دے کر کراچی میں ہی بعارضہ قلب اپنے لاتعداد مداحوں کو سوگوار چھوڑ کر عالمِ بقا روانہ ہو گئے۔ فضل احمد صدیقی جیسی ہمہ گیر اور ہر دل عزیز شخصیت اب عنقا ہے۔ آپ کی دردمندی اور انسان دوستی کے نقش گہرے ہیں۔

بشکریہ جمیس احمد صدیقی

الحاج حافظ قاری فہیم الدین احمد صدیقی

مولانا حافظ فہیم الدین احمد صدیقیؒ

مولانا حافظ قاری فہیم الدین احمد صدیقی میرٹھی نے ۸۹ سال کی عمر میں صرف آٹھ سال کی مختصر مدت کے دوران قرآن مجید کا آسان اور بامحاورہ اردو میں ترجمہ مکمل کر کے قرآن فہمی کو عام ذہنوں تک کے لئے ممکن بنایا ہے۔

الحاج مولانا فہیم الدین احمد صدیقی ۱۸۸۳ء میں میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کا گھرانہ دینی علوم سے مالا مال تھا۔ حافظ شمس الدین احمد صدیقی آپ کے والد، مبلغ اسلام مولانا شاہ عبدالعلیم صدیقی اور مولانا نذیر احمد خجندی پھوپھی زاد بھائی ہیں۔

مولانا صدیقی نے دینی تعلیم حافظ بدالدین دیوبندی سے حاصل کی۔ فیض عام کالج میں زیرِ تعلیم رہے۔ انگریزی، عربی اور فارسی زبانوں میں دسترس حاصل کی اور تعلیم مکمل کر کے فیض عام انٹر کالج سے وابستہ ہو گئے۔

مولانا فہیم الدین احمد صدیقی ایک دردمند شخصیت کے مالک تھے۔ قوم کے مفاد کو عزیز رکھتے تھے۔ ۱۹۴۸ء میں ناسازگار حالات کو دیکھتے ہوئے ہجرت کی اور پاکستان تشریف لے آئے۔ کراچی میں ایم۔اے جناح روڈ پر واقع ایک تعلیمی ادارے علیمیہ اسکول سے تعلق قائم کیا۔ درس و تدریس میں مصروف رہے اور ۱۹۶۵ء میں سبکدوشی حاصل کی۔

آپ نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ قرآن مجید کے جو تراجم دستیاب ہیں وہ زیادہ عام فہم نہیں ہیں۔ ایک عام پڑھا لکھا شخص ان تراجم کو نہیں سمجھ پاتا۔ آپ چاہتے تھے کہ ترجمہ اتنا آسان اور صاف ہو کہ قاری روانی سے پڑھ سکے۔ ترجمہ اردو قواعد اور محاورات کے مطابق بھی ہو۔ مشکل، ثقیل اور نامانوس الفاظ سے گریز کیا جائے۔ آپ کا خیال تھا کہ جن علماء نے قرآن مجید کے ترجمے کئے ہیں یا تو وہ لفظ بہ لفظ ہیں اور آج سے ستر اسی سال پہلے ہوئے ہیں، اس لئے لشکری زبان میں ہیں جس میں فارسی، سنسکرت، ہندی اور

دی گئی ہے مشکل الفاظ بھی آ گئے ہیں جو رائج الوقت آسان اردو قواعد کے مطابق نہیں ہیں۔ آپ نے صرف سوچا ہی نہیں' اس کام کا آغاز اکتوبر ۱۹۷۶ء میں کیا اور جون ۱۹۸۳ء میں یہ کام مکمل کر لیا۔"
القرآن المبین" کتابت و طباعت کے مراحل طے کر کے پہلی بار ۱۹۸۹ء میں شائع ہوا۔ اب تک اس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور تین ہزار نسخے لوگوں تک پہنچ چکے ہیں۔ اس ترجمے کی عالمی سطح پر پذیرائی ہوئی ہے۔ پیر محمد کرم شاہ ازہری فرماتے ہیں "بڑا سلیس' نہایت رواں اور دل کی گہرائیوں میں اتر جانے والا ترجمہ ہے۔ اس کی کتابت ہر آیت کے سامنے دوسرے صفحے پر اس کا ترجمہ لکھنے کا انداز یہ ساری خوبیاں نرالی ہیں جو عام طور پر تراجم قرآن میں دستیاب نہیں ہوتیں۔" مولانا احمد علی صاحب تحریر کرتے ہیں "حضرت میر تقی صاحب نے بڑی عرق ریزی اور جاں فشانی سے اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچایا ہے۔" مفتی حافظ محمد حسام اللہ صاحب تحریر فرماتے ہیں "مولانا حافظ قاری نعیم الدین احمد صدیقی نے نہایت محنت شاقہ سے قرآن حکیم کا نہایت رواں دواں' شستہ' سلیس' آسان اور عام فہم اردو ترجمہ کر کے اردو پڑھنے لکھنے اصحاب پر احسان عظیم فرمایا ہے۔"

مولانا صدیقی نے ۵۵ مرتبہ نماز تراویح میں کلام پاک سنایا۔ دو بار حج کی سعادت حاصل کی۔ امریکہ کا سفر بھی کیا۔ آپ کے روز و شب کے معمولات میں اسلامی ضابطوں کی پاسداری نمایاں تھی۔

آپ کی اولاد میں سات بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ وسیم الدین صدیقی اور کلیم الدین صدیقی انتقال کر چکے ہیں۔ کراچی میں وسیم باغ وسیم الدین صدیقی کا ہی ہے۔ جس میں مسجد نعیم کی تعمیر کا کام جاری ہے۔ دوسرے صاحبزادگان میں نسیم الدین صدیقی' علیم الدین صدیقی' زعیم الدین صدیقی' قسیم الدین صدیقی اور ڈاکٹر نعیم الدین پاشا مختلف شعبوں میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ مسز غفران مصطفےٰ اور مسز فرقان مصباح الدین آپ کی بیٹیاں ہیں۔

مولانا نعیم الدین صدیقی اکیانوے سال کے ہو چکے تھے۔ ضعیفی کے ساتھ کمزوری بھی بڑھ رہی تھی۔ چار ماہ علیل رہ کر ۲۸ جنوری ۱۹۹۹ء کو مالک حقیقی سے جا ملے۔ پی۔ ای۔ سی۔ ایچ۔ ایس کے قبرستان میں آپ کی تدفین ہوئی۔ آپ سے پہلے ۱۹۵۹ء میں آپ کی اہلیہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ آپ کی وفات پر اعلیٰ حکومتی شخصیات اور اکابرین نے تعزیت کی اور دینی حلقوں میں شدید رنج و غم کا اظہار کیا گیا۔

فیروز قیصر

فیروز قیصر

ممتاز ماہر معاشیات محترم فیروز قیصر کا تعلق ایک ایسے علمی و عملی گھرانے سے ہے جس نے پاکستان کے حصول کی تحریک اور پاکستان کی بقا و استحکام کے لئے دن رات جدوجہد کی۔ آپ کے والد محمد شریف بن ڈاکٹر عبداللطیف معروف قانون داں تھے۔ والدہ بیگم محمد شریف نے تحریک پاکستان میں قائداعظم کی قیادت میں سرگرم حصہ لیا اور خود فیروز قیصر صاحب نے پاکستان میں کئی اہم سرکاری ذمہ داریوں سے بحسن و خوبی عہدہ برآ ہو کر اپنے وطن کی بے لوث خدمت کی۔

فیروز قیصر صاحب ۳ مارچ ۱۹۳۳ء کو بیگم باغ میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ مشنری اسکول میرٹھ میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ گورنمنٹ ہائی اسکول میرٹھ سے ۱۹۴۷ء میں چودہ سال کی عمر میں میٹرک کیا۔ دسمبر ۱۹۴۷ء میں اپنے افراد خاندان کے ساتھ لاہور ہجرت کی اور وہاں سے کراچی منتقل ہوئے۔ ۱۹۵۱ء میں سندھ یونیورسٹی سے بی۔ کام کیا۔ آپ کی زندگی کا یہ یادگار واقعہ ہے کہ جس وقت آپ نویں کلاس میں آئے تو اختیاری مضمون کے لئے والد سے مشورہ کیا۔ انہوں نے کہا کہ بک کیپنگ پڑھو۔ اس پر آپ نے والد سے پوچھا کہ پھر؟ انہوں نے کہا کہ کامرس میں بی۔ کام کرنا۔ فیروز قیصر صاحب نے پوچھا پھر؟ انہوں نے کہا کہ چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ بننا۔ آپ نے پوچھا اس کے بعد؟ والد نے کہا وزیر بن سکتے ہو۔ یہ خوش قسمتی دیکھئے کہ والد کا کہا ہوا پورا ہو گیا اور فیروز قیصر صاحب بی۔ کام کرنے کے بعد لندن چلے گئے اور وہاں آپ نے ۱۹۵۷ء میں چارٹرڈ اکاؤنٹس کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ اپنے قیام کے دوران ایک جرمن دوشیزہ میرین بوک سے متاثر ہوئے اور اپنے والدین کی رضامندی سے ان کے ساتھ کراچی پہنچے۔ میرین بوک نے اسلام قبول کیا اور یہ دونوں اپریل ۱۹۵۸ء میں رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ فیروز قیصر صاحب نے اسی سال کراچی میں فیروز شریف اینڈ کمپنی چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ کی بنیاد رکھی۔ یہ کمپنی ملٹی نیشنل اداروں کی مالی اور ٹیکسز کے امور میں رہنمائی بھی کرتی ہے۔

۱۹۷۲ء میں خصوصی معاون برائے معاشی امور (اکنامک ایڈوائزر) برائے صدر پاکستان کی حیثیت سے آپ کا تقرر ہوا۔ یہ عہدہ وفاقی وزیر کے برابر تھا۔ ایک سال بعد اسی عہدے کے حوالے سے پاکستان کے وزیراعظم کے مشیر ہوئے۔ اسی دور میں پاکستان کی قومی اسمبلی نے آئین منظور کیا۔ فیروز قیصر صاحب انڈسٹریل بورڈ آف مینجمنٹ کے وائس چیئرمین بھی رہے۔ اس بورڈ کے فرائض میں بڑے صنعتی اداروں کا قیام شامل تھا جن میں اسٹیل ملز، ریفائنریز، کیمیکل، فرٹیلائزر، بھاری انجینئرنگ اور سیمنٹ کے شعبوں کے لئے منصوبے بھی تھے۔ ڈھوڈک میں تیل کی تلاش میں کامیابی اسی دور میں ہوئی۔ آپ نے بیرونی سرمایہ کاری کے قوانین اور ایکسپورٹ پروسیسنگ زون کراچی کے قیام کی منصوبہ بندی بھی کی۔

فیروز قیصر صاحب نے ۱۹۷۵ء میں ای۔سی۔اے۔ایف۔ای (اقوام متحدہ کا ادارہ) کی کانفرنس کی قیادت کا اعزاز حاصل کیا۔

آپ کو ۱۹۸۸ء میں منتخب حکومت نے
CONSULTATIVE COMMITTEE ON ECONOMIC POLICY
کا چیئرمین مقرر کیا۔ یہ عہدہ وفاقی وزیر کے برابر تھا آپ نے
COMMITTEE OF EXPERTS ON TAXATION OF AGRICULTURAL INCOME
کے چیئرمین کی ذمہ داریاں بھی سنبھالیں۔ اس دوران میں آپ نے
NEGOTIATIONS OF BILATERAL AGREEMENTS OF AID AND ASSISTANCE
برائے پاکستان میں قومی وفد کی قیادت کا فریضہ انجام دیا۔ فیروز قیصر صاحب سینٹرل بورڈ آف دی اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے دو مرتبہ ڈائریکٹر بنائے گئے۔ آپ شالیمار ریکارڈنگ کمپنی لمیٹڈ (ایس۔ٹی۔این دوم ٹی۔وی نیٹ ورک" کے ڈائریکٹر ہیں۔ کومیکس ایجوکیشنل ٹرسٹ کے ٹرسٹی بھی ہیں۔ کالج آف بزنس اینڈ اکنامکس کراچی اسی ادارے کے زیر اہتمام ہے۔

تقریباً دنیا کے تمام ممالک کا سفر کر چکے ہیں۔ بعض ملکوں میں متعدد بار گئے ہیں۔ دو مرتبہ عمرے کی سعادت بھی حاصل کر چکے ہیں۔ آپ کے صاحبزادے طارق قیصر آرکیٹکٹ ہیں۔ اصفہانی صاحب کی نواسی مونا سے ان کی شادی ہوئی ہے۔ صاحبزادی نیلوفر حیدر امریکہ میں مقیم ہیں۔

قسیم الدین پاشا

قسیم الدین پاشا کی متحرک شخصیت اور ان کی علمی کاوشوں کو WHO IS WHO نے عالمی سطح پر متعارف کرایا ہے۔ آپ ممتاز و مشہور مترجم قرآن مولانا حافظ قسیم الدین احمد صدیقی میرٹھی کے صاحبزادے ہیں۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۴۳ء کو آپ کی ولادت میرٹھ میں ہوئی۔ ۱۹۴۸ء میں والدین کے ہمراہ پاکستان ہجرت کی۔

آپ نے کراچی آکر تعلیمی سلسلے کو قائم رکھتے ہوئے جیکب لائنز کے اسکول میں تعلیم حاصل کی۔ کراچی بورڈ سے میٹرک اور نیشنل کالج کراچی سے انٹر کے امتحانات میں کامیابی حاصل کی۔ بعد میں جامعہ کراچی سے ۱۹۶۳ء میں بی۔اے اور ۱۹۶۷ء میں "ورلڈ افیئرز" میں ایم۔اے کیا۔ دورانِ تعلیم غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتے رہے۔ ۱۹۵۳ء سے ۱۹۷۰ء تک اسٹوڈینٹس ٹائمز انٹرنیشنل کے مدیر اور پاکستان اسٹوڈینٹس انسٹی ٹیوشن کے شعبہ بین الاقوامی امور کے جنرل سیکریٹری رہے۔ ان حیثیتوں میں آپ نے متعدد عالمی سیمیناروں اور کانفرنسوں میں نمائندگی کی۔ طلباء کے لئے HEN-N-COCK BOOK SERIES مرتب کیں جن کو بچوں کے لئے بہت کارآمد تسلیم کیا گیا۔

قسیم الدین پاشا صاحب نے "میرا القرآن" بھی اردو اور انگریزی میں مرتب کیا ہے۔ اس کے دونوں حصوں کو غور سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ یہ ایک غیر معمولی کام کیا گیا ہے۔ دنیا میں یہ پہلا کام ہے۔ یہ کتاب کئی حوالوں سے رہنمائی کرتی ہے۔ کتاب کے دائیں ہاتھ کے صفحات پر عربی متن عربی الفاظ کے ساتھ بمعہ اعراب رومن اسکرپٹ میں دیئے گئے ہیں تاکہ قاری اپنے طور پر خود پڑھ کر اچھی طرح متن کو ذہن نشین کرسکے۔ قاری اس کتاب سے قرآنی حروف ابجد حروف کی شکل لفظوں اور ان کی آوازوں اور تلفظات کے ساتھ بہ خوبی سیکھ سکتا ہے۔ ان کے مترادفات انگریزی علامتوں اور اس طرح کی آوازوں والے انگریزی الفاظ بھی دیئے گئے ہیں۔ اس طرح بچے ہی نہیں' عربی سے ناواقف لوگ بھی صحیح تلفظ کے ساتھ قرآن پاک پڑھ سکتے ہیں۔ یہ کتاب اپنی منفرد افادیت کی وجہ سے مغربی ممالک میں پسند کی جا رہی ہے اور اپنے اندر تبلیغ کا پہلو بھی رکھتی ہے۔

"قصص الانسان والانبیاء" بھی دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پاشا صاحب نے اس کو بھی انگریزی میں

منتقل کیا ہے۔ یہ بھی آپ کی ایک اہم کاوش ہے۔ اس میں بھی عربی الفاظ کے معانی اور ان کے اعراب رومن اسکرپٹ میں لکھے گئے ہیں۔ اہم موضوعات پر آپ کے مضامین معتبر انگریزی روزناموں "ڈان" اور "مارننگ نیوز" کراچی میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ۱۹۹۰ء میں آپ نے یوتھ لائف کی ادارت بھی سنبھالی تھی۔

پاشا صاحب دینی مزاج رکھتے ہیں۔ عصری تقاضوں سے واقف ہیں۔ آپ نے مسلمانوں میں تعلیم کے فروغ کے ساتھ یہ کوشش بھی کی ہے کہ مسلمان بچے دین سے بے بہرہ نہ ہوں۔ آپ نے قرآن فہمی کو انگریزی تعلیم سے آراستہ ذہنوں تک پہنچانے کے لئے آسان انگریزی میں قرآنی مفاہیم بیان کرتے کے ساتھ قرآن پاک کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ یہ ایک اہم خدمت ہے۔ آپ کی یہ محنت بہت مقبول ہوئی ہے اور اسے عالمی سطح پر پذیرائی حاصل ہوئی ہے۔ پاشا صاحب کی ان خدمات کو خراج تحسین پیش کیا جا رہا ہے جب کہ بہت پہلے سابق وزیر اعظم محمد علی بوگرہ سے ان کے دور حکومت میں میڈل حاصل کر چکے ہیں۔

آپ کاروبار پسند کرتے ہیں۔ پائنیر پرائیوٹ لمیٹیڈ کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کے رکن ہیں اور زین پیکیجنگ پرائیوٹ لمیٹیڈ کے سیلز اور مارکیٹنگ کے شعبے آپ کی زیر نگرانی ہیں۔

۱۶ اگست ۱۹۸۲ء کو آپ کی شادی جناب عبدالغفار صدیقی کی صاحبزادی شاہین تحسیم اختر سے ہوئی۔ محترمہ بی۔ اے 'بی۔ ایڈ ہیں۔ ہارورلڈ گرامر اسکول 'نارتھ ناظم آباد کی بانی اور سربراہ ہیں۔ آپ کے بطن سے چار بیٹیاں عائشہ' حفصہ' صبیحہ اور سارہ تسنیم ہیں جو سب تعلیم حاصل کر رہی ہیں اور اپنے والد کے علمی کاموں میں معاون بھی ہیں۔

پاشا صاحب نے اپنے زمانہ طالب علمی اور عملی زندگی کے دور میں کافی سفر کئے ہیں۔ بین الاقوامی اجتماعات میں شرکت کے لئے بھی متعدد بار گئے ہیں۔ مشرق وسطی' مشرق بعید' جنوب مشرقی ایشیاء اور یورپ کے تقریباً تمام ممالک میں کئی کئی بار دورے کئے۔ میرے سوال کے جواب میں آپ نے بتایا کہ لاطینی امریکہ اور آسٹریلیا ہی نہیں گیا ہوں۔ آپ اپنے والد مرحوم کے نام سے منسوب "مسجد تسنیم" کے ڈویلپمنٹ کمیشن کے رکن بھی ہیں۔ نارتھ ناظم آباد کراچی میں مقیم ہیں۔

کرامت شیر خاں

کرامت شیر خاں

کرامت شیر خاں مصور بھی ہیں اور مجسمہ ساز بھی' ادیب بھی ہیں اور ایک اچھے منتظم بھی۔ کھیتی باڑی اور باغبانی سے گہرا شغف رکھتے ہیں۔ مزاج میں انکساری' مہمان نوازی اور ایثار و محبت شامل ہیں۔

آپ کے والد شیر علی خاں محکمہ پولیس سے وابستہ رہے۔ انہوں نے وکالت بھی کی اور ایک سیاسی رہنما کی حیثیت سے بھی پہچانے گئے۔ ۱۲ مئی ۱۹۳۹ء کو میرٹھ میں کرامت نے آنکھ کھولی۔ عنایت شیر خاں' ڈاکٹر رفاقت شیر خاں اور وجاہت شیر خاں آپ کے بھائی ہیں۔ ان چاروں بھائیوں نے اپنے اپنے شعبوں میں نام پیدا کیا۔

کرامت صاحب نے ابتدائی تعلیم میرٹھ کے ایک گاؤں ترزی میں حاصل کی۔ گورنمنٹ ہائی اسکول جنا پور سے میٹرک کیا۔ اسی اسکول میں جوش ملیح آبادی نے بھی تعلیم پائی۔ ۱۹۵۲ء میں میرٹھ کالج سے بی۔ اے کرکے آپ نے سکونت ترک کر کے پاکستان ہجرت کی۔ موصوف ۱۹۵۵ء میں عملی زندگی کا آغاز کرتے ہوئے کراچی کلکٹر سے وابستہ ہوئے اور ترقی کرتے ہوئے اسسٹنٹ کلکٹر کی ذمہ داریوں تک پہنچے اور اسی عہدے سے ۱۹۹۳ء میں ریٹائر ہوئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد وفاقی محتسب کے ادارے میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر کے منصب پر خدمات انجام دیں۔

کرامت شیر خاں صاحب کے مشاغل میں مطالعہ شامل ہے۔ کتب کی اچھی خاصی تعداد آپ کے پاس ہے۔ مضامین لکھتے رہے ہیں جو اخبارات و رسائل میں شائع ہوئے۔ آپ کا پسندیدہ موضوع پاک بھارت تعلقات ہیں۔ فنون لطیفہ میں مصوری اور مجسمہ سازی سے گہرا لگاؤ ہے۔ آپ کے مکان کی دیواروں پر آپ کی بنائی ہوئی پینٹنگز آویزاں ہیں۔

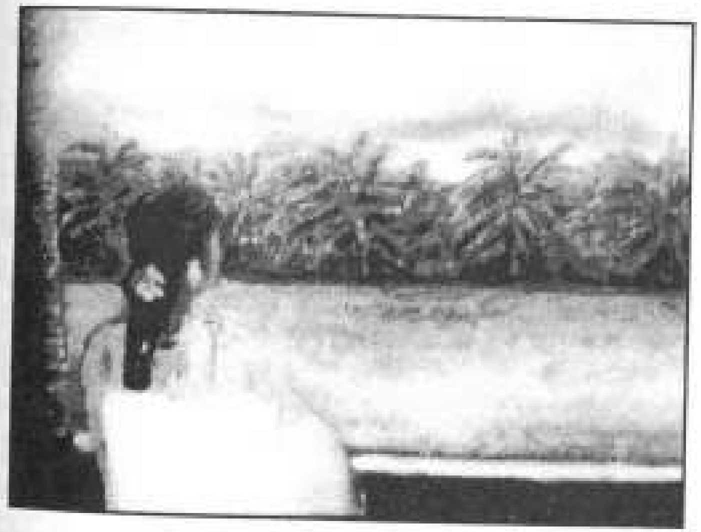

کئی مجسمے بھی بنائے ہیں جو ڈرائنگ روم کی زینت ہیں۔ باغبانی اور کھیتی باڑی سے فطری ذوق ہے۔ موصوف نے گڈاپ میں چودہ ایکڑ رقبہ پر ایک خوبصورت فارم بنایا ہے جس میں سلیقے سے پھل دار درخت لگائے ہیں۔ اس باغ کی سیر کرنے والوں میں صف اول کی علمی ادبی اور سماجی شخصیات شامل ہیں جنھوں نے اپنے تاثرات میں کرامت صاحب کے ذوق باغبانی کو بیحد سراہا ہے۔

کرامت شیر خاں صاحب گھریلو زندگی میں بھی خوش نصیب ہیں ۱۹۵۸ء میں آپ کی شادی ڈاکٹر

کرامت باغ کا ایک منظر

امتیاز احمد خاں شیروانی کی صاحبزادی تسلیم اختر سے ہوئی، جن کے بطن سے چار بیٹے شہاب، فرخ، نیرج اور فراز کے علاوہ دو بیٹیاں سیمیں کرامت اور آشا کرامت ہیں۔

مولانا مفتی محمد کفایت اللہؒ

مولانا مفتی کفایت اللہ میرٹھیؒ کا شمار مشاہیر علماء دیوبند میں ہوتا ہے۔ آپ کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ آپ حضرت شیخ الہندؒ کے خاص شاگرد تھے، عرصے تک رمضان المبارک میں تراویح میں آپ نے کلام پاک حضرت شیخ الہند کو سنایا۔ دارالعلوم دیوبند میں آپ مدرس بھی رہے اور مفتی بھی۔ مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کی زندگی بہت سادہ تھی۔ مسائل علمیہ وفقہیہ میں نظر بہت عمیق اور فقہی مسالک پر آپ کی واقفیت بہت وسیع تھی۔ آپ کے افتاء کی خدمات دارالعلوم جیسے عظیم الشان ادارے کے شایانِ شان تھیں۔ شیخ الاسلام مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ نے "تاریخ دارالعلوم دیوبند" میں تحریر کیا ہے "۱۳۵۸ھ میں حضرت محمد کفایت اللہ میرٹھی مفتی مقرر فرمائے گئے۔ آپ صرف ایک سال تک رہے اور ایک سال میں ۵۸۴۰ فتاویٰ دارالعلوم سے روانہ کئے گئے"۔ مولانا قاسمیؒ کی اس رائے سے آپ کی خدمات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

مولانا محمد ادریس میرٹھیؒ

مولانا محمد ادریس میرٹھیؒ اپنے مخلصانہ دینی جذبے، بے پناہ قوتِ عمل، دین کے لئے انتھک جدوجہد اور گوناگوں دینی وعلمی خدمات کے لحاظ سے ان شخصیات میں سے تھے جو کسی بھی قوم کے لئے باعث فخر ہو سکتی ہے۔

آپ نے دارالعلوم دیوبند میں مشاہیر علماء سے تعلیم حاصل کی، علوم مروجہ میں پختہ استعداد کے حامل تھے لیکن ابتدا میں آپ نے کسی دینی مدرسے کو اپنا مرکز قرار دینے کے بجائے السنہ شرقیہ کے سرکاری امتحانات کی تیاری کے لئے ایک ادارہ قائم کیا جو "ادارہ شرقیہ" کے نام سے ایک عرصہ تک خدمات انجام دیتا رہا۔ السنہ شرقیہ کی تدریس کا یہ ایک ممتاز اور فعال ادارہ تھا۔ اس ادارے سے ہزارہا لوگوں نے استفادہ کرتے ہوئے عربی، فارسی اور اردو کی تعلیم حاصل کی۔ خدمت دین کے جذبے کے تحت بڑی جانی ومالی قربانیوں کے ساتھ رفتہ رفتہ ادارہ شرقیہ کے کاموں کو سمیٹ کر دارالعلوم کورنگی میں تدریس کے فرائض انجام دینے شروع کئے۔

۱۹۵۷ء میں دارالعلوم نانک واڑہ، کراچی کی قدیم عمارت سے حالیہ جدید عمارت میں منتقل ہوا تھا۔ اس وقت دارالعلوم کی زمین جنگلی جھاڑیوں اور ریتیلے ٹیلوں کے درمیان دو پختہ اور ایک زیر تعمیر عمارت پر مشتمل تھی۔ قریب میں ایک قدیم شراقی گوٹھ کے سوا کوئی آبادی نہ تھی۔ ٹیلی فون، پانی، بجلی اور ذرائع آمدورفت نہیں تھے۔ ان حالات میں تدریس کے لئے مولانا محمد ادریسؒ روزانہ دارالعلوم تشریف لاتے تھے۔ آپ کی یہ مشقت مسلسل چار سال تک جاری رہی۔ خاص بات یہ ہے کہ صلے میں کوئی مالی معاوضہ لینا گوارا نہ کیا۔

حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ "برادرِ محترم مولانا محمد رفیع عثمانی اور احقر کو یہ شرف حاصل رہا ہے کہ اس زمانے میں ہم نے "دیوانِ حماسہ" حضرت مولانا سے پڑھا۔ مولانا بڑے لطیف ادبی مذاق کے حامل تھے، اور واقعہ یہ ہے کہ "دیوانِ حماسہ" کے درس کی حلاوت ۳۳ سال گزر جانے کے بعد بھی قلب وذہن میں اسی طرح تازہ ہے اور "دیوانِ حماسہ" کے اشعار ان کے مخصوص آہنگ اور آواز کی اسی گھن گرج کے ساتھ آج بھی کانوں میں گونجتے ہیں، اور بہت سے اشعار کی تشریحات اور اس کے ذیل میں بتائے ہوئے افادات اس طرح یاد ہیں جیسے کل ہی ان سے درس لیا ہو۔ درس کی یہ تاثیر بہت کم اساتذہ کے حصہ میں آتی ہے۔ مولانا ادریس صاحب اپنے حماسہ کے درس میں الفاظ کی لغوی تحقیق اور نحوی ترکیب کے علاوہ شعر کے مختلف ممکن معانی پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالتے اور اس کے ذیل میں عربوں کی معاشرت، ان کی تاریخ، ان کے عادات ونفسیات اور بالخصوص جاہلی اور اسلامی عہد کے درمیان پیدا ہونے والے فرق کی ایسی وضاحت فرماتے کہ طلبہ کے سامنے عرب کی خانہ

بدوش اور قبائلی زندگی کا نقشہ کھنچ جاتا۔ جاہلیت کی شاعری میں مشاہدہ کی جو قوت اور ذہنوں کی نفسیاتی کیفیت کا جو بیساختہ بیان پایا جاتا ہے' اس سے خود بھی لطف لیتے اور پڑھنے والے کو اس لطف میں حصہ دار بناتے"۔

مولانا محمد ادریس صاحب بعد میں حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ کے مدرسے میں جو اب "جامعہ العلوم الاسلامیہ" بنوری ٹاؤن کے نام سے معروف ہے' تدریس شروع فرمائی۔ تدریس کے علاوہ مولانا انتظامی امور میں بھی مولانا بنوریؒ کے دست و بازو تھے اور جب مولانا نے مدرسہ سے ماہنامہ "بینات" جاری کیا تو اس کے مدیر اور طابع و ناشر کی حیثیت سے مولانا محمد ادریسؒ ہی کو منتخب فرمایا۔

دینی مدارس میں تعلیم کے نظم و ضبط اور مستحکم و معیاری تعلیم کے مقاصد کو پیش نظر رکھ کر جب "وفاق المدارس العربیہ" کا قیام عمل میں آیا تو اس وقت کے مشاہیر علماء مولانا خیر محمد صاحبؒ' مولانا محمد یوسف بنوریؒ اور مولانا مفتی محمودؒ جیسے حضرات تنظیم کے رسمی مناصب پر فائز ہوئے لیکن اس بات کا اعتراف ان سب حضرات نے بارہا کیا کہ عملی طور پر وفاق کے کرتا دھرتا اور حقیقت مولانا محمد ادریس ہی تھے۔ پھر مولانا مفتی محمود صاحب کے انتقال کے بعد باتفاق مولانا ادریس صاحب کو وفاق المدارس کا صدر منتخب کر لیا گیا۔ آپ اس عہدے پر آخر تک فائز رہے۔ آپ نے ہی جامعۃ العلوم الاسلامیہ میں تخصص فی الحدیث کا سلسلہ شروع کیا۔ تحریف دین کے خلاف ماہنامہ "بینات" میں جرأت و قیع علمی مقالے لکھے اور ڈاکٹر مصطفیٰ سباعیؒ کی کتاب "السنۃ و مکانتھا فی التشریع الاسلامی" کا ترجمہ فرمایا' جو "سنت کا تشریعی مقام" کے نام سے شائع ہوا۔ یہ ایک بڑی اہم دینی خدمت ہے۔

حضرت مولانا محمد ادریس میرٹھیؒ کو حرمین شریفین کی حاضری کا والہانہ ذوق تھا اور بقول حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب "اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی قابل رشک توفیق بھی ملی' عمر کے آخری بیس پچیس سال سے آپ کا یہ معمول قضا نہیں ہوا کہ وہ رمضان کا عشرہ اخیرہ حرمین شریفین میں گزارتے اور پھر حج کے لئے دوبارہ تشریف لے جاتے' اس طرح سال میں دو مرتبہ کی حاضری ان کا لازمہ زندگی بن گئی تھی"۔

سالہا سال سے ذیابیطس کے مرض کے باوجود آپ کی قوت و ہمت غیر معمولی تھی لیکن ضعف بے حد بڑھ گیا تھا۔ چند قدم چلنا بھی دشوار تھا۔ اس کے باوجود پانچوں نمازوں میں صف اول کی حاضری آخری وقت تک جاری رہی اور درس کی پابندی بھی آخری دم تک اس طرح باقی رہی کہ ٹھیک وفات کے دن بھی تفسیر جلالین کا درس دیا۔ آخری آیت جو طلبہ کو پڑھائی تھی "ان الابرار لفی نعیم" (بیشک نیک لوگ جنت کی "نعمتوں میں ہوں گے)۔ اس درس کے چند گھنٹوں بعد مولانا کی روح جنت کی نعمتوں کی طرف پرواز کر گئی۔ مولانا کی تدفین ۲۵ جمادی الثانیہ ۱۴۰۹ھ کی شب یعنی شب جمعہ میں دارالعلوم کورنگی کے قبرستان میں ہوئی۔ ایک روز پہلے آپ کا انتقال ہوا تھا۔ آپ کی وفات پر مختلف جرائد نے تعزیتی اداریے اور مضامین شائع کئے۔

ماخذ : ماہنامہ "البلاغ" کراچی' جلد ۲۳ شمارہ ۷۔ بشکریہ مولانا عبداللہ میمن

مولانا حکیم محمد اسحٰق

مولانا حکیم محمد اسحٰق کنہور ضلع میرٹھ کے سادات خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ۱۲۸۱ھ بمطابق ۱۸۶۴ء میں آپ کی ولادت ہوئی۔ ابتدائی تعلیم میرٹھ میں اپنے چچا مولانا کفایت علی صاحب سے حاصل کی پھر مدرسہ عالیہ فتح پوری میں پڑھا۔ بعد ازاں امروہہ میں حضرت مولانا احمد حسن امروہوی کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا۔ آخر میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لے کر ۱۳۰۸ھ میں علوم سے فراغت حاصل کی۔ آپ حضرت شیخ الہند کے دور صدارت تدریس کے اولین تلامذہ میں سے تھے۔ مولانا نے طب کی تعلیم حکیم عبدالمجید خاں دہلوی اور حکیم عبدالعزیز خاں لکھنوی سے حاصل کی۔

آپ نے عملی زندگی کا آغاز کنہور میں مطب سے کیا پھر کچھ عرصہ بعد یہ مطب میرٹھ شہر میں منتقل کر دیا۔ یہاں مطب کے ساتھ طب کی تعلیم کا سلسلہ بھی آپ نے جاری رکھا۔ بہت سے لوگوں نے آپ سے طبی علوم پڑھے۔ آپ نے نبض کے موضوع پر فارسی میں ایک ضخیم کتاب بھی لکھی تھی جو طبع نہیں ہو سکی۔

مولانا محمد اسحٰق صاحب دینی اور فلاحی کاموں میں گہری دلچسپی رکھتے تھے اور قومی و سیاسی کاموں میں بھی شریک رہتے تھے۔ اپنے وطن کنہور میں عیدگاہ اور جامع مسجد آپ نے تعمیر کرائی۔ میرٹھ میں بھی ایک نہایت خوشنما عظیم مسجد بنوائی۔ میرٹھ کے اطراف میں عقد بیوگان کو رواج دینے میں آپ کی جدوجہد کا بڑا حصہ ہے۔

۱۳۲۷ھ میں جب دارالعلوم دیوبند کے لئے دیہات سے غلہ فراہم کرنے کی تجویز طے ہوئی تو سب سے پہلے حکیم صاحب نے اس پر لبیک کہا اور کنہور اور اس کے اطراف سے دارالعلوم کے لئے غلہ فراہم کرنے پر توجہ دی۔ غلہ کی خاصی مقدار آپ کی جدوجہد سے فراہم ہوئی۔ روداد دارالعلوم مطبوعہ ۱۳۲۲ھ میں تحریر ہے "سب سے پہلے اس آواز پر کان دھرنے والے اور اس پر عمل کرنے والے حضرات کنہور اور اس کے نواح کے ہیں جو بتوجہ خاص جناب حکیم مولوی محمد اسحٰق صاحب اس پر عمل پیرا ہوئے۔ سالہا سال حکیم صاحب کی توجہ سے ضلع میرٹھ سے گیہوں فراہم ہوتا رہا"۔ روداد مطبوعہ ۱۳۴۷ھ میں مولانا سے متعلق لکھا ہے "اوصاف حمیدہ کے حامل تھے۔ خلوص کے ساتھ دارالعلوم کے معاملات میں فکر و تدبر اور بہی خواہی کا ایک خاص مقام رکھتے تھے"۔

مولانا حکیم محمد اسحٰق صاحب کے بارے میں سید محبوب رضوی نے لکھا ہے "صاحب نسبت اور پابند اوقات بزرگ تھے۔ حضرت گنگوہی سے خلافت حاصل تھی۔ حضرت مولانا حسین احمد مدنی سے بڑی بے تکلفی تھی۔ جب دونوں ملتے تو مولانا مدنی ان کی جیب سے بٹوہ کھینچتے، دیر تک چھینا جھپٹی ہوتی رہتی۔ آخر مولانا کامیاب ہوتے اور بٹوہ لے کر جو رقم نکلتی اس کی مٹھائی منگاتے۔ بڑے خوش اخلاق خندہ جبیں اور متواضع شخصیت تھے۔ جمیعت العلماء ہند سے بھی گہرا تعلق تھا" مولانا دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے ۴۴ھ سے ۱۳۷۳ھ تک ممبر رہے۔ ۱۳۷۳ھ مطابق ۱۹۵۴ء میں آپ نے وفات پائی اور اپنے مالوف میں دفن کئے گئے۔

تاریخ دارالعلوم دیوبند' جلد دوم ص ۱۵۷

اسلام علوی

محمد اسلام علوی

بعض حضرات سے مل کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے شب و روز کا نظم و ضبط ان کے تہ در تہ باطن کے اعتدال و توازن کا آئینہ دار ہے۔ ایسی ہی ایک شخصیت محمد اسلام علوی کی ہے جن کی زندگی فرض شناسی' خدمت اور محنت سے عبارت ہے۔

آپ جون ۱۹۴۰ء میں پیدا ہوئے۔ والد محمد خلیل علوی ہیں۔ ان کا دار السکون پانچ بیٹوں اور پانچ بیٹیوں پر مشتمل تھا۔ ان میں محمد گلزار علوی' محمد اسلام علوی' محمد اقبال علوی اور محمد سلیم علوی مختلف شعبوں میں نمایاں ہیں۔ ایک بیٹے کا انتقال ہو چکا ہے۔ پانچ بیٹیوں میں سے دو بقید حیات ہیں۔ حضرت شمس میرٹھی کے صاحبزادے قمرالدین قمر میرٹھی' محمد خلیل علوی صاحب کے داماد ہیں۔

محمد اسلام علوی صاحب نے بی باغ ہائی اسکول کراچی سے ۱۹۵۶ء میں میٹرک کیا۔ اسلامیہ کالج کراچی اور نیشنل کالج کراچی میں زیر تعلیم رہے۔ کراچی یونی ورسٹی سے پرائیویٹ طور پر کامرس میں گریجویشن کیا۔ عملی زندگی کا آغاز میٹرک کرنے کے ایک سال بعد ایک ادارے میں ملازمت سے کیا۔ پھر جنرل موٹرز اوورسیز کارپوریشن میں ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۳ء تک اور اس کے بعد ایک سال تک میکڈونلڈ لیٹن کا مپنی میں ایک سال کام کیا۔ ۱۹۶۴ء میں جنرل ٹائر اینڈ ربر کمپنی سے وابستہ ہو گئے۔ یہ تعلق قائم ہے اور اس وقت آپ سینیئر منیجر انٹرنل آڈٹ اینڈ ایڈمنسٹریشن ہیں۔ انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف آڈیٹرز کے رکن بھی ہیں۔ آپ نے اپنے شعبہ سے متعلق مختلف کورسز میں شمولیت پسند کی جن میں مینجمنٹ ہائی امپیکٹ:۱۹۸۶ء' ہیومن ایکسی لینس:۱۹۹۵ء اور ری انجینئرنگ ورک شاپ:۱۹۹۷ء شامل ہیں۔

علوی صاحب نے سماجی خدمت کو بھی ہمیشہ اولیت دی۔ آپ کی مصروفیات میں سماجی' ادبی اور ثقافتی کاموں کا بھی بڑا حصہ ہے۔ آپ سیوا کے نائب صدر' ملیر مسلم اسپورٹس کے سرپرست اعلیٰ' آل پاکستان وسیدی کلب' پاکستان سوشل ویلفیئر آرگنائزیشن اور بینس فورم کے سرپرست ہیں۔ احباب میرٹھ کے بھی

رکن ہیں۔ ان اداروں کے علاوہ دیگر انجمنوں سے بھی معاونت کا سلسلہ قائم ہے۔ کتب بینی مشاغل میں شامل ہے۔

۱۹۶۹ء میں محمد افضل علوی صاحب کے صاحبزادی ممتاز بیگم سے آپ نے عقد کیا۔ حنا علوی، صبا علوی اور صدف علوی کے علاوہ ایک صاحبزادے محمد آصف علوی کی تعلیم و تربیت میں مصروف ہیں۔ بیرونی ممالک کی سیاحت کے معاملے میں بھی علوی صاحب خوش نصیب ہیں۔ جاپان، ہانگ کانگ، تھائی لینڈ، سنگاپور، سری لنکا اور کئی مرتبہ بھارت کے علاوہ ۱۹۷۹ء میں سعودی عرب کا سفر کیا اور حج کی سعادت حاصل کی۔ کراچی میں مقیم ہیں۔

محمد اقبال عابد

محمد اقبال عابد

محمد عابد صاحب نے اپنے وطن میرٹھ میں ادبی سرگرمیوں میں خاصا حصہ لیا ہے۔ انھوں نے لال کورتی کے علاقے میں انجمن عروج ادب کی بنیاد رکھی تھی۔ ۱۹۵۴ء میں پاکستان ہجرت کے بعد کراچی میں الصفاء ٹرسٹ قائم کیا۔ جس کے زیر اہتمام جامع مسجد الصفاء تعمیر ہوئی اور مسجد سے ملحق مدرسہ بھی۔ زکوٰۃ کمیٹی کے چیئرمین اور پنچایت کمیٹی کے رکن رہے۔ آپ کی اولاد میں چھ بیٹیوں کے علاوہ تین بیٹے محمد اقبال عابد، سلطان العارفین اور حسین احمد ہیں۔ سلطان العارفین مقامی بینک میں ذمہ دارانہ حیثیت میں ملازم ہیں اور حسین احمد ایک فرم میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔

محمد اقبال عابد کی ولادت ۔۔۔۱۹ء میں ہوئی۔ دہلی بوائز سیکنڈری اسکول کراچی سے ۱۹۷۵ء میں میٹرک گورنمنٹ کالج آف کامرس اینڈ اکنامکس کراچی سے انٹر اور ۱۹۸۰ء میں بی۔ کام کیا۔ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے رحیم جان اینڈ کمپنی چارٹرڈ اکاؤنٹینس سے آرٹیکل شپ مکمل کرنے کے بعد انسٹی ٹیوٹ آف چارٹرڈ اکاؤنٹینس آف پاکستان سے چارٹرڈ اکاؤنٹینٹ کا سرٹیفکیٹ حاصل کیا۔ اپنے شوق کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے ایم۔ بی۔ اے فائینینس کی ڈگری بھی حاصل کی۔ موصوف کمپیوٹر سائنس ڈیپارٹمنٹ کراچی یونیورسٹی میں بحیثیت ممبر وزیٹنگ فیکلٹی تدریس کے شعبے سے بھی وابستہ ہیں۔

محمد اقبال عابد صاحب آج کل ملٹی نیشنل کمپنی میں ڈویژنل ہیڈ فائینینس اینڈ اکاؤنٹنس کے عہدے پر فائز ہیں۔ اس سے پہلے مختلف اعلیٰ اداروں میں خدمات انجام دے چکے ہیں۔ آپ نے مختلف دفتری امور کی انجام دہی کے لئے بیرونی ممالک کے کئی دورے کئے ہیں۔ پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف پبلک فائینینس اکاؤنٹینٹس (ایف۔ پی۔ اے) کے فیلو ممبر ہیں۔

اقبال عابد صاحب کی شادی ۱۹۸۸ء میں بزم جہاں سے ہوئی۔ محترمہ امور خانہ داری میں خاص مہارت رکھتی ہیں۔ صاحبزادے محمد ایان اقبال مقامی اسکول میں زیر تعلیم ہیں۔

محمد اکرم زبیری

محمد اکرم زبیری

میرٹھ کے زبیری خاندان کے فرد میر محمد صاحب کے چار بیٹے تھے۔ بڑے بیٹے محمد حسین نے اپنے بھائیوں کے ساتھ مشرقی پنجاب کی ریاست پٹیالہ میں رہائش اختیار کی۔ یہیں اکتوبر ۱۹۴۳ء میں ان کے ہاں ایک بیٹے کی ولادت ہوئی جس کا نام محمد اکرم رکھا گیا۔ ان کے دوسرے بیٹے محمد اسلم کی پیدائش بھی پٹیالہ ہی میں ہوئی۔ تقسیم ہند کے وقت محمد اکرم صاحب کے والد اور دو چچا قتل کردیے گئے۔ اس طرح عہد طفلی میں ہی اکرم صاحب اپنے والد کے سایہ شفقت سے محروم ہو گئے۔ دادا اپنی سرپرستی میں پاکستان لائے اور انہوں نے خوشاب میں سکونت پسند کی۔ یہیں تعلیم و تربیت کا آغاز ہوا۔

محمد اکرم زبیری صاحب نے گورنمنٹ ہائی اسکول خوشاب سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ پھر گورنمنٹ کالج جوہر آباد سے ۱۹۶۳ء میں گریجویشن کر کے کراچی منتقل ہو گئے۔ ۶۷۔۱۹۶۶ء میں ممتاز قانون دان جسٹس ایس۔ اے۔ نصرت کے ساتھ کام شروع کیا اور سلسلہ تعلیم جاری رکھتے ہوئے کراچی یونیورسٹی سے ایل ایل بی کیا۔ نصرت صاحب ۱۹۷۷ء میں جسٹس ہوئے اور اکرم صاحب نے پھر آزادانہ طور پر پریکٹس شروع کی اور جلد ہی ممتاز وکلاء میں شمار کیے جانے لگے۔ آپ نے پیشہ ورانہ تنظیموں میں بھی سرگرم حصہ لیا۔ ۸۲۔۱۹۸۱ء کے لیے کراچی ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن کے جوائنٹ سیکریٹری منتخب ہوئے۔ ۹۲۔۱۹۸۹ء تک سندھ ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن کے جنرل سیکریٹری رہے۔ ۲۰۰۰۔۱۹۹۷ء کے عرصہ میں اسی ایسوسی ایشن کے وائس پریذیڈنٹ کی حیثیت سے نمایاں خدمات انجام دیں۔ ۲۰۰۱ء میں تین سال کے لیے سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن کے وائس پریذیڈنٹ منتخب ہوئے ہیں۔

آپ کی قانون کی بالادستی کی کوششوں کو سراہتے ہوئے ۱۹۷۶ء میں کراچی میں منعقدہ عالمی جوڈیشل کانفرنس میں گولڈ میڈل پیش کیا گیا۔ آپ نے سرکاری وکیل کی حیثیت سے پاکستان کے قومی اداروں کسٹم، سیلز ٹیکس اور ایکسائز وغیرہ کے معاملات میں حکومت کی نمائندگی کی۔ آئل اینڈ گیس، اسٹیٹ بینک، اسٹیٹ

لائف اور دیگر اداروں کے پینل پر حکومت کے وکیل کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ کہا جاسکتا ہے کہ محمد اکرم زبیری صاحب کے شب و روز خدمت سے عبارت ہیں۔

دسمبر ۱۹۷۰ء میں چچا محمد نذیر صاحب کی صاحبزادی پروین سے آپ کی شادی ہوئی۔ اولاد میں چار بیٹے ارشد حسین، ساجد حسین، واجد حسین اور عاطف حسین ہیں۔ دو بیٹے امریکہ میں زیر تعلیم ہیں۔ دینی مزاج رکھتے ہیں اور تصوف سے خاصا شغف ہے۔ آپ کے قریبی عزیزوں میں مولانا عاشق الٰہی میرٹھی بھی ہیں جو ان کی بہن کے دادا سسر ہیں۔ مولانا کے صاحبزادے ڈاکٹر محبوب الٰہی آپ کے پھوپھا ہیں۔

زبیری صاحب کی پیشہ ورانہ مصروفیات میں غیر ملکی سفر بھی رہے۔ امریکہ، مصر، سنگاپور، ملائیشیا، تھائی لینڈ اور حرب ریاستوں کا دورہ کر چکے ہیں۔ ۱۹۸۹ء سے ہر ماہ رمضان اپنی اہلیہ کے ساتھ مدینہ منورہ میں گزارتے ہیں۔ اس طرح ہر سال مقاماتِ مقدسہ کی زیارت نصیب ہوتی ہے۔

محمد امداد احمد زبیری

آپ کا تعلق ایک ایسے خاندان سے ہے جو دہلی، ملتان، مارہرہ اور میرٹھ کے مسند علم و فضل پر آفتاب بن کر چمکا۔ زبیری قبیلے کے افراد نے علم و ادب، مذہب و سیاست، تاریخ و طب اور تہذیب و ثقافت میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔ اس خاندان کی ایک معتبر شخصیت مولوی فیض احمد بن حکیم دلدار احمد بن حکیم امداد حسین تھے جن کی اولاد میں مولوی حاجی محمد انوار احمد، مولوی محمد حسین احمد، مولوی محمد حسن احمد اور محمد امداد احمد ہیں۔

محمد امداد احمد زبیری کی ولادت ۸ جنوری ۱۹۰۰ء کو میرٹھ میں ہوئی اور ۲۴ مئی ۱۹۷۵ء کو دنیائے فانی سے رخصت ہوئے اپنی پچھتر سالہ زندگی میں آپ نے علم و ادب کی بے لوث خدمت کی۔ امداد صاحب کی ابتدائی تعلیم فیض عام اسکول اور گورنمنٹ اسکول میرٹھ میں ہوئی۔ آپ نے امتیازی نمبروں کے ساتھ علی گڑھ سے گریجویشن کیا۔ دوران تعلیم کل ہند مقابلہ مضمون نویسی بعنوان "اصول صدقات و خیرات اسلام" میں گولڈ میڈل حاصل کیا۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ غیر نصابی مشاغل میں بھی سرگرمی سے حصہ لیتے رہے۔ آپ ایک اچھے اتھلیٹ تھے۔ کرکٹ اور فٹ بال سے بے حد دلچسپی رکھتے تھے۔ تاریخ اور جغرافیہ پسندیدہ مضامین تھے اور ایک اچھے مقرر بھی رہے۔ بی۔ اے کے بعد ایم۔ اے میں داخلہ لیا مگر ایک سال بھی نہ ہونے پایا تھا کہ اپنے بھائی کے اصرار پر حیدر آباد چلے گئے اور وہاں عثمانیہ یونیورسٹی سے بی۔ ایڈ کی ڈگری حاصل کی اور گلبرگہ کالج میں تاریخ کے لیکچرار ہو گئے۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد سیکریٹریٹ کے محکمہ تعلیمات سے وابستہ ہوئے۔ یہاں سپرنٹنڈنٹ تھے۔ آپ کا تبادلہ یہاں سے سیکشن آفیسر کی پوسٹ پر بمبئی ہو گیا۔ یہاں تقریباً" دس سال خدمت انجام دینے کے بعد ۱۹۶۲ء میں ریٹائر ہو کر اپنے وطن میرٹھ واپس آ گئے اور گوشہ نشینی اختیار کر کے تصنیف و تالیف میں مصروف ہو گئے۔ یہ سلسلہ تادم آخر جاری رہا۔

آپ کے گھر میں ایک کتب خانہ تھا۔ آپ کی والدہ حبیب فاطمہ بنت حکیم انوار حسین نے اس کتب خانہ کی بڑی حفاظت کی تھی۔ انھیں کتب کے مطالعہ سے پڑھنے لکھنے کا شوق بڑھا اور دونوں بھائیوں مولوی حسین احمد زبیری اور امداد احمد زبیری نے مل کر اہم کتب تصنیف کر کے خاندانی علمی وراثت کا حق ادا کیا۔ مولوی حسین احمد زبیری کی ایک اہم خدمت "خاندان زبیری کنبوی" کی تالیف ہے۔ ۳۰۸ صفحات پر

مشتمل، یہ کتاب ۱۹۵۰ء میں مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ کے ذریعہ منظر عام پر آئی۔ اس کا دوسرا حصہ ۱۹۵۱ء میں شائع ہوا۔ یہ ۲۲۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ ۱۹۵۳ء میں اس کتاب کا ضمیمہ بھی شائع ہوا۔ اس سال حضرت زبیرؓ بن العوام کی سیرت پر معرکتہ کتاب "الزبیر" بھی منظر عام پر آئی۔ ۳۳۴ صفحات کی اس کتاب میں ۳۶ھ تک کے تمام واقعات کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس میں اصحاب رسولؐ کے نسبی شجرے، عہد رسالت اور عہد خلفائے راشدینؓ کے اہم واقعات پر بھی نظر ڈالی گئی ہے۔ ان کے علاوہ جو کتابیں شائع نہ ہو سکیں ان میں ایک مسودہ سیرت سیدنا حضرت عبداللہ بن زبیرؓ دوسرا سیرت سیدنا حضرت عروہ بن زبیرؓ تیسرا حضرت مصعب بن زبیرؓ کے حالات پر مشتمل ہے۔ چوتھے میں جو "اسلامی و زبیری سندھ اور ہند" کے عنوان سے ہے، اس میں وہ تمام تاریخ بیان کر دی گئی ہے جس میں سندھ و ہند میں مسلمانوں کی فتوحات اور سلطنتیں، خصوصاً" سندھ کی دو سلطنتیں محفوظہ اور منصورہ کے بارے میں اور ان کے متعلق قدیم جغرافیہ دانوں اور مورخین کے بیانات ہیں۔ پانچویں مسودے میں خاندان خواجہ فخرالدین زبیری ملتانی کے حالات ہیں اور چھٹے میں تمام زبیری علماء و فضلاء، اہل طریقت و صاحبانِ شریعت اور امراء و اطباء کے حالات زندگی قلم بند کیے گئے ہیں۔ ان کتابوں کو زبیری انسائیکلو پیڈیا کہا جا سکتا ہے۔ یہ کتب اگرچہ مولوی حسین احمد زبیری کی تالیف کردہ ہیں لیکن ان میں امداد احمد کی خاموش سعی کو بڑا دخل ہے اور ان ہی کی شب و روز کی محنت کی وجہ سے عالم وجود میں آ سکیں۔

امداد احمد زبیری کی تعلیم و پرورش سب مولوی حسین احمد زبیری کی مرہونِ منت ہے چونکہ آپ بچپن ہی میں والد کے سایہ شفقت سے محروم ہو گئے تھے۔ امداد صاحب نے ہمیشہ اپنے بڑے بھائی کو باپ کا درجہ دیا اور انھیں کو آگے بڑھایا۔ خود حسین احمد زبیری صاحب نے ہر کتاب کے دیباچے میں امداد احمد زبیری کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے۔ "خاندان زبیری کنبوی" کی پہلی جلد کے دیباچے میں لکھتے ہیں "سچ پوچھئے تو صرف یہی ایک شخصیت ہے جو اس کام میں ہماری ہر طرح اور ہر وقت شریک رہی۔ یہ برادر عزیزی ہیں جنھوں نے ہمارے علمی ذوق کی رہنمائی کی اور کتابوں کے لکھنے میں باوجود ہمت سے موانعات کے ہم کو تیار کیا۔ خدا نے ان کے خلوص نیت کا یہ ثمرہ عطا فرمایا کہ ہماری تصانیف عالم وجود میں آ سکیں"۔

امداد احمد زبیری صاحب جب پنشن لے کر میرٹھ پہنچے تو حسین احمد زبیری صاحب کافی بوڑھے ہو چکے تھے اور صرف مطالعہ پر اکتفا کرتے تھے۔ اب قلم امداد صاحب نے خود سنبھالا اور باوجود گھریلو پریشانیوں کے قلم سے وابستگی کو قائم رکھا۔ آپ کو صرف لکھنے کا شوق تھا۔ نام و نمود سے دور کا بھی واسطہ نہیں رکھتے تھے۔ تحقیقی و علمی مضامین لوگوں کے بہت اصرار پر بھی کبھی کسی رسالے میں بھیج دیا کرتے تھے۔ آپ نے میرٹھ سے وابستگی کا حق بھی ادا کیا اور میرٹھ کے تعلق سے کئی اہم مضامین تحریر کیے جن میں "قلعہ معلی دہلی کی ایک سیدانی اور شہزادی کی میرٹھ میں آمد و قیام" "شمالی ہند کا مشہور میلہ نوچندی' میرٹھ اور اس کا تاریخی پس منظر' تاریخ کا ایک سنہری ورق: مولوی بشیر الدین زبیری میرٹھی' میرٹھ میں غالب

کے دو ہم نام دوست ' سر سید احمد خاں اور میرٹھ "نواب شیفتہ کے میرٹھ میں قیام کی وجہ ' میرٹھ میں اخبار نویسی ' مقتیٰ ابو محمد خاں میرٹھی وغیرہ شائع ہو چکے ہیں۔ اسکالرز کی رہنمائی بھی پوری دلچسپی سے کرتے تھے۔

امداد احمد زبیری صاحب بزرگانِ دین سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ کلیر شریف میں حضرت حبیب اللہ شاہ چشتیؒ سے شرفِ بیعت حاصل کر چکے تھے۔ اس لئے آپ ہی کے حکم سے ترکِ سکونت نہیں کی۔ آپ کی زندگی پر مذہبی رنگ غالب تھا۔ ایک کتاب "پیرانِ عظام" بھی تحریر کی جس میں اپنے سلسلے کے بزرگوں کا حال تحریر کیا ہے۔ آپ کی دوسری تصنیف "اولیائے میرٹھ" ہے۔ یہ دونوں غیر مطبوعہ ہیں۔ "شیخ جمالی" کے علاوہ آپ کی ایک نادر اور ضخیم کتاب "نواب شہباز خاں" ہے۔ ان کے علاوہ ایک کتاب "شعرائے میرٹھ" ہے۔ یہ بھی شائع نہ ہو سکی۔ امداد صاحب نے اپنے اہم کتب خانہ کی ایک جامع اور تفصیلی فہرست تیار کرنی شروع کی تھی مگر صرف تین سو کتب کی ہی فہرست بنا پائے۔ آپ کی اکلوتی صاحبزادی

سرورق: شیخ جمالی، حیات اور کارنامے
☆ محمد امداد احمد زبیری

لطیفہ زبیری کے پاس تمام کتب کے مسودات موجود ہیں۔ محترمہ نے اپنی ذاتی کوششوں سے ایک کتاب "شیخ جمالی : حیات اور کارنامے" شائع کی ہے اور دوسری کتابوں کی اشاعت کے لئے کوشاں ہیں۔ کاش علمی ادارے اس خزانے کو محفوظ کرنے میں اپنا کردار ادا کریں۔

قاضی محمد اویس

قاضی محمد اویس

خوبصورت اور پُرکشش شخصیت کے حامل قاضی محمد اویس اپنی متنوع خدمات کے حوالے سے شہرت رکھتے ہیں۔ موصوف نے دنیاوی امور بھی ذمہ داری کے ساتھ انجام دیے اور دینی فرائض کی بجا آوری میں بھی صدقِ دل سے کوشاں ہیں۔

قاضی محمد اویس خلف قاضی محمد مستحسن بن قاضی محمد احسن ۱۸ اگست ۱۹۳۹ء کو ہاپوڑ میں پیدا ہوئے۔ فیض عام میں تعلیم حاصل کی جہاں حسن عسکری، عالمتاب تشنہ، اسلام صدیقی اور غیور احمد صاحبان ہم جماعت رہے۔ موصوف انٹر کے بعد عملی زندگی میں آئے اور پبلک سروس کمیشن کے امتحانات میں شریک ہوئے۔

قاضی صاحب اسسٹنٹ ڈائریکٹر جنرل جناح ہسپتال کراچی، نیشنل ہیلتھ لیبارٹریز اسلام آباد، نیو برکلوسس سینٹر کراچی، پوسٹ گریجویٹ کالج آف نرسنگ کراچی، اور کراچی چلڈرن ہسپتال کراچی کے ایڈمنسٹریٹو آفیسر رہے۔ قطر جنرل ہسپتال کراچی کے ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے ۱۹۸۲ء میں خدمات انجام دیں۔ آپ شیخ زید بن سلطان صدر متحدہ عرب امارات کے ابوظہبی پیلس کراچی میں گیارہ سال منیجر بھی رہے۔ قاضی صاحب متعدد ممالک میں منعقدہ بین الاقوامی اور قومی سیمینارز اور کانفرنسوں میں اپنے ملک اور اداروں کی نمائندگی کا اعزاز بھی حاصل کر چکے ہیں۔ آپ کی خداداد صلاحیتوں کے اعتراف میں کئی ایوارڈز بھی پیش کئے گئے ہیں۔

قاضی محمد اویس صاحب متحرک شخصیت ہیں۔ مختلف اقوام کے تہذیب و تمدن سے بخوبی واقف ہیں۔ سیاحت موصوف کا بہترین مشغلہ ہے۔ امریکہ، برطانیہ، فرانس اور کینیڈا کے علاوہ مشرقِ وسطیٰ کے مختلف ممالک کا کئی کئی بار سفر کر چکے ہیں۔ اس کے باوصف دینی رجحان غالب ہے۔ حج کی سعادت ایک سے زائد بار حاصل کرنے کے علاوہ ۱۹۸۳ء سے ہر سال رمضان المبارک کا بابرکت مہینہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں گذارتے ہیں۔ یہ پابندی اس امر کی طرف واضح اشارہ کرتی ہے کہ عشقِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ان کے دل کی دھڑکنوں میں شامل ہے۔ قاضی صاحب کے خاندان کے افراد بھی عالمی سطح کی شہرت رکھتے ہیں۔

آپ کے ننھیالی عزیزوں میں حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی اور ددھیالی رشتہ داروں میں حضرت مولانا شاہ عبدالعلیم صدیقی شامل ہیں۔

گھریلو زندگی میں بھی خوش نصیبی ساتھ رہی۔ آپ کی شادی حلیمہ حسن بانو سے ۱۹۵۳ء میں ہوئی جن کے بطن سے تین بیٹے احسن اویس قاضی، ڈاکٹر ارشد اویس قاضی، اور اسلم اویس قاضی کے علاوہ ایک بیٹی ہما قاضی ہیں۔ یہ چاروں بہن بھائی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ ڈاکٹر ارشد اویس قاضی مشہور مالی سماجی ادارے ایدھی فاؤنڈیشن میں اہم خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ۱۹۹۲ء میں قاضی صاحب کی دوسری شادی محترمہ صابرہ نانجیانی بنت ڈاکٹر برکت علی نانجیانی سے ہوئی۔ برکت علی نانجیانی اور مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناح ساتھ پڑھے ہیں۔

محترمہ صابرہ نانجیانی مشہور تعلیمی ادارے جیکو سکنڈری اسکول کی پرنسپل اور ایڈمنسٹریٹر ہیں۔ یہ وہی اسکول ہے جہاں سابق وزیر اعظم پاکستان محترمہ بے نظیر بھٹو نے بھی تعلیم حاصل کی۔ محترمہ صابرہ نانجیانی نے یہ اسکول مسز جیکو سے ۱۹۷۰ء میں حاصل کیا اور پھر ۱۹۸۳ء میں ممتاز صنعت کار جمشید مارکر سے اسکول کی بلڈنگ بھی خرید لی۔ محترمہ ایک دردمند دل کی حامل شریف الطبع، مہذب اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ذمہ دار خاتون ہیں۔ انہوں نے دولت کو ہمیشہ انسانیت کی خدمت کے لئے وقف رکھا۔ سماجی، تعلیمی، تفریحی، ثقافتی اور ادبی اداروں کی سرپرستی اور دل کھول کر معاونت ان کی شخصیت کا جوہر ہے۔ علم کی قدر دانی میں وہ ہمیشہ اگلی صف میں نظر آتی ہیں۔

قاضی محمد اویس صاحب بچپن سے ہی ادبی ذوق بھی رکھتے ہیں۔ بیت بازی کے مقابلوں میں پابندی سے شریک ہوتے تھے۔ چودہ پندرہ سال کی عمر میں انہوں نے خود بھی شعر گوئی کا آغاز کیا اور قیس تخلص پسند کیا۔ زندگی کی دوسری مصروفیات نے شاعری کی طرف کم متوجہ رکھا اور اب بھی کبھی ہی شعر کہتے ہیں۔ ۱۹۵۱ء میں کہے گئے کلام سے چند اشعار بطور نمونہ پیشِ خدمت ہیں:

آگیا ہوں تنگ یارب گردشِ ایام سے
بس خدا ہی جاں بچائے عشق کے انجام سے

جتنا پردہ کر رہے ہو، بڑھ رہا ہے شوقِ دید
رخ سے زلفوں کو ہٹا کر دو نظارہ بام سے

پوچھئے جلدی ذرا اب رخِ تاباں سے آپ
ہو نہ جائے راز افشا تھے کہاں کل شام سے

ساقیا یہ جان و دل تجھ پر تصدق بار بار
مے پلاتے ہی پلاتے صبح کر دی شام سے

یہ ہوائیں یہ گھٹائیں اور موسم برشگال
کاش ایسے میں نکل آئیں کہیں وہ کام سے

محمد حسین زبیری

محمد حسین خاں زبیری ان علمی شخصیات کی صف میں شامل ہیں جنھوں نے اپنی صلاحیتوں کو ملک و قوم کے لئے وقف رکھا۔ آپ نے تعلیم کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے تعلیمی ادارے بھی قائم کئے اور تدریسی کتب بھی مرتب کیں جن سے لاتعداد طالبانِ علم نے استفادہ کیا۔

آپ ۵ فروری ۱۸۹۷ء کو فجر کے وقت سرادھنہ ضلع میرٹھ میں پیدا ہوئے جہاں آپ کے والد نذیر حسین صاحب بسلسلہ ملازمت مقیم تھے۔ ابتدائی تعلیم فیض عام ہائی اسکول سے حاصل کی اور پھر انٹر تک میرٹھ کالج میں پڑھا۔ ۱۹۱۸ء کی انفلوئنزا کی وبا میں آپ کے والد صاحب کا انتقال ہوگیا جس کی وجہ سے تعلیمی سلسلہ منقطع کرنا پڑا اور محکمہ ڈاک میں ملازم ہوگئے۔ وہاں ایک انگریز افسر سے روزہ افطار کرنے پر تنازع ہوا اور یہ ملازمت ترک کردی۔ اسی واقعہ کی وجہ سے تحریکِ خلافت کی طرف رجحان ہوا اور میرٹھ سے نقلِ مکانی کرکے دہلی میں "آزاد ہند کامرس کالج" قائم کیا۔ تحریکِ خلافت کا زور کم ہونے پر کالج نہ چل سکا اور پھر قوم کے سپوتوں کی تدریس کا بیڑا اٹھانے کی غرض سے اینگلو عربک ہائی اسکول دہلی میں معلمی کا پیشہ اختیار کیا۔ دورانِ ملازمت علی گڑھ سے بی۔ اے۔ کیا اور ۱۹۲۲ء میں آگرہ کے سرسید جناب سعید احمد مارہروی کی بڑی صاحبزادی سے شادی ہوئی۔ ۱۹۲۹ء میں آپ نے علی گڑھ سے بی۔ ٹی کیا اور ۱۹۳۲ء میں جبکہ آپ کے چار بچے ہوچکے تھے ایم۔ اے کیا۔

تعلیمی مشن کو محمد حسین خاں زبیری نے ہمیشہ پیشِ نظر رکھا۔ خواجہ غلام السیدین کے مشورے پر درسی کتب تالیف کرنے کا کام شروع کیا۔ آپ کی درسی کتب یو۔ پی کے علاوہ کشمیر، دہلی اور میسور میں عرصہ تک داخلِ نصاب رہیں۔ آپ کی درسی کتب کی تعداد تقریباً پچپن ہے۔ آل انڈیا ریڈیو دہلی سے مختلف اوقات میں مختلف موضوعات پر آپ کی پچیس تقاریر بھی نشر ہوچکی ہیں۔ ۱۹۳۳ء سے ۱۹۳۶ء تک کیوہ کانفرنس کا ماہانہ جریدہ "زبیری" بھی آپ شائع کرتے رہے جس کے ایڈیٹر، پرنٹر اور پبلشر ہی نہ تھے بلکہ چپراسی تک کا کام خود ہی انجام دیتے تھے۔

زبیری صاحب نے ۸ فروری ۱۹۴۸ء کو ہجرت کی اور کراچی آگئے۔ یہاں گورنمنٹ اسکول جیکب لائن، پاکستان چوک اور کوتوال بلڈنگ میں معلمی کا سلسلہ ۱۹۵۷ء تک جاری رکھا۔ اس کے بعد دو سال تک حالی مسلم ہائی اسکول کراچی کے صدر مدرس رہے۔ پھر اینگلو عربک ہائی اسکول اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے زیرِ اہتمام دہلی اسکول اور انٹر کالج قائم کیا اور دو سال تک بلا معاوضہ تدریسی خدمات انجام دیں۔ اس کے ساتھ ساتھ تصنیف کا سلسلہ بھی جاری رکھتے ہوئے فلسفہ، تاریخ اور تعلیم پر کئی کتابیں تصنیف کیں۔ آپ نے کئی عمرے کئے اور دو بار حج کی سعادت حاصل کی۔ یورپ اور ایران کے مطالعاتی دورے کئے۔ رابطہ عالمِ اسلامی کے لئے آپ نے کام کیا۔

سرورق: خاندانِ زبیری کنبوی، جلد اوّل
☆ مولوی حسین احمد زبیری

سرورق: خاندان زبیری کنبوی، جلد دوم
☆ مولوی حسین احمد زبیری

عمر کے آخری حصے میں تین سال تک بعارضۂ فالج معذور رہنے کے بعد چوراسی سال کی عمر میں ۱۹۸۱ء میں انتقال کیا۔ آپ کے ورثاء میں چھ بیٹے خورشید مصطفیٰ زبیری، محمد مصطفیٰ زبیری، محمود حسین زبیری، سعید حسین زبیری، مسعود حسین زبیری اور محبوب حسین زبیری کے علاوہ دو بیٹیاں ہیں۔ ڈاکٹر محمد مصطفیٰ زبیری لندن میں مقیم ہیں۔ انہیں برطانوی حکومت نے .R.F.() کے خطاب سے نوازا ہے۔ محمود حسین زبیری امریکہ میں رہائش پذیر ہیں۔ محمد حسین زبیری مرحوم کی اہلیہ نے ۱۹۸۷ء میں انتقال کیا۔ زبیری صاحب کے پوتے پوتیاں اور نواسے نواسیاں مختلف شعبوں میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ آپ کے لاتعداد شاگردوں میں سے بہت سے حکومتِ پاکستان، اقوام متحدہ اور دیگر عالمی اداروں کے مختلف شعبوں اور تجارت سے وابستہ ہیں اور اپنے مرحوم استاد کا ذکر بڑے احترام سے کرتے ہیں۔

محمد حسین زبیری صاحب کی ذاتی صفات میں نظام الاوقات کی سختی سے پابندی، اسلامی اور خاندانی اقدار کی پاسبانی اور عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نمایاں ہیں۔ مسلسل جدوجہد اور محنت آپ کی زندگی کا خاصہ رہا۔ بلاشبہ آپ کی زندگی دوسروں کے لئے رہنما ہے۔

بہ شکریہ: سعید حسین زبیری

سید محمد سلیم

ممتاز ماہر زراعت سید محمد سلیم کی ولادت ۷ جون ۱۹۳۰ء کو میرٹھ میں ہوئی۔ آپ کے والد سید عبدالجلیل ایک خوش حال اور باعزت گھرانے کے فرد تھے۔

سید محمد سلیم ایگری کلچر سائنس میں گریجویٹ ہیں۔ ۱۹۵۷ء میں گریجویشن کے ساتھ ہی آپ نے عملی زندگی کا آغاز کیا اور محکمہ زراعت صوبہ سندھ میں ایگری کلچرل اسسٹنٹ کی حیثیت سے ملازمت اختیار کی۔ ۱۹۶۳ء میں ترقی کرتے ہوئے مغربی پاکستان کی ایگری کلچرل کارپوریشن کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ ۱۹۶۵ء میں ملٹی نیشنل کمپنی سیبا گائیگی کے ایگرو کیمیکل ڈویژن سے منسلک ہوئے۔ سیبا گائیگی سے دس سالہ وابستگی میں گائیگی نے اگرچہ کام کی ابتدا کی تھی مگر کمپنی نے نہایت قلیل مدت میں قابلِ رشک کامیابیاں حاصل کیں۔

ایس۔ ایم سلیم صاحب نے ۱۹۷۵ء میں ڈو کیمیکل کمپنی میں کنٹری منیجر پاکستان کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ آپ نے دفتر قائم کر کے سیلز ٹیم منظم کی اور کمپنی کے اثاثوں میں گراں قدر اضافہ کیا۔ کمپنی نے سلیم صاحب کی وسیع خدمات کے اعتراف میں دو مرتبہ گرین ڈائمنڈ ایوارڈ آف پیسفک ایریا پیش کئے اور متعدد بار نقد رقومات کے ذریعہ آپ کی خدمات اور کارکردگی کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ ۱۹۹۳ء میں کمپنی نے اپنے کئی شعبہ جات فروخت کر دیئے۔ اس طرح یہ اٹھارہ سالہ وابستگی ختم ہوئی۔ سلیم صاحب نے ۱۹۹۳ء میں اپنی ایک کمپنی پی۔ ایل قائم کی۔ آپ اس کمپنی کے منیجنگ ڈائریکٹر ہیں۔

ایس۔ ایم۔ سلیم صاحب نے اٹھائیس سال ملٹی نیشنل اداروں میں اپنی توانائیاں صرف کیں۔ اپنے فرائض کی انجام دہی کے لئے ایشیائی ممالک کے دورے کئے۔ آپ زرعی، صنعتی اور اقتصادی معاملات پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ تھائی لینڈ، ملائیشیا اور انڈیا کے ترقیاتی منصوبوں کا دلچسپی سے مشاہدہ اور تجزیہ کرنے میں سلیم صاحب کو کمال حاصل رہا ہے۔

آپ نے متعدد صنعتی انتظامی کورسز اور سیمیناروں میں شرکت کی۔ کئی تربیتی کورسز سے بھی استفادہ کیا۔ حکومتِ پاکستان کے زیرِ اہتمام ۱۹۹۱ء میں منعقدہ انٹرنیشنل انویسٹمنٹ کانفرنس میں نمائندگی کا اعزاز بھی آپ کو حاصل ہے۔

اس تمام مدتِ کار میں اپنے شعبوں کی تنظیموں میں بھی ایس۔ ایم۔ سلیم صاحب نے فعال کردار ادا کیا۔ دو مرتبہ یعنی ۱۹۸۴ء اور ۱۹۸۵ء میں پاکستان اگری کلچرل سائنٹسٹس ایسوسی ایشن کے چیئرمین منتخب ہوئے۔ ۹۱-۱۹۹۰ء اور ۹۲-۱۹۹۱ء میں امریکن بزنس کونسل آف پاکستان کی ایگزیکٹو کمیٹی کے ممبر چنے گئے۔ آپ پرانے روٹرین بھی ہیں۔ دو مرتبہ روٹری کلب آف کراچی سینٹرل کے صدر رہ چکے ہیں۔

ذاتی زندگی میں بھی خوش نصیبی سلیم صاحب کے ساتھ رہی۔ آپ کی شادی جناب ضیاء الدین احمد کی صاحبزادی محترمہ فاریہ ضیاء سے ہوئی۔ آپ کی اولاد میں مظہر سلیم (پ: ۱۹۶۹ء)، سحر سلیم (پ: ۱۹۷۲ء) اور عمر سلیم (پ: ۱۹۸۵ء) ہیں۔ مظہر سلیم کیمیکل انجینئرنگ میں نیو جرسی انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی سے ۱۹۹۶ء میں گریجویشن کرنے کے بعد اپنی فیملی کمپنی میں کام کر رہے ہیں۔ سحر سلیم نے سینٹ جوزف گرلز کالج کراچی سے ۱۹۹۵ء میں گریجویشن کیا۔ ان کی شادی عامر حسن خان سے ہوئی۔ عمر سلیم بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

سید محمد فضل

سید محمد فضل

میرٹھ میں ایک مشہور علاقہ بنی اسرائیل ہے جسے اب محلہ بنی سرائے کہتے ہیں۔ اسی رہائشی علاقہ میں حکیم محمود الحق روڈ ہے۔ حکیم صاحب کا تعلق شاعرات کے پہلے تذکرہ نگار اور معروف شاعر حکیم فصیح الدین رنج میرٹھی کے نسلی سلسلے سے ہے۔ اسی خاندان کی ملک گیر سطح پر شہرت رکھنے والی شخصیت حکیم سیف الدین احمد کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ حکیم محمود الحق صاحب کے ایک بھائی عرفان الحق صاحب تھے۔ ان کے داماد سید عبدالجلیل صاحب کی رہائش گاہ بھی محلہ بنی سرائے میں تھی۔ ممتاز صحافی سید محمد فضل، محترم سید عبدالجلیل کے منجھلے صاحبزادے ہیں جن کی ولادت آبائی مکان میں ۲۸ مارچ ۱۹۳۵ء کو ہوئی۔

سید محمد فضل نے ابتدائی تعلیم کے بعد گورنمنٹ ہائی اسکول میرٹھ میں داخلہ لیا جہاں اگست ۱۹۴۷ء تک زیرِ تعلیم رہے۔ اس وقت ساتویں کلاس میں زیرِ تعلیم تھے۔ تقسیمِ ملک کے بعد اپنے والدین کے ہمراہ ۱۹۴۷ء میں پاکستان آئے۔ اس خاندان نے کراچی میں رہائش اختیار کی۔ یہاں این۔ جے۔ وی ہائی اسکول میں تعلیمی سلسلہ قائم رکھتے ہوئے ۱۹۵۱ء میں میٹرک کیا پھر اسلامیہ کالج کراچی سے ۱۹۵۹ء میں بی۔ اے۔ اور ۱۹۶۱ء میں پولیٹیکل سائنس میں ماسٹرز کی اسناد حاصل کیں۔ اس سے ایک سال پہلے صحافت میں ڈپلومہ کر چکے تھے۔ ۱۹۶۳ء میں جرنلزم میں کراچی یونیورسٹی سے ایم۔ اے۔ کر کے اپنی تعلیم مکمل کی۔

آپ نے صحافتی زندگی کا آغاز ۱۹۶۱ء میں اے۔ پی۔ پی سے کیا اور پھر خبر رساں ایجنسی پی۔ پی۔ آئی میں رپورٹر کی حیثیت سے شمولیت اختیار کی۔ ۱۹۶۳ء میں رپورٹر کی حیثیت سے روزنامہ "ڈیلی نیوز" سے وابستہ ہوئے۔ ترقی کرتے ہوئے ۱۹۷۰ء میں نیوز ایڈیٹر ہوئے۔ ۱۹۸۰ء میں پاکستان اینڈ گلف اکنامسٹ میں سینئر اسسٹنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے شامل ہوئے۔ ۱۹۸۵ء میں آغا مسعود حسین کی معاونت سے ہفت روزہ "ریڈرز" جاری کیا اور ریڈرز پبلی کیشنز کے نام سے ایک اشاعتی ادارے کی بنیاد رکھی۔ پانچ سال بعد

ڈیلی نیوز سے ایڈیٹر کی حیثیت سے دوبارہ وابستہ ہوئے۔ یہ تعلق برقرار ہے۔

سید محمد فضل صاحب نے پیشہ ورانہ تنظیموں میں بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ ۷۰-۱۹۶۹ء اور ۷۱-۱۹۷۰ء میں کراچی پریس کلب کے سیکریٹری منتخب ہوئے۔ ۱۹۷۲ء میں نائب صدر چنے گئے۔ اس وقت کامن ویلتھ جرنلسٹ ایسوسی ایشن پاکستان کے صدر کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔

موصوف کی شادی ۱۹۷۲ء میں فردوس صاحبہ سے ہوئی۔ محترمہ سینٹ پیٹرک ہائی اسکول کراچی میں سینئر انگلش ٹیچر ہیں۔ آپ کی اولاد میں آنسہ دانش فضل، سید جنید احمد اور سید عبید احمد ہیں۔ آنسہ دانش فضل مقامی بینک میں اسسٹنٹ منیجر، جنید احمد ایک کمپنی میں ایڈمنسٹریشن آفیسر اور عبید احمد چارٹرڈ اکاؤنٹینسی سے وابستہ ہیں۔

سید محمد فضل اپنی ذاتی صفات کے حوالے سے ایک پرکشش شخصیت کے مالک ہیں۔ دھیمے لہجے میں گفتگو کرتے ہیں۔ مشرقی اقدار کو عزیز رکھتے ہیں اور علمی کاموں میں دلچسپی لیتے ہیں۔ حلقۂ احباب بھی وسیع ہے۔ اپنے شعبہ میں قدر و منزلت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔

مولانا حکیم محمد مصطفیٰؒ

آپ کے والد ماجد مردان علی بڑے عہدیدار اور خطاب یافتہ کارگزار کے ساتھ ہی نہایت دیندار تھے۔ انہوں نے اپنے سب بیٹوں کو انگریزی کی بجائے عربی دینی تعلیم دلائی۔ مولانا حکیم محمد مصطفیٰ نے مختلف مدارس میں دینی تعلیم حاصل کی اور پھر حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے مروجہ دینی کتب پڑھ کر تعلیم مکمل کی۔ آپ کی استعداد علمی بہت پایہ کی تھی اور عربی ادب کے بڑے ماہر تھے۔ سب سے پہلے حکیم الامت کے مواعظ کو آپ نے قلم بند کرنا شروع کیا تھا جو بعد میں بڑی رحمت ثابت ہوا۔

مولانا حکیم محمد مصطفیٰ نے مولانا اشرف علی تھانویؒ کی مشہور تصانیف الانتہابات المفیدہ عن الاشتباہات الجدیدہ، شوق وطن، بہشتی زیور، بہشتی گوہر، مناجات مقبول، مجالس الحکمت، امثال عبرت اور مجربات وغیرہ کے تراجم و تشریحات بڑے سلیس انداز میں اردو میں قلم بند کئے۔ حضرت کی تقریر کے نوٹ عربی میں بطور مختصر نویس لیا کرتے تھے اور پھر سہل اردو میں پھیلا دیا کرتے تھے۔ اس طرح آپ نے مولانا کے بے شمار وعظ قلم بند کر کے شائع کئے۔

مولانا حکیم محمد مصطفیٰ صاحب کا شمار فن طب کے ماہرین میں ہوتا تھا۔ میرٹھ کے ایک حاذق طبیب کی حیثیت سے شہرت رکھتے تھے۔ بہت سے نافع اور عجیب و غریب مرکبات کے موجد تھے۔ نہایت لطیف الطبع اور ذکی الحس تھے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات کسی کے نقش تحریر سے اخلاق و مزاج کی کیفیت معلوم کر لیتے تھے اور فاسق و متقی کے قارورں میں فرق کر لیتے تھے۔ آپ نے بہشتی زیور کے حصہ نہم اور بہشتی گوہر میں سب اصناف و امراض کے متعلق اپنے خاص خاص تجربات بے دریغ تحریر فرما کر نہایت مفید معالجات و تدابیر طبیہ درج فرمائی ہیں۔

مولانا حکیم محمد مصطفیٰ صاحب تصنیف و تالیف سے بھی گہرا شغف رکھتے تھے۔ آپ کی تصانیف میں معمولات اشرفیہ، مجالس الحکمت، امثال عبرت مشہور ہوئیں۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ارشد خلفاء میں سے تھے۔ حافظ محمد اکبر شاہ نے تحریر کیا ہے کہ "آپ کو تقویٰ کا بہت اہتمام تھا۔ دقیق دقیق شوائب نفس پر نظر رہتی تھی۔ صدق و خلوص آپ کا شعار اور عبدیت و انکسار آپ کا حال تھا۔ سفر حج میں موٹر چلانے والے نماز کے وقت جب کسی طرح موٹر روکنے پر راضی نہ ہوئے تو آپ چلتی موٹر سے کود نے پر

بیمار ہو گئے لیکن خدا کی شان موٹر میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی اور اسے خود بخود رکنا پڑا۔ آپ کارہائے خیر کے بے حد حریص تھے اور مساکین کا نہایت توجہ کے ساتھ مفت علاج کرتے تھے۔ بڑی عمر میں کلام پاک حفظ کیا اور حافظوں کو لقمہ دینے میں خاص طور پر ماہر تھے۔ "مولانا ظفر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں "حضرت حکیم صاحب' حضرت اقدس حکیم الامت تھانویؒ کے شاگرد بھی تھے' مرید بھی' پھر خلافت سے بھی سرفراز ہوئے "ان کی علمی قابلیت کا اندازہ ان کی تصانیف سے ظاہر ہے' حکیم صاحب اگر طب کا مشغلہ اختیار نہ کرتے اور درس و تدریس کا شغل اختیار کرتے تو بڑے بڑے علماء کے ہمسر ہو جاتے' اللہ تعالیٰ نے ان کو فہم و فراست عطا فرمائی تھی اور اس کے ساتھ۔ تقویٰ کی دولت سے بھی نوازے گئے تھے' مکائد نفس پر بڑی گہری نظر تھی۔ تربیت السالک' میں آپ کے خطوط کے جوابات حضرت حکیم الامت نے بڑی تفصیل سے دیئے ہیں' حکیم الامت' حضرت حکیم صاحب کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے تھے: "حکیم مصطفیٰ صاحب فقیہ النفس ہیں' مکائد نفس پر گہری نظر رکھتے ہیں۔"

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے حکیم محمد مصطفیٰؒ کا خاص تعلق تھا۔ حضرت آپ کی بڑی عزت و قدر کرتے تھے۔ تمام خلفاء میں غالبا" حکیم صاحب ہی کی ذات ایسی ہے جس پر حضرت کا کبھی عتاب نہیں ہوا۔

کاروانِ تھانوی' ص ۲۲۳تا۲۲۵

مولانا محمود الحق حقی

مولانا محمود الحق حقی کی ولادت میرٹھ میں ہوئی۔ ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ نے وکالت کا آغاز کیا اور جلد ہی ضلع بھر کے نامور اور مشہور وکلاء کی صف میں آپ کا شمار ہونے لگا۔ موکلوں کا ایک ہجوم آپ کے پیچھے دوڑتا پھرتا تھا۔ کئی کلرک آپ کی معاونت کرتے تھے۔ ان تمام مصروفیات کے باوجود مولانا محمود الحق حقی دینی اور فلاحی کاموں میں پیش پیش رہتے تھے۔ کار خیر کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ مولانا نے ہردوئی میں انجمن اسلامیہ کے نام سے ایک انجمن قائم کی تھی جس کے مقاصد میں مسلمانوں کی دینی اور دنیاوی تعلیم اور یتیموں اور بیواؤں کی امداد شامل تھی۔

مولانا محمود الحق حقی نے اپنی مسلسل مساعی سے ضلع میرٹھ میں بہت سے دینی مدارس اور اسکول قائم کئے تاکہ طلباء کو بہتر تعلیمی سہولتیں مہیا کی جائیں۔ آپ کی ان خدمات کو بڑے پیمانے پر سراہا گیا اور عوام آپ کو ہردوئی کا سرسید کہنے لگے۔ مولانا کے اخلاق حسنہ کے عوام و خواص گرویدہ تھے۔ آپ حقوق العباد کا خاص خیال رکھتے تھے۔ مزاج میں مروت و خلوص بے انتہا تھا۔ زہد و تقویٰ جزو زندگی رہا۔ آپ کی زندگی میں سادگی کو بڑا دخل تھا۔ اپنے شیخ مولانا اشرف علی تھانویؒ سے بیحد عشق تھا۔ جب بھی موقع ملتا حضرت کی خدمت میں تھانہ بھون پہنچ جاتے تھے۔ مولانا کے ملفوظات کا مطالعہ بڑے انہماک اور ذوق و شوق سے کرتے تھے۔ مولف کاروان تھانوی نے تحریر کیا ہے "آپ کی اہلیہ اپنے لڑکے مولانا ابرار الحق کی شادی اپنے خاندان میں کرنا چاہتی تھیں مگر جب آپ کو اپنے شیخ کی مرضی و منشا معلوم ہوئی کہ ان کی شادی ڈاکٹر احمد علی شاہ کی لڑکی سے کرنا چاہتے ہیں تو آپ نے اپنے خاندان والوں کی منشا کے خلاف اپنے شیخ کی خواہش پر عمل کرتے ہوئے وہیں شادی کی۔" حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ بھی آپ کا بہت خیال رکھتے تھے اور "آپ کو اپنا مجاز صحبت مقرر کیا تھا۔ ۱۹۴۶ء میں آپ کا انتقال ہوا۔

کاروانِ تھانوی' ص ۱۴۹

سید محمود حسن اشرف

سید محمود حسن اشرف

حضرت سید آلِ حسن اشرفی جیلانی کا شمار سلسلہ عالیہ اشرفیہ کے اکابرین میں ہوتا ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں حضرت اشرفی میاں کے تقریباً" ساڑھے چھ ہزار خلیفہ ہوئے۔ ان سب میں حضرت سید آلِ حسن صاحب ایک نمایاں حیثیت اور شان رکھتے تھے۔ حضرت کے اس مقام و مرتبہ کو دیکھتے ہوئے ان کے وصال کے بعد ان کے مشن کو فروغ دینے کے لئے ان کے جانشین کے تقرر کا فیصلہ ہوا۔ ۵ رمضان المبارک ۱۳۷۸ھ مطابق ۱۵ مارچ ۱۹۵۹ء بروز اتوار حضرت سید آلِ حسن کے وصال کے بعد سوئم والے دن یعنی ۷ رمضان المبارک ۱۳۷۸ھ مطابق ۱۷ مارچ ۱۹۵۹ء کو کراچی کے مشائخ اور حضرت کے مریدین کے اجتماع منعقدہ جامع مسجد آرام باغ کراچی' حضرت کے اکلوتے صاحبزادے سید محمود حسن اشرف کی دستاربندی ادا ہوئی۔ اس طرح سید محمود حسن اشرف اپنے والد محترم کے پہلے جانشین قرار پائے۔ اس جانشینی کی توثیق بعد میں مرکز سے بھی ہو گئی۔ اس طرح گذشتہ بیالیس سال سے سید محمود حسن اشرف صاحب اس منصب جلیلہ پر فائز ہیں۔ موصوف اپنے سلسلے کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کر رہے ہیں۔

سید محمود اشرف کی تربیت ان کے والد نے اپنی ذاتی نگرانی میں کی ہے۔ گیارہ سال کی عمر میں ہاپوڑ کے گورنمنٹ اسکول سے اٹھا کر اپنے ساتھ دہلی لے گئے تھے۔ وہاں انہوں نے نیو کیمبرج اسکول کناٹ سرکس نئی دہلی میں جونئیر کیمبرج کلاس میں داخل کر دیا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں اپنے والد بزرگ کے ساتھ ہی دہلی سے نقلِ وطن کر کے پاکستان آ گئے۔ اس وقت آپ کی والدہ اور دیگر عزیز ہاپوڑ ہی میں تھے۔

پاکستان آنے کے بعد کچھ عرصہ این جے وی ہائی اسکول کراچی میں تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد لاہور جا کر پنجاب یونیورسٹی سے میٹرک کا امتحان پاس کر کے ایک سال دیال سنگھ کالج لاہور میں پڑھتے رہے لیکن والد نے پھر اپنے پاس کراچی طلب کر لیا جبکہ والدہ صاحبہ اور ہمشیرگان سب لاہور ہی میں رہتے تھے۔ کراچی میں سندھ مسلم کالج میں داخل ہو کر بی۔ اے کی سند حاصل کی اور اس کے بعد ایک سال

کراچی یونیورسٹی میں شعبہ تاریخ میں پڑھتے رہے۔ اس دوران کلیم میں حاصل کی گئی جائداد کے انتظام و انصرام کے سلسلے میں سلسلۂ تعلیم منقطع ہو گیا۔ ۱۹۵۹ء میں حضرت سید آلِ حسن کے وصال کے بعد والدہ صاحبہ ایک مرتبہ پھر لاہور جانے پر مصر ہوئیں اور وہیں ۱۱ نومبر ۱۹۶۲ء میں حضرت سید محمود حسن اشرف کی شادی علامہ ہارون احمد جدت میرٹھی کی صاحبزادی محترمہ مرزمان زہنت میرٹھی سے کر دی گئی۔ آپ کے تین صاحبزادے سید مسعود اشرف' سید آلِ حسنین' اور سید علی رضا اور دو صاحبزادیاں سیدہ میمونہ انور علی اور سیدہ فریدہ افضال ان محترمہ سے بفضلِ تعالیٰ بقیدِ حیات ہیں۔ لڑکوں میں سے دو کی شادی ہو چکی ہے اور دونوں لڑکیاں بھی اپنے اپنے گھروں میں خوش و خرم زندگی بسر کر رہی ہیں۔

حضرت سید آلِ حسن اشرفی جیلانی کا مزارِ مبارک واقع کلفٹن متصل درگاہ حضرت سید عبداللہ شاہ غازی مرجعِ خلائق ہے۔ ان کا عرس ہر سال ۵ رمضان المبارک سے شروع ہو کر ۷ رمضان المبارک تک حضرت سید محمود حسن اشرف کی سربراہی میں ہی گذشتہ بیالیس سال سے بڑے تزک و احتشام سے منعقد ہوتا ہے۔ پاکستان کے ہر حصہ سے لوگ قافلوں کی شکل میں آ کر عرس میں شریک ہوتے ہیں۔ ان تمام انتظامات کی نگرانی سید محمود حسن اشرف صاحب ذاتی طور پر فرماتے ہیں۔

موصوف انسانی اوصاف کا پیکر ہیں۔ انتہائی خلیق اور متواضع ہیں۔ گفتگو میں لفظوں کا زیر و بم ظاہر کرتا ہے کہ دل آزاری سے گریز کرتے ہیں۔ دوسروں کی گفتگو کو توجہ سے سنتے ہیں۔ خاندانی وقار کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ اکثر علماء و مشائخ سے آپ کے گہرے مراسم ہیں۔ آپ کی شریکِ سفر بھی ایک علمی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں اور شعری ذوق بھی خاصا ہے۔ زہنت تخلص فرماتی ہیں۔

افسوس شاہ صاحب ۲۱ اگست ۲۰۰۲ء میں جہانِ رنگ و بو سے رخصت ہوئے۔ آپ کی آخری رسومات میں ہزاروں افراد نے شرکت کی۔ اپنے والدِ محترم کے پہلو میں کلفٹن میں سپردِ خاک کئے گئے۔ صابر براری نے قطعۂ تاریخِ وفات کہا:

صد حیف ہوئے رخصت وہ عالمِ فانی سے
مصروف رہے ہر دم جو رُشد و ہدایت میں
آئی یہ صدا غیبی ہے ان کا سنِ رحلت
''محمود حسن اشرف آباد ہیں جنت میں''

۱۴۲۳ھ

شیخ مدار بخش

شیخ مدار بخش کے مورث اعلیٰ شیخ معین الدین موضع آریل (الہ آباد) میں پیدا ہوئے۔ ان کے فرزند اکبر شیخ ضیاء الدین تھے۔ قلعہ الہ آباد میں شاہ عالم ثانی' ان کے شاہزادگان اور جملہ متوسلین جو حکومت برطانیہ کے پاس بطور یرغمال تھے' ان سب کی تمام ضروریاتِ زندگی کی فراہمی کا ٹھیکہ انہیں کے پاس تھا۔ شیخ ضیاء الدین کے دو بیٹے تھے۔ شیخ مدار بخش اور شیخ محمد تقی۔ شیخ مدار بخش نے اپنے بھائی کے ساتھ مل کر خاندان کو استحکام بخشا۔

شیخ مدار بخش کی حاکمانِ وقت بڑی قدر و منزلت کرتے تھے۔ جب دو آبہ کی فتح کے تین سال بعد انگریزوں نے ۱۸۰۶ء میں میرٹھ میں فوجی چھاؤنی قائم کی تو کمسریٹ کا جملہ ضروری سامان مہیا کرنے کا کام آپ کے سپرد ہوا۔ لہٰذا آپ میرٹھ میں قیام پذیر ہو گئے اور اس شہر کو اپنا کاروباری مرکز قرار دے دیا۔ جنگ بھرت پور ۱۸۲۶ء اور جنگِ افغانستان ۱۸۳۹ء میں جملہ سامان کی سپلائی کے ٹھیکے آپ ہی کے پاس رہے۔

شیخ مدار بخش نے میرٹھ میں قیام کے لئے لال کرتی کے علاقہ میں ایک وسیع آراضی حاصل کر کے اپنی رہائش کے لئے مکانات تعمیر کرائے۔ چونکہ آپ دین سے گہری وابستگی رکھتے تھے اس لئے اسی احاطہ میں ایک عالی شان مسجد تعمیر کرائی جو آپ کی عبودیت کا شاہکار ہے۔ کاروبار میں استحکام پیدا ہو جانے کے بعد آپ نے میرٹھ اور اس کے قرب و جوار کی تحصیلوں میں زرعی اور سکنی جائیدادیں خریدیں۔ کاروبار کی فراوانی اور دوسرے دنیاوی کاموں میں انہماک کے باوجود آپ کی عبودیت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ آپ نے سلسلہ نقشبندیہ کے ایک بزرگ حضرت شاہ غلام رسول صاحب رسول نماؒ سے شرفِ بیعت حاصل کیا۔ آپ کو اپنے پیرو مرشد سے اور پیرو مرشد کو آپ سے ایک دلی لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ جس کا اثر آپ کی زندگی پر ہمیشہ رہا۔

شیخ مدار بخش صاحب نے دو شادیاں کیں جن سے آپ کے چار فرزند اور ایک دختر تولد ہوئیں۔ زوجہ اولیٰ سے شیخ الٰہی بخش صاحب' شیخ عبد الرحیم صاحب' حافظ شیخ عبد الکریم صاحب اور ایک دختر ہوئیں۔ زوجہ ثانی سے شیخ عبد الحکیم صاحب تولد ہوئے۔

شیخ مدار بخش صاحب ایک دور بین انسان تھے۔ آپ نے میرٹھ میں سکونت اختیار کرنے کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ ۱۸۰۷ء میں حضرت شاہ پیر صاحبؒ کے جوار میں ایک قطعہ زمین حاصل کر کے اس کا احاطہ اینٹوں کی دیوار سے محفوظ فرما دیا تھا۔ جب آپ کا انتقال ۳ رجب المرجب ۱۲۶۷ھ مطابق ۴ مئی ۱۸۵۱ء کو ہوا تو آپ اسی احاطہ میں مدفون ہوئے۔ بعد ازاں آپ کی اولادوں کو بھی اسی احاطہ میں آرام گاہ حاصل ہوئی۔

حیات بشیر مرتبہ سید حبیب الرحمن شاہ

پروفیسر مدن موہن

ممتاز ماہر تعلیم پروفیسر مدن موہن ۸ اکتوبر ۱۸۹۷ء کو لالہ رام چندر ایم۔ اے' ڈپٹی کلکٹر کے گھر پیدا ہوئے۔ انہوں نے میرٹھ اور بنارس میں تعلیم مکمل کی۔ ۱۹۲۲ء میں پروفیسر مدن موہن میرٹھ کالج میں استاد مقرر ہوئے۔

اس کے بعد ۱۹۲۳ء میں بریلی کالج کے استاد رہے۔ ۱۹۳۶ء میں کمرشل کالج دہلی اور راجستھان کے شعبہ تعلیم سے وابستہ رہے اور پھر میرٹھ آئے جہاں میرٹھ کالج کے ۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۸ء تک پرنسپل رہے۔ ۱۹۶۵ء سے ۱۹۶۸ء تک گورکھپور یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے خدمت کی۔

پروفیسر مدن موہن کی تعلیمی خدمات کی شہرت دور دور تک پھیلی۔ سماجی خدمت ہمیشہ ان کے پیش نظر رہی۔ انہوں نے چیف اسکاؤٹ کمشنر بھارت کی حیثیت سے بھی سلسلہ خدمت جاری رکھا۔ ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۷ء تک اتر پردیش ودھان پریشد کے صدر رہنے کا اعزاز بھی انہیں حاصل رہا ہے۔ ۱۹۷۰ء میں آگرہ یونیورسٹی نے انہیں ڈاکٹر آف سائنس کی اعزازی سند سے نوازا۔

پروفیسر مدن موہن میرٹھ میں یونیورسٹی کے قیام کا خیال پیش کرنے والے اور اپنے اس خیال کو عملی شکل دینے والے پہلے شخص تسلیم کئے جاتے ہیں۔ وہ اپنے خیالات کو حقیقت کا روپ دینے میں کمال رکھتے تھے۔ گورکھپور یونیورسٹی سے واپس آکر انہوں نے میرٹھ یونیورسٹی میں ذمہ داریاں سنبھالیں مگر بعد میں وہ بد دل ہو گئے اور استعفیٰ دیدیا۔ ایک دن یونیورسٹی کی کسی مجلس میں بولتے بولتے ان کو دل کا دورہ پڑا اور ۱۹۷۰ء میں انتقال کر گئے۔

میرٹھ میں تعلیم کے فروغ کے لئے ان کی کوشش بطورِ خاص ہمیشہ قابلِ ذکر رہیں گی۔

میرا شہر اس ۲۲۲٬۲۲۳

پروفیسر مسعود حسن

باپوڑ کے مشہور زمیندار شیخ علی حسن صاحب کے چار بیٹے ضیاء الحق، عبدالحق، شیخ احمد حسن اور محمود حسن تھے۔ محمود حسن اپنی عمر کے ابتدائی سالوں میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ عبدالحق وہی معروف علمی شخصیت ہیں۔ جنہیں ہر شخص بابائے اردو کہتا ہے۔ بابائے اردو کے چھوٹے بھائی شیخ احمد حسن کے صاحبزادے معروف معلم اقتصادیات و معاشیات پروفیسر مسعود حسن ۱۰ ستمبر ۱۹۳۱ء کو بھوپال میں پیدا ہوئے۔ جہاں ان کے والد ملازمت کے سلسلے میں مقیم تھے۔

پروفیسر مسعود حسن صاحب کی ابتدائی تعلیم و تربیت والدین کی نگرانی میں بھوپال میں ہوئی۔ پھر دو سال آگرہ میں رہے۔ وہاں آگرہ یونیورسٹی سے ۱۹۵۳ء میں ایم۔ اے (اکنامکس) اور دو سال بعد ایم۔ کام کیا۔ اس دوران ۱۹۵۵ء میں ایل۔ ایل۔ بی کر چکے تھے۔

تعلیم مکمل ہوتے ہی ۱۹۵۶ء میں ہجرت کر کے پاکستان آ گئے اور کراچی میں رہائش اختیار کی۔ یہاں کچھ عرصہ اپنے تایا بابائے اردو مولوی عبدالحق کے ساتھ رہے۔ ۱۹۵۶ء میں ہی جناح کالج میں لیکچرار ہوئے۔ ایک سال بعد کیڈٹ کالج میرپور خاص میں چھ ماہ "برسر" رہے اور ۱۹۵۸ء میں ملازمت کو خیرباد کہہ کر گورنمنٹ کالج آف کامرس اینڈ اکنامکس جوائن کر لیا۔ اسی کالج سے ۱۹۹۳ء میں بحیثیت پروفیسر ریٹائر ہوئے۔ یعنی یہ خدمات مسلسل پینتیس سال جاری رہیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد "کیمپس" نے موصوف کی خدمات حاصل کر لیں۔ بعد میں اسکول آف بزنس اسٹڈیز اور اقراء سے بھی وابستگی رہی۔ آج کل کالج اسکول آف اکاؤنٹنگ کراچی سے منسلک ہیں۔

مسعود حسن صاحب کی شادی ۱۹۵۹ء میں بھوپال کے معروف معالج ڈاکٹر سلطان احمد صاحب کی صاحبزادی عابدہ سلطان سے ہوئی۔ محترمہ عابدہ سلطان ڈائریکٹر تعلیمات بلدیہ عظمیٰ کراچی کی حیثیت سے ریٹائر ہوئی ہیں۔ آپ کی اولاد میں تین بیٹے سعد بن مسعود (سی۔ اے) سعود بن مسعود (پی۔ ایس۔ امریکہ) اور اسعد بن مسعود (ایم۔ بی۔ اے) کے علاوہ دو بیٹیاں سعدیہ اور اسماء ہیں۔ سعد اور اسعد صاحبان دبئی میں مصروف کار ہیں۔

پروفیسر مسعود حسن خلیق، متواضع اور علم دوست شخصیت ہیں۔ ایک آنکھ کی بینائی ضائع ہو چکی ہے اور دوسری آنکھ سے بھی صاف نظر نہیں آتا۔ اس کے باوجود اپنے شعبہ کے طالب علموں کی رہنمائی کا فریضہ حسن و خوبی انجام دے رہے ہیں۔ موصوف حج کی سعادت حاصل کر چکے ہیں۔ کویت اور دبئی کا سفر بھی خوش گوار یادوں کا حصہ ہے۔

مسعود حسین

مسعود حسین محبوب اور دل کش شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے نام سے ان کو بہت کم لوگ پہچانتے ہیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پرانے اور نئے طلبہ میں شاید ہی کوئی ایسا ہو گا جو مسعود نانی کو نہ جانتا ہو۔ یہی "مسعود نانی" "مسعود حسین" ہیں۔ محمد ذاکر علی خان نے اپنی کتاب "روایاتِ علی گڑھ" میں لکھا ہے "ان کی انوکھی شرارتوں نے ایسی شہرتِ دوام بخشی کہ آج تقریباً پون صدی گزرنے کے باوجود مسعود نانی کا نام ہر ذہن میں تازہ ہے اور ہر زمانے کے اولڈ بوائز ان کو اپنا ہی ساتھی اور IDOL سمجھتے چلے آئے ہیں۔ مسعود نانی علی برادران کے ہم عصر تھے۔ ان کی نت نئی ایکسینٹریسٹیز کا احوال بیشتر تو سینہ بہ سینہ چلا آیا ہے لیکن کبھی کبھار پرانے میگزینوں میں بھی یہ خاصے کی چیز نظر آتی ہے۔ حکیم احمد شجاع نے تحریر کیا ہے "یہ وہی مسعود نانی تھے جن کے دماغ کی جدت آفرینیاں، جن کے تخیل کی کار فرمائیاں، جن کی حرکات و سکنات کی بوقلمونیاں اور خلوت و جلوت میں جن کی ہنگامہ آرائیاں علی گڑھ اور میرٹھ ہی میں نہیں بلکہ سارے یو۔پی میں الف لیلیٰ کے افسانوں سے زیادہ مشہور ہیں"۔ انہوں نے "خوں بہا" میں ان کی شرارتوں کے احوال کے ضمن میں چند واقعات لکھے ہیں۔

مسعود نانی اور میرٹھ کے تحصیلدار میں کرکٹ کے کسی میچ پر تو تو میں میں ہو گئی۔ تحصیلدار صاحب نے مسعود نانی کو کسی کالج کا ایک طالب علم سمجھ کر ذرا اپنی حکومت کا رعب دکھایا۔ مسعود ایسے دن پیدا ہی نہیں ہوئے تھے کہ کسی کا رعب مانیں لیکن انہیں اب یہ فکر لگ گئی کہ کسی نہ کسی طرح تحصیلدار صاحب کو نیچا دکھائیں۔ آخر ان کو ترکیب سوجھ گئی۔ انہوں نے سر جیمس میسٹن کو جو اس زمانے میں یو۔پی کے گورنر تھے اور صوبے کے دورے کے سلسلے میں میرٹھ آنے والے تھے۔ میرٹھ کالج کے مسلمان طلبہ کی طرف سے ڈنر کی دعوت دے دی۔ سر جیمس میسٹن بڑے ہر دل عزیز اور نیک دل انسان تھے۔ انہوں نے یہ دعوت قبول کر لی۔ دعوت کا انتظام مسعود کے بائیں ہاتھ کا کرتب تھا۔ انہوں نے خان بہادر شیخ وحید الدین اور شیخ بشیر الدین سے رابطہ کیا۔ یہ دونوں جود و سخا کے پیکر اور احسان و مروت کے بندے اس آڑے وقت میں مسعود کے کام آئے۔ ڈنر کا وہ اہتمام ہوا کہ شاید و باید۔ مسلم ہاسٹل کے وسیع ہال میں بھیا جی کی کوٹھی کا سب سامان آ گیا۔ شاہ بلوط کی میزیں، ساگوان کی کرسیاں، چینی کے ظروف اور چاندی کے چھری کانٹے۔ یونائیٹڈ سروس کلب میرٹھ نے کھانے کا مینو تیار کیا اور اس کے تجربہ کار خانساموں نے کھانا پکایا۔ مسعود کے پاس ڈنر کے کپڑے نہ تھے۔ وہ دلی گئے اور محمد علی جوہر کی طرف سے جو اس وقت کامریڈ کے ایڈیٹر تھے، فیلپس کمپنی کو اپنے ایوننگ ڈریس کا آرڈر دے دیا۔ نشستوں کی ترتیب میں تحصیلدار کو میز کے آخری کونے میں جگہ ملی اور مسعود نانی میزبانوں کے نمائندے کی حیثیت سے سر جیمس میسٹن کے پہلو بہ پہلو بیٹھے۔ کھانا کھانے کے دوران ہم لوگ یہ دیکھ کر خوش اور پریشان ہوتے تھے کہ

مسعود ناہی بار بار سب کی آنکھ بچا کر تحصیلدار صاحب کو ذرا جھک جھک کر آداب کر لیتے ہیں۔

ایک اور واقعہ بیان کرتے ہوئے حکیم احمد شجاع نے لکھا ہے 'جب قیصرِ ہند جارج پنجم کی تخت نشینی کا دربار دلی میں منعقد ہوا تو اس جشن کو کامیاب بنانے کے لئے حکومت کی لا محدود طاقت اور رعایا کی لازوال وفاداری جو کچھ کر سکتی تھی کیا گیا۔ ہم میرٹھ میں بیٹھے بیٹھے ان تیاریوں کی داستانیں سنتے تو دل مسوس کر رہ جاتے۔ ایسے جشن کی تقریبات میں شریک ہونے کے لئے بڑے وسائل کی ضرورت تھی اور دلی کے ہنگاموں کا لطف اٹھانے کے لئے بڑا پیسہ چاہئے تھا۔

ایک روز مسعود ناہی میرے کمرے میں آئے اور کہنے لگے "دلی کا دربار نہیں دیکھتے' میں نے جواب دیا اتنے پیسے کہاں ہیں؟ کہنے لگے "آخر کتنے ہیں۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو کل بارہ آنے نکلے انہیں ہتھیلی پر رکھ کر کہا ہمارے پاس تو یہ بارہ آنے ہیں۔ ہنس کر فرمانے لگے "ذرا بکس میں دیکھو' غرض کر کرا کے کل تیس روپے بنے۔ مسعود ناہی نے کہا بہت ہیں۔ لو تیار ہو جاؤ۔ مسعود کا بدن اس قدر فربہ تھا کہ وہ خواہ مخواہ معتبر معلوم ہوتے تھے۔ ان کا رنگ اس قدر سرخ و سفید تھا کہ انگریزی لباس میں وہ انگریزوں سے بڑھ کر انگریز معلوم ہوتے تھے۔ انگریزی لہجہ اس قدر فرنگیانہ تھا کہ ان کی گفتگو سے ان کا ہندوستانی ہونا کسی طرح ظاہر نہیں ہوتا تھا۔ لباس دیسی ہو یا انگریزی بہت شاندار پہنتے تھے اور کھانا پر تکلف کھاتے تھے۔ بورڈنگ ہاؤس کے کمرے میں اس ٹھاٹھ سے رہتے تھے گویا بورڈنگ ہاؤس ان کی جاگیر ہے اور وہ اس کے انتظام کے لئے وہاں مقیم ہیں۔ انہوں نے اپنے ملازم خیر محمد کو سفر کی تیاری کا حکم دے دیا۔ بورڈنگ ہاؤس سے چلتے وقت مسعود نے وہ تیس روپے لے لئے۔ اسٹیشن پر پہنچ کر کہنے لگے "میرے پیچھے چلے آؤ اور جو کچھ میں کروں وہی کرتے چلے جاؤ۔ میں نے کہا بہت اچھا۔ وہ دلی کی گاڑی کے فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں جا ڈٹے۔ میں بھی ان کی ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ دلی کے کنٹونمنٹ اسٹیشن پر جب گاڑی رکی تو اترے اور خیر محمد کو انگریزی لہجے میں حکم دیا کہ "بھوپال کیمپ جاؤ اور مہمان خانے کے سپرنٹنڈنٹ صاحب کو ہمارا سلام بولو۔ خیر محمد چل دیا۔ پلیٹ فارم سے باہر نکل کر کہنے لگے 'دیکھو بھئی پیسے کم ہیں اور گاڑیوں کا کرایہ زیادہ' موسم بھی خوشگوار ہے پیدل چلتے ہیں اور جواب کا انتظار کئے بغیر چل دیئے۔ راستے میں لپٹن کمپنی کے اسٹال سے مفت چائے پی۔ چائے پینے کے بعد مسعود ناہی صاحب نے بڑے سرپرستانہ انداز میں مینیجر سے کہا "انتظام بہت اچھا ہے۔" اس سفر کی ساری روئداد بیان کرنے کے لئے یہ جگہ کافی نہیں' بس یہ سن لیجئے کہ ہم نے ان تین روز میں کبھی تو لیخ اعلیٰ حضرت شہریار دکن کے مہمان خانے میں کھایا کبھی تاجدار رام پور کے مہمان خانے میں' ڈنر کبھی بھوپال کے کیمپ میں تناول کیا کبھی بھاولپور کے کیمپ میں۔ میں نہیں جانتا مسعود ناہی ان سب والیانِ ریاست کے کیمپوں کے منتظمین سے واقف تھے یا نہیں مگر جہاں کہیں ہم گئے ہماری ایسی آؤ بھگت ہوئی کہ مجھ کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ ہم کہیں بھی بن بلائے مہمان نہیں۔ ان تیس روپوں میں سے مشکل سے کوئی دس روپے صرف ہوئے

ہوں گے۔ ان تقریبات کے حوالے سے آگے چل کر لکھتے ہیں کہ "دوسرے دن حضور ملکِ معظم کو شہنشاہ فردوس مقام ایڈورڈ ہفتم کے مجسمے کی نقاب کشائی کرنی تھی میں اپنے دوستوں کے ساتھ دوپہری سے جامع مسجد کے سامنے امام صاحب کے بالا خانے پر جا بیٹھا۔ جب شاہی جلوس نکلا تو ہم سب یہ دیکھ کر حیران ہو گئے کہ مسعود ناہی صاحب بے حد شاندار لباس میں کسی بہت بڑے انگریز افسر کے ساتھ گاڑی میں بیٹھے جا رہے ہیں۔ بعد میں مجھے مسعود کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ روشن آرا باغ کی اس پارٹی میں بھی شریک ہوئے تھے جو والیانِ ریاست کی طرف سے حضور ملک معظم قیصرِ ہند کے اعزاز میں دی گئی تھی اور جس میں چیدہ چیدہ اکابر ہی مدعو کئے گئے تھے۔

ذاکر علی خان صاحب نے ایکوئی (احوالِ شرارت) کے عنوان سے اپنی ایک تحریر میں لکھا ہے "ایک مرتبہ ہمارے ایک معروف پیش رو بزرگ کو نئی سوجھی انہوں ڈائننگ ہال کی میزوں سے سیڑھی بنا کر راتوں رات ایک اونٹ کو ہاسٹل کی چھت پر چڑھا دیا اور میزیں موقع واردات سے ہٹا دیں۔ اب صبح جو وارڈن صاحب اور لڑکے آئے تو شترِ سرِ بام دیکھ کر حیران رہ گئے۔ وارڈن صاحب اسی پریشانی میں مبتلا تھے کہ آخر یہ اونٹ چھت پر کیسے پہنچا؟ عفو تقصیر کی یقین دہانی کے بعد ایک صاحب نے ایکوئی کا اعتراف کیا۔ بالعموم اس شتری شرارت کو شریروں کے سرخیل مسعود ناہی سے منسوب کیا جاتا ہے۔

مسعود ناہی کی زندگی کے کارنامے اپنی نوعیت کے اعتبار سے عجیب و غریب اور اپنی دل کشی کے لحاظ سے ایسے کثیر الاشکال ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ ذاکر علی خان صاحب نے لکھا ہے افسوس یہ ہے کہ علی گڑھ کے اس "شریر جینئس" کے کارناموں کو منضبط کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی اگر ہوتی ہو تو منظرِ عام پر نہ آ سکی۔ ہمارا خیال تھا کہ "نامورانِ علی گڑھ" کے مؤلفین مادرِ درس گاہ کے اس بے نظیر موتی کو ضرور رول کرائیں گے لیکن تعجب ہے کہ ان حضرات نے بھی اتنی "عظیم الشرارت" ہستی کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا یا پھر ان مرتبین کے پرکھنے کا معیار و مذاق ہی ایسا ہو گا جسے بزبانِ علی گڑھ "ڈے اسکالرانہ" ہی کہا جا سکتا ہے۔ خدا کرے کہ اب کسی شوخ پسند کے سر میں جستجو سمائے اور وہ اپنا وقت مسعود ناہی پر تحقیق کرنے میں صرف کر سکے جو اردو کی خدمت ہو نہ ہو لیکن علی گڑھ یونیورسٹی اور اس کی شوخ و حسین روایتوں کے احیاء کا سبب بن سکتی ہے۔

ایک واقعہ کا ذکر شمیم صاحب نے بھی اپنی کتاب میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ایک کرکٹ میچ کے دوران علی گڑھ کے انگریز کلکٹر اور ان کے درمیان ایک اختلاف کے مسئلے پر پیش آیا تھا۔ ہوا یہ تھا کہ علی گڑھ یونیورسٹی کی مختلف ٹیموں کے درمیان ایک کرکٹ میچ ہو رہا تھا اور علی گڑھ کا انگریز کلکٹر مہمان خصوصی تھا۔ اتفاق سے مسعود ناہی بھی میچ دیکھ رہے تھے۔ جب کلکٹر نے انعامات دیئے تو مسعود ناہی کو اس فیصلے سے اتفاق نہیں تھا۔ انہوں نے اس اختلاف کا کھل کے اظہار کیا۔ کلکٹر اپنے فیصلے پر اڑا رہا۔ انگریزوں کی حکومت کا عروج تھا۔ کلکٹر کے انداز میں بہت رعونت تھی اور اس نے مسعود ناہی کو طرح

طرح کی دھمکیاں دیں اور مسعود ناہی بھی جواباً" اس کو پچھتانے کی دھمکی دے کر وہاں سے چلے آئے۔ دو تین ہی روز گزرے ہوں گے کہ چند لڑکے علی گڑھ یونیورسٹی ہاسٹل سے جنازہ لے کر نکلے اور مسلمان آبادی والے حصے میں داخل ہو گئے۔ جنازے کو کاندھا دینے کے لئے مسلمان جنازے کے ساتھ شامل ہوتے گئے اس زمانے میں مسلمانوں میں ایک دوسرے کی مدد ہمدردی اور غم میں شریک ہونے کا احساس بہت زیادہ موجود تھا لہٰذا جب یہ جنازہ بازار میں پہنچا تو کافی بڑی تعداد مسلمانوں کے ساتھ تھی اور اس وقت تک جو لڑکے جنازہ لائے تھے۔ وہ غائب ہو چکے تھے جب جنازہ ایسی جگہ پہنچا جہاں سے مسلمانوں کے دو قبرستانوں کی طرف الگ الگ سڑکیں جاتی تھیں تو لوگوں نے ایک دوسرے سے پوچھنا شروع کر دیا کہ کون سے قبرستان کی طرف جانا ہے۔ تب انکشاف ہوا کہ جنازہ کا کوئی بھی وارث ساتھ نہیں ہے اور جنازہ تھا بھی عورت کا۔ لہٰذا کافی سنسنی پھیلی اور دونوں قبرستانوں کی طرف سائیکلوں پر آدمی روانہ کئے گئے۔ اتنی دیر میں یہ بات مسلمانوں میں پھیل چکی تھی اور سینکڑوں مسلمان اس دوراہے پر اکٹھے ہو چکے تھے۔ جانے والوں نے آکر اطلاع دی کہ دونوں قبرستانوں میں کوئی آدمی موجود نہیں ہے۔ اب تو یہ یقین ہونے لگا کہ یا تو کسی نے قتل کر کے لوگوں سے اپنا نام و نشان چھپانے کے لئے یہ حرکت کی ہے یا مسلمان عورت کو قتل کر دیا گیا ہے۔ شرعی لحاظ سے عورت کے جنازے کو کوئی غیر محرم نہ کھول سکتا ہے اور نہ اسکی صورت دیکھ سکتا ہے۔ ذرا سی دیر میں شدید مذہبی اور انتظامی مسئلہ پیدا ہو گیا۔ پولیس اور انتظامیہ کے تمام اہل کار معہ انگریز کلکٹر موقع پر پہنچ گئے۔ سخت پریشانی یہ تھی کہ وقت پر وقت گزر رہا تھا عورت کا کوئی وارث سامنے نہیں آ رہا تھا' اور مسلمان تھے کہ انہوں نے یہ وارننگ دے دی تھی کہ اگر کسی غیر محرم نے جنازے کی بے حرمتی کی تو خون کی ندیاں بہہ جائیں گی۔ کلکٹر بڑی مصیبت میں پڑ گیا تھا۔ آخر کار اس کو کسی تجربہ کار مسلمان افسر نے یہ مشورہ دیا کہ آپ اس مسئلہ میں قاضی شہر سے فتویٰ حاصل کریں۔ قاضی شہر نے پورے معاملہ کو سمجھ کر ایک بوڑھے کانسٹیبل پر جو ستر سال سے زائد عمر کا تھا اور پنشن یافتہ تھا۔ یہ فتویٰ دیا کہ جنازے کو کھول کر دیکھ سکتا ہے۔ چنانچہ چاروں طرف چادریں تان دی گئیں اور وہ بوڑھا سپاہی جنازے کو کھول کر دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے لاحول ولا قوۃ کہا اور چادریں ہاتھ سے ہٹا ڈالیں۔ سب نے دیکھا کہ اندر بڑے بڑے پتھر پڑے ہوئے تھے تو اس طرح خدا خدا کر کے یہ معاملہ ختم ہوا۔ سب حیران کہ آخر اس حرکت کا مقصد کیا ہے۔ کلکٹر ساری رات پریشان رہا۔ ضلع میں امن و امان اس کی ذمہ داری تھی۔ اگلے روز صبح مسعود ناہی نے کلکٹر کو فون کر کے رات کے واقعہ پر ہمدردی کا اظہار کیا اور آخر میں کہا کہ اگر اس نے بد اخلاقی کا مظاہرہ کرنا نہ چھوڑا تو اس قسم کے واقعات کا سلسلہ بڑھتا چلا جائے گا۔ تب کلکٹر کو معلوم ہوا کہ یہ حرکت کس کی تھی مگر وہ مسعود ناہی کا کچھ بھی بگاڑ نہ سکا تھا۔

مصباح الاسلام فاروقی

صوبیدار مصباح الاسلام فاروقی ۱۸ اکتوبر ۱۹۲۳ء کو ضلع میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ۱۹۴۳ء میں بی۔ اے کیا۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران برصغیر کی برطانوی افواج میں شامل ہوئے۔ آپ کے والد بھی فوج میں تھے اور خاص طور پر گھوڑوں کے معروف ڈاکٹر تھے۔ اعلیٰ پیشہ ورانہ کارکردگی کی بنا پر جونیئر کمیشنڈ آفیسر بنا دیئے گئے اور اسی عہدے سے ریٹائر ہوئے۔

مصباح الاسلام فاروقی کی ساری زندگی شدید آزمائشوں میں گذری۔ آپ کی صاحبزادی سارہ فاروقی نے لکھا ہے کہ "انہوں نے اپنی سادگی اور خلوص کی وجہ سے دنیا میں بہت اذیتیں اٹھائیں اور دھوکے کھائے مگر ہمیشہ پرسکون اور مطمئن رہے۔ ہر ایک کو معاف کر دیا کرتے تھے"۔ فاروقی صاحب نے ایک بہادر سپاہی کی طرح زندگی کی مشکلات کا مقابلہ کیا اور کبھی شکست تسلیم نہ کی۔ فوج سے ریٹائر ہو کر انہوں نے اپنی زندگی اسلامی نظریات کی تبلیغ کے لئے وقف کر دی تھی۔

فاروقی صاحب ایک ممتاز صحافی تھے۔ روزنامہ "تسنیم" (بعد میں "قاصد") لاہور میں کچھ عرصہ بطور مدیر کے کام کیا۔ بعد میں ایک معروف دینی جماعت کے شعبہ نشر و اشاعت کے انچارج رہے۔ آپ کو انگریزی اور اردو دونوں زبانوں پر قدرت حاصل تھی۔ آپ نے یہودی سازش پر انگریزی میں ایک کتاب "JEWISH CONSPIRACY" شائع کی جو فوراً ہی یہودی سازش کا شکار ہو گئی اور ضبط کر لی گئی۔ اس کے بعد فری میسن تحریک پر اردو میں سات سو صفحات پر مشتمل ایک کتاب لکھی جو اپنی نوعیت کی پہلی کتاب تھی۔ فاروقی صاحب نے یہودیوں کی معروف کتاب "پروٹوکول" کے منتخب حصوں کا اردو میں ترجمہ بھی کیا جو "چراغِ راہ" کراچی میں شائع ہوتا رہا۔ ترجمہ سے چند اقتباسات۔

"سیاسی کاروبار اور اخلاق میں قطعی کوئی قدر مشترک نہیں ہے۔ ایسا حکمراں جو حکومت کرنے میں اخلاقی ضابطوں کا خیال رکھتا ہو' ہرگز ایک باہوش سیاستداں قرار نہیں دیا جا سکتا۔"

"عوام الناس اندھے' بے شعور' کم عقل' بے سمجھ ہوتے ہیں اور وہ ہر ایک کی مرضی کے مطابق ناچ سکتے ہیں۔"

"کسی ریاست میں انتہائی ظالمانہ تشدد' طاقت کی سب سے بڑی ضمانت ہے۔"

مصباح الاسلام فاروقی صاحب کو مکتوب نگاری میں بھی کمال حاصل تھا۔ ممتاز مفکر نعیم صدیقی کو ایک

خط میں لکھتے ہیں "آندھیاں اور جھکڑ سہنے کی عادت سی ہو گئی ہے۔ تندیِ بادِ مخالف میں بڑا مزا آتا ہے۔ جتنا سخت طوفان اتنا ہی پر لطف' ایک شعر ہے۔

بچا لیا مجھے طوفاں کی موج نے ورنہ
کنارے والے سفینہ مرا ڈبو دیتے

فاروقی صاحب مسلمانوں کی عسکری فتوحات اور فنِ جنگ کا ایک مفصل خاکہ مرتب کر رہے تھے اور اس سلسلے میں آپ نے نعیم صدیقی صاحب سے ضروری مواد کے حصول کے لئے رابطہ بھی کیا تھا۔ نعیم صدیقی صاحب نے بریگیڈئر آئی۔ آر۔ صدیقی سے ایک ملاقات میں اس کی تصدیق بھی کی کہ فاروقی صاحب واقعی اس عظیم منصوبے پر عرصہ سے کام کر رہے تھے۔ آپ کی زندگی مہلت دیتی تو یہ کتاب اسلامی فلسفۂ جنگ کے موضوع پر بڑی اہمیت کی حامل ہوتی۔

اخلاص' ایثار' دردمندی اور اضطرابِ بیکراں کا حامل یہ سپاہی قلم کار ۳۰ نومبر ۱۹۷۶ء کو اس دنیائے رنگ و بو سے رخصت ہوا۔

ارباب سیف و قلم' ص ۱۵۲ (معاصر اشاعت پنج راہ) کراچی ص ۳۷ تا ۴۲' فروری ۱۹۹۷ء

مظہر یوسف' مظہر حسین

مظہر یوسف

منظور حسین صاحب کے تینوں بیٹوں نے علم و ادب کی خدمت کی ہے۔ ڈاکٹر صادق' منصور عجز اور مظہر یوسف صاحبان میرٹھ کے ان فرزندوں میں شامل ہیں' جنہوں نے قلم سے رشتہ قائم رکھتے ہوئے زندگی کے شب و روز محنت' دیانت' اخلاص اور جدوجہد میں گزار کر اپنے اپنے شعبوں میں قابلِ ذکر ٹھہرے۔ ڈاکٹر صادق اور منصور عجز شاعر کی حیثیت سے بھی پہچانے گئے لیکن مظہر یوسف صاحب نے دوسری زبانوں کی شاہکار ادبی تخلیقات کو اردو نظم کے سانچے میں ڈھال کر اردو کے ذخیرۂ علمی میں اضافہ کیا۔ مظہر یوسف صاحب مشرقی اقدار کو عزیز رکھتے ہیں۔ صلح جو مزاج رکھتے ہیں اور فطرتاً سنجیدہ و متین ہیں۔

محترم مظہر یوسف کی ولادت یکم مارچ ۱۹۲۵ء کو میرٹھ میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد فیض عام انٹر کالج میرٹھ سے ۱۹۴۱ء میں میٹرک کیا۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ۱۹۴۵ء میں بی۔ اے اور دہلی یونیورسٹی سے ۱۹۴۷ء میں ایم۔ اے (اکنامکس) کیا۔ میٹرک اور بی۔ اے کے امتحانات فرسٹ ڈویژن میں پاس کئے تھے۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء میں پاکستان ہجرت کی اور یکم جنوری ۱۹۴۸ء میں "سندھ آبزرور" سے وابستہ ہوئے۔ اکتوبر ۱۹۵۰ء میں کراچی سے "کاٹن اینڈ ٹیکسٹائل جرنل" کا اجراء کیا۔ ۱۹۵۳ء میں اس کا نام تبدیل کر کے "پاکستان ٹیکسٹائل جرنل" رکھا۔ اس کی ماہانہ اشاعت پابندی سے جاری ہے۔ ۷۲-۱۹۷۱ء میں سندھی کتاب گھر کے نام سے ایک اشاعتی ادارے کی بنیاد رکھی۔ یہ ادارہ مختلف اسکالرز کی کتابیں اور درسی کتب شائع کرتا ہے۔ مظہر یوسف صاحب نے اپنے ادارے کی طرف شائع ہونے والی کتب کے علاوہ متعدد کتابوں کی ایڈیٹنگ کی ہے۔ آپ سندھ یونیورسٹی کے انسٹی ٹیوٹ آف سندھیالوجی کی گورننگ باڈی کے رکن رہے ہیں اور انسٹی ٹیوٹ کا ششماہی پرچہ بھی نکالتے رہے ہیں۔ آپ کی انگریزی نظموں کی کتاب RAIN DROPS تقریباً" چھبیس ستائیس سال پہلے چھپ چکی ہے۔ جس کا پیش لفظ ممتاز ادیب ٹی۔ ایم۔ میکری نے تحریر کیا ہے۔

محترم مظہر یوسف کی میرٹھ سے محبت دیدنی ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد جب پہلی بار محترم حفیظ میرٹھی کراچی آئے تو اہلِ میرٹھ نے ان کے اعزاز میں شعری نشستوں اور استقبالیوں کا اہتمام کیا۔ ان اجتماعات میں ہم وطنوں کی گرم جوشی کو دیکھتے ہوئے محترم مظہر یوسف اور احسان اللہ صاحب نے تجویز پیش کی کہ کیوں نہ "احبابِ میرٹھ" کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جائے۔ اس تجویز کو پذیرائی حاصل ہوئی اور "احبابِ میرٹھ" کا قیام عمل میں آیا۔ پہلے صدر ممتاز دانشور ڈاکٹر جمیل جالبی منتخب ہوئے۔ مظہر یوسف صاحب ادارے کے قیام سے اب تک معتمد عمومی منتخب ہوتے چلے آ رہے ہیں۔ میرٹھ سے وابستہ صاحبانِ علم کی بڑی تعداد اس انجمن سے وابستہ ہے۔

آپ بیرونی ممالک کے سفر کے حوالے سے بھی انتہائی خوش قسمت ہیں۔ بیس پچیس مرتبہ یورپ جا چکے ہیں۔ امریکہ، جاپان، سری لنکا اور ایشیا و مشرقِ وسطیٰ کے تقریباً تمام ممالک دیکھ آئے ہیں۔ ۱۹۹۱ء میں انجمن مصنفین چین کی دعوت پر چین کا دورہ کرنے والے پاکستانی وفد کے رکن بھی رہے ہیں۔ میرے ایک سوال کے جواب میں آپ نے بتایا کہ صرف روس ہی نہیں گیا ہوں۔

مظہر یوسف صاحب کی گھریلو زندگی میں قدیم و جدید کا حسین امتزاج ہے۔ ۱۳ دسمبر ۱۹۵۷ء کو آپ نے کرم الٰہی قریشی صاحب کی صاحبزادی سے شادی کی۔ ایک صاحبزادے ندیم مظہر اور ایک صاحبزادی عظمیٰ مظہر ہیں۔ کراچی میں مقیم ہیں۔

انگریزی نظم سے آزاد اردو ترجمہ

یتیم

مجھے اس دن پر ترس آتا ہے
اپنے آپ پر اور ان ہزاروں دوسرے لوگوں پر
جنہوں نے اس بدقسمت دن اپنی زمین کو چھوڑا
اپنی جنم بھومی کو
جس جنم بھومی نے انھیں پیدا کیا
اور ان کی ہڈیوں کو گودے سے بھر دیا
اور ایک تہذیب کو پروان چڑھایا۔ قوس و قزح کے رنگوں والی تہذیب
جو پیداوار تھی ہزاروں سالوں کی نہ کہ روں بلکہ قرنوں کی
اور جسے آج بھی دنیا حیرت، احترام اور رعب سے دیکھتی ہے
اور جسے میں نے ایک کمزور لمحہ میں ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا
اور بھاگ کھڑا ہوا

میں صرف بچھڑا ہوں، مہاجر نہیں
میری جڑیں اس زمین میں گڑی تھیں۔ میرا وہاں ایک چہرہ تھا اور ایک نام
لیکن یہاں جس زمین سے میں نے نیا رشتہ جوڑا
وہاں چوتھائی صدی گزرنے کے باوجود
اس نئی زمین کو اپنا سب کچھ دینے کے باوجود
اب بھی یہاں یتیم ہوں
جس کا کوئی نام نہیں، کوئی چہرہ نہیں، کوئی مستقبل نہیں

شاہ لطیف کی خدمت میں ہدیۂ تکریم

اے مرے شاہ، تجھ سے میری یہ التجا ہے
رو پہلی قبر سے اپنی نکل کر ہمیں وہ گیت سنا
ورس جو دیتے ہیں اخلاص و رواداری کا
اس خزاں رسیدہ دھرتی میں
تراقن وہ سدا بہار پھول ہے جو ہمیشہ کھلا رہتا ہے
اور اپنی خوشبو سے روشنی اور مسرتوں سے ہم کنار کرتا ہے
اے مرے شاہ، تجھ سے میری یہ التجا ہے
رو پہلی قبر سے اپنی نکل کر سندھ کی عظمت کے گیت دوبارہ سنا
سندھ جو گہوارا تھا بھی عظیم تمدنوں کا انمول تحفوں کا
جہاں محبت اور امید نے باہم ہمیشہ ایک نئی قوس قزح کو جنم دیا
دنیا کے عظیم شاعروں میں شاہ اکیلے ہو تم جس نے
اپنی دھرتی سے کھل ہم آہنگی کا پیغام دیا
اور پھر بھی پرندوں کی پرواز کی طرح
ترے خیال کی پہنائی احاطہ کئے ہے دنیا کا
اے مرے شاہ، ترا نام لے کر اور تیرے پیغام سے سبق لے کر
میں نے خود کو سندھ کی محبت میں غرق کر دیا ہے
اور تجھ ہی سے وہ قوت چاہتا ہوں

جو مجھے اس کی توفیق اور ہمت عطا کر دے
کہ میں اس دھرتی کی خدمت کر سکوں
یہ دھرتی جسے میں نے اپنا وطن بنایا
اے سندھ کے سورج شاہ لطیف
مجھے اپنی تمازت سے ایک چنگاری لینے دے
جس سے میں اپنے دیے کو روشن کر سکوں
وہ دیا جو نفرت کے اندھیاروں میں ٹمٹا جل رہا ہے
اے شاہ لطیف جب میں اپنی دھرتی کو دیکھتا ہوں
اس دھرتی کو جس سے ماروی نے محبت کی
اور دھرتی کے ان بچوں کو دیکھتا ہوں
جو اندھیروں میں بھٹک رہے ہیں
اور بد عقلوں اور اوہام کے مطرقوں کے نیچے دبے ہیں
تو میں ان کے مستقبل کے خیال سے کانپ اٹھتا ہوں
آج میں شاہ لطیف تری روپہلی قبر کے اوپر
قسم کھاتا ہوں کہ ہمیشہ مسلسل اخلاص کے ساتھ
میں اس دھرتی کی خدمت کروں گا
اے میرے شاہ
آج کا دن یادگار رہے گا سندھ کی تاریخ میں
آج ایا زترا روحانی بیٹا تری خد کی مٹی میں ملا
اور اس کے ساتھ آئے ہیں سندھ کے اطراف سے بڑی تعداد میں
ادیب اور شاعر
سندھ کی مٹی کو سلام کرنے
کون سا سندھ۔ کس کا سندھ
تیرا سندھ، میرا سندھ، ماروی کا سندھ، ماروؤں کا سندھ

کرنل مقبول حسن قریشی

کرنل مقبول حسن قریشی کی نسبت بھی خاک میرٹھ سے ہے۔ آپ کے خاندان کے بہت سے افراد ملازمت کے سلسلے میں بہاولپور آئے اور پھر یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ انھیں افراد میں آپ کے والد بھی تھے۔ کرنل مقبول حسن قریشی بہاولپور میں ہی پلے بڑھے اور انتہائی نامساعد حالات میں تعلیمی مراحل مکمل کیے۔ آپ نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم۔اے اور ایل۔ایل۔بی کی اسناد حاصل کیں اور بہاولپور کے نواب سر محمد صادق خاں مرحوم کے دربار تک رسائی حاصل کی۔ نواب صاحب کی نگاہِ جوہر شناس نے آپ کی خداداد صلاحیتوں کا اندازہ کرتے ہوئے اپنا پرائیوٹ سیکریٹری مقرر کیا۔ اس منصب کی ذمہ داریوں کو کرنل صاحب نے بحسن و خوبی پورا کر کے دکھایا تو آپ کو ہوم منسٹر بنا دیا گیا۔ اس طرح ریاست کا اہم انتظامی و سیاسی محکمہ آپ کے زیرِ انتظام آ گیا۔ یوں ابتدائی ایام کی محرومیوں کی تلافی فراوانیٔ عیش و مسرت کی شکل میں ہوئی۔ آپ انتہائی محنتی، فرض شناس اور ذہین و فطین بھی تھے اور شباب دہلوی کے مطابق "نیک طینت، غریب پرور اور خوفِ خدا رکھنے والی طبیعت بھی رکھتے تھے۔ جس طرح غربت نے ان کی خودداری و غیرت پر آنچ نہ آنے دی اسی طرح امارت و خوشحالی نے ان کا دماغ خراب نہیں کیا بلکہ اپنے برے وقت کو یاد رکھا اور ہمیشہ غریبوں اور ضرورت مندوں کے کام آئے۔ ان کا ہاتھ ہمیشہ کھلا رہا"۔ آپ بزرگانِ دین سے عقیدت رکھتے تھے۔

کرنل صاحب کو شعر و ادب سے فطری طور پر دلچسپی تھی۔ قلم کاروں کے بڑے قدردان تھے۔ ۱۹۵۲ء میں بہاولپور میں ایک یادگار مشاعرہ ہوا جس میں پورے ملک سے بڑے شعراء شرکت کے لئے جمع ہوئے تھے۔ یہ مشاعرہ آپ کی ذاتی کوششوں کا مرہونِ منت تھا۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ یہ مشاعرہ تین دن برابر ہوتا رہا۔ بہاولپور میں ہی ۱۹۵۳ء میں حلقہ اربابِ ذوق کے زیرِ اہتمام آل پاکستان اردو کانفرنس منعقد ہوئی تھی جس میں بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق کے علاوہ ملک کے ممتاز شعراء و ادباء کی بڑی تعداد شریک ہوئی تھی۔ کرنل صاحب نے اس کانفرنس کی نہ صرف سرپرستی فرمائی بلکہ مجلسِ استقبالیہ کا صدر بننا بھی قبول کیا۔

کرنل مقبول حسن قریشی صاحب نے ہر سطح پر اپنی بہترین صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے یادگار خدمات انجام دیں اور دلوں پر انمٹ نقوش ثبت کیے۔

ماخذ : مشاہیر بہاولپور، ص ۳۵ تا ۳۷

ڈاکٹر مقصود حسن

ڈاکٹر مقصود حسن ایک شفیق اور دردمند استاد کی حیثیت سے طالبانِ علم کی بے لوث خدمت کرتے ہوئے فیض عام انٹر کالج میں ۱۹۵۴ء سے ۱۹۸۸ء تک یعنی مسلسل چونتیس سال کا درس پڑھاتے رہے ہیں۔ یہ طویل عرصہ آپ کی علم دوستی کا شاہد ہے۔

آپ کی ولادت ۵ مئی ۱۹۲۸ء کو ہاپوڑ میں ہوئی۔ آپ کے والد جناب منشی احسان الٰہی اور والدہ محترمہ فیاضی بیگم نے آپ کی تربیت میں کوئی کمی نہیں کی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد اعلیٰ تعلیم کی طرف سفر کرتے ہوئے بی۔ کام ' ایم۔ کام ' بی۔ ایڈ اور ایم۔ اے (اردو) کیا۔ فیض عام انٹر کالج سے سبکدوش ہونے کے بعد تصنیف و تالیف کی طرف متوجہ ہوئے اور ساتھ ہی "حامد اللہ افسر میرٹھی : حیات ' شخصیت اور کارنامے" کے عنوان سے میرٹھ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کیا۔ آپ کے مقالہ کے نگراں مشہور شاعر ڈاکٹر بشیر بدر تھے۔ یہ مقالہ فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی حکومت اترپردیش کے مالی تعاون سے شائع ہوا۔ ۱۹۸۸ء میں شائع ہونے والی یہ کتاب ۱۷۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر افتخار الحسن عنوان چشتی (پ : ۱۹۳۷ء) نے اس مقالہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے "۔۔۔۔۔۔۔۔اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ کتاب حامد اللہ افسر پر پہلی مفصل کتاب ہے اور یقین ہے کہ یہ کتاب آنے والی نسلوں کو اس میدان میں دور تک روشنی دکھائے گی اور حامد اللہ افسر نے انداز سے سوچنے پر مائل کرے گی"۔ محترم مشتاق شارق کی رائے ہے۔ "جناب مقصود حسن نے اپنے مقالے میں افسر میرٹھی کی شخصیت اور ادبی خدمات کے ہر رخ کا بڑی گہرائی سے مطالعہ و تجزیہ کیا ہے۔ مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ یہ مقالہ ہر اعتبار وقیع اور قابلِ مطالعہ ہے اور ایک عہد کی بڑی خوبی سے آئینہ داری کرتا ہے"۔

ڈاکٹر مقصود حسن صاحب کی دوسری مرتبہ کتاب "رنج میرٹھی : حیات ' شخصیت اور کارنامے" ہے جو ۱۹۹۱ء میں ڈاکٹر سراج الدین احمد نے شائع کی ہے۔ یہ ۲۴۳ صفحات پر محیط ہے۔ اس کتاب کے پہلے باب میں رنج کے سوانح ' حالاتِ زندگی ' تعلیم و تربیت ' مشاغل اور اولاد اور خاندانی حالات پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ دوسرے باب میں رنج کا مقام بحیثیت تذکرہ نگار متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تیسرے باب میں رنج کی شاعری اور ان کی تصنیفات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور چوتھے باب میں رنج کا انتخابِ کلام پیش کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر مقصود حسن صاحب کی یہ دونوں کتابیں اس لئے اہم ہیں کہ دونوں میرٹھ کی ناقابلِ فراموش شخصیات کے علم و فن سے متعلق ہیں۔ ابھی موصوف کا قلم رواں ہے اس لئے ہمیں مزید ایسے کاموں کی توقع رکھنی چاہئے۔

بہ شکریہ محترم حکیم سیف الدین احمد

منشی ممتاز علی

منشی ممتاز علی بن شیخ امجد علی اپنے زمانے کے مشہور و معروف خطاط تھے۔ میرٹھ ان کا وطن تھا۔ دہلی آتے جاتے رہتے تھے اور لال قلعہ تک رسائی رکھتے تھے۔ فن خوش نویسی میں بہادر شاہ ظفر کے شاگرد تھے۔

اندر کوٹ میرٹھ سے ۱۸۶۳ء میں مولانا ہاشم صاحب نے مطبع ہاشمی جاری کیا' بعد میں منشی ممتاز علی صاحب نے شراکت کی۔ اس پریس میں عربی کی درسی کتابیں چھپتی تھیں۔ مولانا ہاشم صاحب سے مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے ذاتی تعلقات تھے اور مولانا ہاشم صاحب کو مولانا نانوتوی صاحب سے بڑی عقیدت تھی۔ ایک مرتبہ مولانا قاسم صاحبؒ میرٹھ تشریف لائے اور مطبع میں قیام فرمایا۔ دوران گفتگو کتابوں کی تصحیح کا ذکر ہوا۔ مولانا قاسم نانوتوی صاحب نے آمادگی ظاہر کی۔ کچھ دنوں کے بعد معاوضے کا مسئلہ آیا۔ مولانا ایک ہفتے تک ٹالتے رہے اور اس کے مذہبی پہلو پر غور کرتے رہے۔ آخر ایک روز آپ نے پچیس روپے ماہانہ معاوضہ خود تجویز کیا۔ اس معاوضے کو مولانا ہاشم صاحب بہت کم سمجھتے تھے مگر وہ مولانا سے بات کرنے کی ہمت نہیں کرپا رہے تھے' چنانچہ ہاشم صاحب دیوبند گئے' مولانا کی اہلیہ سے ملے اور انہیں بتایا کہ یہ معاوضہ بہت کم ہے۔ میری ہمت نہیں ہوتی جو اس سلسلے میں بات کروں۔ میں آپ کو جو رقم بھیجا کروں اس کا علم مولانا کو نہ ہو۔ مولانا امداد صابری کہتے ہیں "نہیں معلوم مولانا صاحب کی اہلیہ اس بات پر کیسے راضی ہوگئیں۔" مولانا ہاشم بذریعہ منی آرڈر رقم بھیجتے رہے۔ ایک مرتبہ ڈاکیہ جب رقم لے کر پہنچا تو مولانا بھی موجود تھے ان کو اس کا علم ہوا تو ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور وہ رقم اسی وقت ڈاکیہ سے واپس کردی۔ مولانا نانوتوی اس کام میں آزاد تھے' ان پر کسی قسم کی پابندی نہیں تھی۔ جب دیوبند سے تشریف لاتے' تصحیح فرمایا کرتے تھے۔

ہاشمی پریس کامیابی سے چلنے لگا تو منشی ممتاز علی صاحب نے سوچا' اس کاروبار کو وسعت دی جائے اور اگر یہ دہلی میں ہو تو زیادہ مقبول بھی ہوگا اور آمدنی بھی بڑھے گی۔ منشی صاحب نے اس خیال و ارادے سے ہاشم صاحب کو مطلع کیا۔ اس زمانے میں دستی پریس ہوتے تھے۔ ان کے پریس میں بھی چار پانچ دستی پریس تھے۔ باہمی فیصلے کے مطابق دو دستی پریس ممتاز علی صاحب ساتھ لے کر دہلی گئے اور چوڑی والان میں مطبع مجتبائی ۱۸۶۷ء میں قائم کیا' وہاں آنے کے بعد منشی ممتاز علی صاحب نے ایک حمائل لکھی جس کی تصحیح مولانا قاسم نانوتویؒ نے فرمائی۔ یہ حمائل مطبع مجتبائی دہلی میں ۱۲۸۶ھ میں طبع ہوئی۔ مولانا محمد قاسمؒ نے حمائل کی طباعت کے دو تاریخی قطعات کہے:

حمائل کز شرف دارد بر حاصل کاتما
کہ ایں جا است و برہان است صد گونہ بلا زاتما

نوشت و طبع زد نزہت رقم ممتاز علی قام
صحیحش کرد زاں گردید تعویذ دل و جانہا

چھاپی وہ حمائل کہ اگر جان کے لب ہوں
بے ساختہ بول اٹھے کہ مرغوب چھپی ہے
میں نے بھی کیا مدح میں اور کیونکہ نہ کہتے
کہتے ہیں یہ تکرار عدد خوب چھپی ہے
ایک راحت دل' راحت دل پر ہے مضاعف

۳۴۳ ۳۴۳

کیا لکھی کیا عمدہ خوش اسلوب چھپی ہے

۱۳۸۶ھ

کیا کہنے حمائل کے' بہت خوب ہے چھاپی

۱۳۸۶ھ

کیا کہنے ہیں پاکیزہ بہت خوب چھپی ہے

۱۳۸۶ھ

منشی ممتاز علی صاحب ۱۸۸۶ء میں اپنی چار صاحبزادیوں عائشہ بیگم' کلثوم بیگم' زینب بیگم اور رقیہ بیگم کے ساتھ ہجرت کر کے مکہ معظمہ پہنچے اور مطبع مجتبائی مولوی عبدالاحد صاحب کے ہاتھ فروخت کیا۔

منشی صاحب کی اہلیہ ہجرت سے پہلے انتقال کر چکی تھیں۔ آپ نے مکہ معظمہ میں ایک عربی النسل عورت سے دوسری شادی کی۔ ان سے کوئی اولاد ہوئی یا نہیں' یہ معلوم نہ ہو سکا۔ منشی صاحب مکہ معظمہ میں ہی فوت ہوئے۔ جنت المعلیٰ میں آرام فرما ہیں۔

آپ کے دو صاحبزادے ایک منشی مشتاق علی اور دوسرے منشی عبدالغنی تھے۔ اول الذکر کٹڑہ کی تفضل حسین دہلی میں رہتے تھے اور وہیں کتابت کرتے تھے۔ ان کی تمام عمر قرآن مجید لکھنے میں صرف ہوئی۔ دہلی کے بہترین خوش نویس تھے۔ ان کا انتقال دہلی میں ہوا۔ ان کی صاحبزادی فاطمہ بیگم کی شادی مولوی نور محمد صاحب تاجر کتب سے ہوئی جو اپنے شوہر کے ساتھ ۱۹۴۷ء میں کراچی آ گئیں۔ منشی عبدالغنی صاحب بھی معروف خوش نویس تھے۔ مولانا امداد صابری نے لکھا ہے کہ وہ باپ کی طرح انتہائی خوددار' وضعدار' ملنسار' خوش اخلاق' معاملہ فہم' نہایت لائق و فائق' تمیز طبع خاص کر متنوع و تفنن خطوط گو ناگوں میں بے نظیر تھے۔ انہوں نے مطبع مصطفائی کلاں محل دہلی سے جاری کیا تھا۔ تقسیم ہند سے دو تین سال پہلے ان کا انتقال ہوا اور فیروز شاہ کوٹلے کے قریبی قبرستان میں تدفین ہوئی۔ ان کے چار صاحبزادے منشی عبدالحمید' عبدالحفیظ پہلی بیوی سے اور عبدالرشید اور عبدالقدیر دوسری بیوی سے ہوئے۔ عبدالحفیظ' عبدالرشید اور عبدالقدیر ملک کی تقسیم کے بعد پاکستان آ گئے۔

دلی کی یادگار ہستیاں' ص ۳۰۱ تا ۳۰۵

ڈاکٹر حسن منظر

ڈاکٹر سید منظر حسن

افسانہ نگار' مترجم اور مضمون نگار ڈاکٹر سید منظر حسن ادبی دنیا میں حسن منظر کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ انتہائی باوضع' خلیق' ملنسار اور خوش گفتار ہیں۔ آپ کا شمار وطنِ عزیز کے قابلِ ذکر نفسیاتی' اعصابی اور دماغی امراض کے ماہرین میں ہوتا ہے۔

آپ کے اجداد میں بزرگوں سے سنا ہے کوئی صاحب کرم علی گزرے ہیں۔ کرم علی صاحب کا پہلا مستقر میرٹھ تھا۔ ان کے نام سے میرٹھ میں ایک قدیم رہائشی علاقہ "محلہ کرم علی" آباد ہے۔ اس خاندان کے کچھ افراد نے بعد میں بجنور اور فیض آباد میں رہائش اختیار کی اور کچھ افراد نے گورکھپور اور ہاپوڑ میں سکونت پسند کی۔ ہاپوڑ میں اسی خاندان کے سید منظر حسن صاحب رہائش پذیر تھے۔ ہاپوڑ میں ایک عمارت محلہ گدا پاڑا میں "محل" کہلاتی تھی۔ یہی سید منظر حسن صاحب کا آبائی مکان تھا۔ اسی گھر میں جس بچے کی ولادت ۴ مارچ ۱۹۳۴ء کو ہوئی اس کا نام سید منظر حسن رکھا گیا۔ منظر حسن صاحب کا دوسرا آبائی مکان محلہ خونی پور' گورکھپور میں ہے جہاں وہ پیدا ہوئے تھے۔

سید منظر حسن صاحب کے تعلیمی مراحل مراد آباد' لاہور اور ایڈنبرا میں مکمل ہوئے۔ آپ نے پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔بی۔بی۔ایس' ایڈنبرا یونیورسٹی سے ڈی۔پی۔ایم کیا۔ ابتدا میں ڈچ جہاز پر خدمات انجام دیں۔ عرب' نائیجیریا' اسکاٹ لینڈ اور ملایا میں عملی زندگی کا سفر جاری رکھا۔ ۱۹۷۳ء میں حیدر آباد (سندھ) میں سکونت اختیار کر کے پریکٹس شروع کی۔ لطیف آباد میں آپ کا کلینک ہے۔ دماغی' اعصابی اور نفسیاتی امراض کے ماہر کے طور پر آپ کو قدر و منزلت حاصل ہے۔ اندرون سندھ کے شہری اور دیہی عوام کی خدمت میں منہمک ہیں اور ایک بڑے حلقے میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔

حسن منظر صاحب ممتاز افسانہ نگار' مضمون نگار اور مترجم بھی ہیں۔ آپ کے افسانوں کے مجموعے رہائی: ۱۹۸۱ء' ندیدی: ۱۹۸۲ء' انسان کا دیش: ۱۹۹۱ء' سوئی بھوک اور "ایک اور آدمی" مقبولیت حاصل

کر چکے ہیں۔ آپ نے پریم چند کے آخری نامکمل ناول "منگل سوتر" کا ہندی سے ترجمہ مع تعارف کیا ہے۔ آنجہانی پریم چند کی بیوہ کی تصنیف "پریم چند گھر میں" کا ہندی سے اردو میں ترجمہ کرکے اردو افسانوی ادب میں اضافہ کیا ہے۔ آپ کی ایک کتاب "موجودہ معاشرہ اور برہنہ فلمیں" بھی شائع ہو چکی ہے۔ حسن منظر صاحب کے اسلوب پر الیاس عشقی صاحب رائے کی ہے "حسن منظر کو دیکھنے دکھانے کا فن خوب آتا ہے۔ اس کا افسانہ بصارت اور بصیرت کی آمیزش سے پیدا ہوتا ہے۔ بصارت زندگی کے حسن و قبح کو کیمرے کی سچائی کے ساتھ دیکھتی ہے اور بصیرت ایکسرے کے تجزیاتی عمل سے اس کی تصدیق کرتی ہے۔ انسانی فطرت اور نفسیات کا کوئی پہلو اس کی آنکھ سے اوجھل نہیں ہوتا۔ اس کے افسانے ایک ایسے سیلانی کے سفر کی روداد سناتے ہیں جو اپنی فکر کا چراغ لے کر اس انسان کی تلاش میں نکلا ہے جو زندہ ہو اور دوسروں کے زندہ رہنے کے حق کو تسلیم کرتا ہو۔ اس نے دنیا کی خاک چھانی ہے اور ملک ملک کی خاک سے سونے کے ذرے جمع کئے ہیں۔ یہی سنہرے ذرے اس کے افسانوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ اردو افسانے میں حسن منظر کی آواز مانوس اور جاندار ہونے کے ساتھ ساتھ نئی بھی ہے اور منفرد بھی۔ اس کے افسانے بیداری کے خواب ہیں جو آپ اپنی تعبیر ہوتے ہیں"۔

حسن منظر صاحب کی تخلیقات مختلف ادبی رسائل کی زینت بنتی رہی ہیں۔ عصرِ حاضر کے افسانوی ادب میں حسن منظر صاحب کا اپنا خاص مقام ہے۔

آپ کی شادی ۱۹۶۲ء میں ڈاکٹر طاہرہ سے ہوئی۔ ڈاکٹر طاہرہ منظر حسن بچوں کے امراض کی ماہر ہیں اور اپنے شریکِ سفر کے ساتھ شریکِ کار بھی ہیں۔ آپ کی اولاد میں ڈاکٹر سید نوفل حسن ماہر امراض نفسیاتی (کوالالمپور) اور ڈاکٹر رود آبہ حسن نیویارک میں کنسلٹنٹ فزیشن ہیں۔ تابیہ منظر حسن حیدر آباد میں زوالوجی پڑھاتی ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کا پورا گھرانہ انسانیت کی خدمت کر رہا ہے۔

ڈاکٹر حسن منظر صاحب کی ایک نظم محراب 'لاہور میں چھپی تھی۔ موضوع کی انفرادیت کی وجہ سے یہ نظم پیشِ خدمت ہے:

آندھیوں کی مٹی

میرا کوئی قبرستان نہیں ہے:
میرے پردادا سنا ہے گورکھپور میں سو رہے ہیں
اور پردادی..... کہیں کسی بے کتبہ لحد میں'
دادا نیم کی چھاؤں میں رام گنگا کے کنارے
بیچارے لیٹے ہیں'
دادی دلّی میں سوتی ہیں'

اور ان سے پکھ ہی پرے
پرپھاڑیوں کے دوسری طرف
نانا..... جہاں ان کا کوئی پوچھنے والا نہیں ہے
لیکن سنا ہے وہ پہاڑیاں تو ڈھا دی گئی ہیں
انسان اپنی ادھیڑبن میں لگا ہے.....
نانی کی کشتیوں یا پورب کی مٹی میں
بہت پہلے مل گئی تھیں'
خود ان کے باپ کہاں سوتے ہیں؟
اور باقی پرکھوں کے پرکھے کیا ہوئے؟
اتنا پرانا ریکارڈ کس کے پاس ہوتا ہے.....
پرنانی کی قبر
سب دنیا چھوڑ کر کراچی میں بنی تھی
اک کھیت میں جہاں کوئی کھیت نہیں ہے'
میرا بھائی بھی وہیں کہیں سوتا ہے
اور' اور بھی بہت سے ادھر اُدھر بکھرے ہوئے ہیں
آدمیوں سے پٹے ہوئے ان قبرستانوں میں
جہاں تل دھرنے کی بھی جگہ نہیں ہے
ان میں وہ بچے بھی ہیں میرے کنبے کے جنہیں
ان کی ماؤں نے ٹھنڈا جایا تھا.....
پر بھائی ان کھنڈر جیسے قبرستانوں میں
جن کا کوئی پچھتر نہیں ہے
کس کے پاس جھانکنے کا وقت ہے
کس کو فاتحہ پڑھنے کی مہلت ہے
کون ان مٹی کے ڈھیروں کا وارث ہے
کن کی ان سے شناسائی ہے
جو بنتے اور مٹ جاتے ہیں...
وقت کے ہاتھ چلاتے' جو تقدیر ہماری تھی
ایک قبرستان اور دوسرے میں

مطلق رہا نہیں چھوڑا ہے
ربط تو میری نئی کھٹی دنیا میں بھی ملتا ہے
"میں کہاں سوؤں گا؟" میری دنیا میں یہ
ایک قبل از وقت سوال ہے اور بے اہم"
"وقت مجھے کہاں رہنے دے گا" لے جائے گا
یہاں یا کہیں اور بد ہوا میں"؟
میں تو وہ گاؤں والا بھی نہیں
جو جھونپڑیوں کے دھورے ہی
اپنی مسجد اپنا مدرسہ کسی کو دکھا کر
مٹی کے بچے بنے چند ڈھیروں کے لئے
کہتا ہے "یہی اسان جو مقام آئی"...
نہ کوئی گاؤں نہ کوئی قصبہ
مجھ سے بچھڑ کے نام کتاں ہے"
میری میت کو کہیں نہیں لے جایا جائے گا
میرا کوئی آبائی قبرستان نہیں ہے

ناظم حسین صدیقی

ناظم حسین صدیقی

پاکستان کے تکنیکی ماہرین میں ناظم حسین صدیقی کا نام وکام باخبر حلقوں میں پوشیدہ نہیں ہے۔ ملک بھر کے پاور اسٹیشنوں کی منصوبہ بندی، تعمیر اور انتظامات کے حوالہ سے موصوف نے وطن عزیز کی گرانقدر خدمت کی ہے۔ بلاشبہ ان کی حب الوطنی اور صلاحیتوں سے ملک کو بے شمار وسائل میسر آئے ہیں۔

ناظم حسین صدیقی ۲۴/اکتوبر ۱۹۳۰ء کو قصبہ انچولی ضلع میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ کم سنی میں ہی ان کے والد حافظ خادم حسین صاحب کا انتقال ہو گیا تھا۔ تعلیم و تربیت اور پرورش کی ذمہ داریوں کو ان کی والدہ محترمہ آمنہ بیگم نے احسن طریقے سے پورا کیا۔ جس کے نتیجہ میں ناظم حسین صدیقی نے اپنے تمام امتحانات میں اول پوزیشن حاصل کی۔

صدیقی صاحب ابتدائی تعلیم مکتب اسلامیہ اور مڈل اسکول انچولی میں حاصل کرنے کے بعد فیض عام انٹر کالج میرٹھ میں داخل ہوئے۔ ۱۹۴۹ء میں یہاں سے میٹرک کرنے کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ پہلے انٹر سائنس اور پھر ۱۹۵۴ء میں الیکٹریکل انجینئرنگ میں بی۔ایس۔سی کی ڈگری حاصل کی۔ اسی سال شیخ اللہ بخش صاحب کی صاحبزادی عقیلہ بیگم کے ساتھ انچولی میں شادی ہوئی۔

۱۹۵۴ء میں ہجرت کر کے پاکستان آئے۔ یہاں کراچی الیکٹرک سپلائی کارپوریشن کے تھرمل پاور ہاؤس واقع ویسٹ وہارف میں پیشہ ورانہ خدمات کا آغاز کیا۔ ۱۹۵۶ء میں پی۔آئی۔ڈی۔سی کے قدرتی گیس پاور ہاؤس ملتان میں بحیثیت انجینئر تقرر ہوا۔ اس کے پلانٹ کو چلانے کی تربیت کے لیے جرمنی اور برطانیہ گئے۔ اسی دوران واپڈا قائم ہوا تو آپ کی خدمات اس کے سپرد ہو گئیں۔ ملتان پاور اسٹیشن سے ۱۹۷۳ء تک وابستہ رہے اور سات سال تک اس کے نائب ریذیڈنٹ انجینئر کی ذمہ داریاں پوری ذمہ داری کے ساتھ

انجام دیتے رہے۔ ملتان میں چودہ سال تکنیکی اور انتظامی تجربے کے حصول کے بعد ڈائریکٹر تھرمل پاور کی حیثیت سے آپ کا تبادلہ واپڈا ہیڈ آفس لاہور ہوا۔ جہاں واپڈا کے جملہ تھرمل پاور اسٹیشنوں کی تعمیر کی منصوبہ بندی اور ان پر عمل درآمد کے فرائض سونپے گئے۔ اعلیٰ پیشہ ورانہ کارکردگی کے مظاہرہ پر ۱۹۸۳ء میں چیف انجینئر تھرمل کے عہدہ پر ترقی دی گئی۔ ۱۹۸۷ء سے ۱۹۹۲ء کے دوران واپڈا کے جنرل منیجر اور مینیجنگ ڈائریکٹر تھرمل کی اہم ترین ذمہ داریاں تفویض ہوئیں جس کے تحت پاکستان بھر میں واپڈا کے تحت قائم ہونے والے تمام پاور اسٹیشنوں اور پرانے پاور ہاؤسز میں توسیع کی منصوبہ بندی، ان کی افادیت کا جائزہ لینا اور ان کے لیے جدید ترین پلانٹ کی خریداری کے معاملات کے علاوہ عالمی مالیاتی اداروں اور بیرونی ممالک سے سرمایہ کاری کے معاملات طے کرنے اور پھر ان پلانٹوں کی تنصیب کے مراحل کی عظیم قومی ذمہ داریاں آپ کے سپرد ہوئیں۔ اس سلسلے میں آپ نے امریکہ، برطانیہ، کینیڈا، چین، جرمنی اور جاپان وغیرہ میں پاکستان کی نمائندگی کی۔ آپ کی نگرانی میں ملتان، مظفر گڑھ، کوٹ ادو، گدو، کوٹری اور پسنی وغیرہ کے بڑے پاور اسٹیشن یا ان کے توسیعی یونٹوں کی تنصیب کا کام مکمل ہوا۔

ان عظیم منصوبوں سے وافر مقدار میں برقی قوت فراہم ہوئی۔ جس نے ملک کی ہمہ جہت اقتصادی و صنعتی ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔ انجینئرنگ کے شعبہ میں عملی خدمات کے ساتھ ساتھ آپ نے اس شعبہ میں بہت سے تحقیقی کام بھی کیے۔ [illegible]غیر معیاری گیس سے پاور پلانٹ چلانے کے طریقے[illegible] پر آپ کے تحقیقی مقالہ کو بین الاقوامی پذیرائی حاصل ہوئی۔

وزیر اعظم پاکستان نے ۱۹۹۰ء میں آپ کو اعلیٰ پیشہ ورانہ صلاحیتوں اور قابل قدر خدمات کے اعتراف میں خصوصی طور [illegible] گریڈ ۲۱ دیا۔ آپ پاکستان کے اولین انجینئر ہیں جسے یہ اعزاز حاصل ہوا۔ ۱۹۸۷ء میں ناظم حسین صدیقی صاحب کو واپڈا کے دس لاکھ سے زائد کارکنان میں اہلیت کے اعتبار سے اول قرار دیا گیا اور حسن کارکردگی کی شیلڈ اور کیش ایوارڈ سے نوازے گئے۔ اس موقع پر واپڈا نے جو اعلامیہ جاری کیا اس میں ناظم حسین صدیقی صاحب کی خدمات کو زبردست خراج پیش کیا گیا۔ تقسیم اعزاز کی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے واپڈا کے چیئرمین نے کہا "اگر ناظم حسین صدیقی جیسے لائق، محنتی اور دیانتدار چند اور افسران کی خدمات واپڈا کو حاصل ہو جائیں تو اسے عظیم و مثالی ادارہ میں تبدیل کرنے کی میری خواہش پوری ہو جائے گی۔"

واپڈا کے مینیجنگ ڈائریکٹر کی حیثیت سے ۱۹۹۲ء میں ریٹائر ہونے کے بعد سے آپ امریکہ، جرمنی، چین اور جاپان کی بین الاقوامی شہرت یافتہ کمپنیوں اور کئی ایک پاکستانی کمپنیوں کے لیے تکنیکی مشیر کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

ناظم حسین صدیقی صاحب صوم وصلوٰۃ کے پابند ہیں۔ شعائر اسلامی کو عزیز رکھتے ہیں۔ فلاحی کاموں

میں خوب حصہ لیتے ہیں۔ انچولی کو آپریٹو سوسائٹی کراچی کے ابتدائی ایام میں جنرل سیکریٹری رہے اور انچولی ایسوسی ایشن کراچی کے رفاہ عامہ کے کاموں میں سرگرمی سے حصہ لیتے ہیں۔ مستقل طور سے لاہور میں مقیم ہیں۔ آپ کے دو بیٹے ہیں۔ تنویر ناظم پاکستان ایئر فورس اور توقیر ناظم لاہور کی ایک انجینئرنگ کمپنی سے وابستہ ہیں۔

بشکریہ : شیخ رؤف الحسن

==========

ڈاکٹر نجم الاسلام

ڈاکٹر نجم الاسلام

قابلِ احترام محقق و مصنف اور ماہرِ تعلیم ڈاکٹر نجم الاسلام کے نام سے علم و ادب کے سنجیدہ قارئین بخوبی واقف ہیں۔ آپ نے صلہ اور ستائش سے بے نیاز رہ کر علم کے فروغ کے لئے قابلِ تقلید کام کئے ہیں اور جن کو اعتبار حاصل ہوا ہے۔

ڈاکٹر نجم الاسلام صاحب کا حقیقی نام نجم الدین صدیقی ہے۔ نجم الاسلام قلمی نام ہے اور اسی نام سے معروف ہیں۔ آپ شیخ زادگان بجنور میں سے ہیں جو امیر تیمور کے حملے کے وقت (۸۰۱ھ) سے قاضی محلّہ بجنور میں آباد چلے آتے ہیں اور حضرت عبد الرحمٰن بن حضرت ابو بکر صدیقؓ کی اولاد میں سے ہیں۔ آپ کے اجداد اس علاقے (بجنور' روہیل کھنڈ) میں امیر تیمور کے زمانے سے منصبِ قضاء پر فائز رہے ہیں اور زمین داریاں بھی علی الاتصال اس علاقے میں چلی آتی ہیں۔ جہانگیر کے وقت اس محلّے میں شیخ عبد الغفور اعظم پوری (م:۹۸۵ھ از خلفائے شیخ عبد القدوس گنگوہیؒ م:۹۴۵ھ) کے اخلاف بھی آباد ہوئے جو حضرت عمر فاروقؓ کی اولاد میں سے ہیں اور پیرزادے کہلاتے ہیں۔ صدیوں سے ان دو خانوادوں کی آپس میں رشتہ داریاں چلی آتی ہیں۔

ڈاکٹر نجم الاسلام صاحب یکم جولائی ۱۹۳۳ء کو بجنور میں پیدا ہوئے۔ آپ کے دادا مولوی نصیر الدین نے سول انجینئرنگ کا امتحان تھامسن کالج آف سول انجینئرنگ رڑکی سے پاس کیا تھا۔ انہوں نے دورانِ ملازمت علی گڑھ میں وفات پائی اور بالائے قلعہ کے قبرستان میں سپردِ خاک ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب کے والد شہاب الدین صدیقی ۱۸۹۹ء میں بجنور میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا انتقال ۱۹۶۹ء میں سکھر میں ہوا۔

ڈاکٹر نجم الاسلام صاحب کی تعلیم و تربیت کا آغاز محلّہ کے پرائمری اسکول سے ہوا۔ گورنمنٹ ہائی اسکول بجنور سے ۱۹۴۷ء میں میٹرک کا امتحان اول درجہ میں پاس کیا' پھر میرٹھ کالج' میرٹھ سے ۱۹۴۹ء میں انٹرمیڈیٹ اور ۱۹۵۳ء میں اسی کالج سے بی۔اے کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ ۱۹۵۶ء میں ہندوستان

سے ہجرت کرکے پاکستان تشریف لائے اور سلسلۂ تعلیم جاری رکھتے ہوئے ۱۹۶۰ء میں سندھ یونیورسٹی سے ایم۔اے کیا۔ ۱۹۶۹ء میں ممتاز بزرگ اور ماہرِ تعلیم ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کی زیرِ نگرانی تحقیقی مقالہ بہ عنوان "دبستانِ دہلی کی نثر" لکھ کر جامعہ سندھ سے پی۔ایچ۔ڈی کی سند حاصل کی۔ آپ کے نمایاں رہنماؤں اور اساتذہ میں شاہ ضیاء الحق گنگوہیؒ اور ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں ہیں۔ ابتدائی تعلیم کے دوران جن اساتذہ سے آپ متاثر ہوئے ان میں شمس الحق نظامی' وقار احمد' افتخار احمد' شبیر حسن چاند پوری اور رفعت علی خاں بجنوری صاحبان شامل ہیں۔

ڈاکٹر نجم الاسلام صاحب ایک باوقار بزرگ ہیں۔ ٹھہرے ہوئے لہجے میں مختصر گفتگو کرتے ہیں اور موضوع سے ہٹ کر بات نہیں کرتے۔ سلیم الطبع' سنجیدہ' مہمان نواز اور سراپا محبت و شفقت ہیں۔ اپنے چھوٹوں سے ملتے ہوئے ان کی عزتِ نفس کا خیال رکھتے ہیں یعنی بیشتر انسانی اوصاف کا مجموعہ ہیں۔

میرٹھ میں قیام کا عرصہ ڈاکٹر نجم الاسلام صاحب کے علمی سفر کے آغاز کے لئے سازگار رہا۔ یہاں وہ ماحول میسر تھا جو آپ کے لئے محرک ثابت ہوا۔ یہ علمی و ادبی فضا کا ہی اثر تھا کہ میرٹھ میں حصولِ تعلیم کے دوران ڈاکٹر صاحب کی خداداد صلاحیتیں ظاہر ہونا شروع ہوئیں۔ آپ نے میرٹھ سے شائع ہونے والے ادبی رسالے "معیار" سے وابستگی پسند کی اور مدیر کی حیثیت سے ۱۹۵۱ء میں فرائض سنبھالے۔ آپ نے اس رسالے کے ذریعے اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی کے لئے انتھک محنت کی۔ معیار میرٹھ کے

ماہنامہ معیار میرٹھ کا تنقید نمبر: ۱۹۵۴ء

تنقید نمبر: ۱۹۵۳ء سے آپ کی کوششوں کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ اسی دور میں ڈاکٹر صاحب کی دو کتب "ابھرتی کرنیں": ۱۹۵۳ء اور "عالمی امن": ۱۹۵۵ء شائع ہوئیں۔ پاکستان ہجرت کے سبب ۱۹۵۶ء میں ڈاکٹر نجم الاسلام صاحب "معیار" کی ادارت سے مستعفی ہوئے۔

پاکستان آنے کے بعد غزالی کالج حیدر آباد میں لیکچرار ہوئے اور اسی کالج میں ایک مختصر عرصے کے لیے پرنسپل کے عہدے پر فائز رہے۔ ۲۸ جنوری ۱۹۶۷ء کو سندھ یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں لیکچرار کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ ڈاکٹریٹ کرلینے کی وجہ سے جلد ہی اسسٹنٹ پروفیسر کے عہدے پر آپ کی ترقی ہوئی اور پھر ۱۹۷۷ء میں شعبہ اردو کے صدر مقرر کردیے گئے۔ ۱۹۹۲ء تک دو مختصر وقفوں کے ساتھ اسی عہدے پر فرائض کی انجام دہی میں مشغول رہے۔ ۳۰ جون ۱۹۹۳ء کو سبکدوش ہوئے۔ اس کے بعد سے سندھ یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں وزیٹنگ پروفیسر اور یونیورسٹی کے تحقیقی جرنل "تحقیق" کے مدیر کی حیثیت سے یونیورسٹی سے وابستہ ہیں۔

"معیار" میرٹھ سے وابستگی کے زمانے میں ۱۹۵۳ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا آل انڈیا لٹریری سمپوزیم منعقد ہوا جہاں آپ نے بحیثیت مدیر اپنا پہلا کانفرنس پیپر پڑھتے ہوئے اس رسالے کے ادبی مقاصد اور نظریات کو واضح کیا۔ یہ مقالہ "معیار" میرٹھ کے تنقید نمبر اور "اردو ادب کا ارتقاء" کے عنوان سے شائع ہونے والی کتاب میں بھی شامل ہے جو علی گڑھ سے منظرِ عام پر آئی۔ اس کانفرنس کے دیگر شرکاء میں خواجہ غلام السیدین، پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر احتشام حسین، ڈاکٹر محمد حسن اور سید اصغر علی عابدی جیسی قد آور شخصیات شامل تھیں۔ پاکستان میں ڈاکٹر نجم الاسلام صاحب کے مدیرانہ کمالات کا عکس سندھ یونیورسٹی کے تحقیقی جرنل "تحقیق" میں دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ ذمہ داری ۱۹۸۶ء میں یونیورسٹی کی طرف سے سونپی گئی۔ سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر آر۔ اے۔ شاہ نے تحقیق کے پچھلے شمارے: ۱۹۹۲ء میں اپنے "پیش گفتار" میں لکھا ہے "میرا خیال ہے کہ ادارتی اور مالی امور میں اس رسالے کی کارکردگی قابلِ ذکر اور قابلِ اطمینان ہے ...... برصغیر کے محترم فضلاء کی رائے "تحقیق" کے حق میں ہے۔ ہم بھی صاد کرتے ہیں۔ مدیر تحقیق (ڈاکٹر نجم الاسلام) کی خدمات برائے مجلّہ اور بطور استاد اور محقق قابلِ تعریف ہیں۔ ایک خاموش خادمِ علم اور مادرِ علمی جامعہ سندھ کے ایک مثبت اور فرض شناس استاد ہونے کے ناتے ہم ان کو سلام کرتے ہیں"۔ ملک کے مقتدر علمی حلقوں میں "تحقیق" کی اہمیت و افادیت اور ڈاکٹر نجم الاسلام صاحب کی محققانہ اور مدیرانہ صلاحیتوں کا اعتراف کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر نجم الاسلام صاحب نے تحقیقی و تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں اور منظوم و منثور تراجم بھی کیے ہیں لیکن آپ کے قلم کا جوہر تحقیق میں بہت نمایاں ہے۔ آپ ہربات کی تہہ تک پہنچتے ہیں اور حقائق کو پردہ اخفا سے باہر لانے میں جس عرق ریزی اور باریک بینی سے کام کرتے ہیں، وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ اس عمل سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ آپ تجزیے کی بھرپور صلاحیت

رکھتے ہیں۔ آپ کے تحقیقی و تنقیدی مقالات و مضامین ملکی و غیر ملکی ادبی و تحقیقی رسائل کی زینت بنتے ہیں۔ کئی کتب اور تراجم کے مجموعے زیورِ طبع سے آراستہ ہوچکے ہیں۔ آپ کی مطبوعہ کتب درج ذیل ہیں:

۱۔ ابھرتی کرنیں: ۱۹۵۳ء

۲۔ عالمی امن: ۱۹۵۵ء

۳۔ نقش و نقد: ۱۹۶۰ء

۴۔ دین و ادب: ۱۹۸۹ء

۵۔ مطالعات: ۱۹۹۰ء

تراجم:

۱۔ محسنِ انسانیت (لیڈی ایلسا قاضی کی طویل انگریزی نعتیہ نظم کا ترجمہ): ۱۹۷۱ء

۲۔ ابیاتِ سندھی خواجہ محمد زماں (خواجہ محمد زماں کی سندھی ابیات کا منظوم اردو ترجمہ): ۱۹۸۰ء

۳۔ ابیاتِ شاہ کریم (شاہ کریم کی ابیات سندھی کا منظوم اردو ترجمہ): ۱۹۸۷ء

۴۔ فکرِ لطیف (اے۔ کے۔ بروہی کے صدارتی خطاب کا اردو ترجمہ): ۱۹۷۹ء

۵۔ دو آہنگ (منتخب فارسی اشعار کا منظوم اردو ترجمہ): ۱۹۸۹ء

ڈاکٹر نجم الاسلام صاحب نے فارسی مقالات سر العالمین کا غزالی سے انتساب: علی رضا ذکاوتی قراگزلو، رسالہ نوریہ کس کی تصنیف ہے: جمال الیاس، کتاب السعادت والا سعاد: نصر اللہ حکمت اور خیام کی اصیل رباعیاں: سید علی میر افضلی کے تراجم بھی کیے ہیں جو تحقیق میں شائع ہوچکے ہیں۔

"دو آہنگ" میں شامل منتخب فارسی اشعار میں سے چند اشعار اور ڈاکٹر صاحب کا منظوم اردو ترجمہ پیش خدمت ہے:

قدسی:

جوانی رفت و داغے ماند بردل یادگار ازوی
چوں تن سرخی کہ بر ناخن پس از رنگِ حنا ماند

ترجمہ:

جوانی جاچکی اک داغِ دل ہے یادگار اس کی
پسِ رنگِ حنا سرخی کا رہنا جیسے ناخن پر

امیر خسروؔ:

ہر کہ گویدا کہ راست می گویم
راست گویم دروغ می گوید

ترجمہ:

جو یہ کہتا ہے کہ سچ کہا میں نے
سچ تو یہ ہے وہ سچ نہیں کہتا

عرفی:

ز نقصِ تشنہ لبی داں بہ عقلِ خویش منار
ولت فریب گر از جلوہ سراب نخورد

ترجمہ:

یہ نقص تشنہ لبی ہے، خرد پہ ناز نہ کر
سراب دیکھ کے دھوکا جو دل نہیں کھاتا

واثق نیشاپوری

اے جواں بر قامتِ خم گشتۂ پیراں مگر
رفتہ رفتہ زندگی بارِ گرانے می شود

ترجمہ:

اے جواں بوڑھوں کے خم کھائے ہوئے قامت کو دیکھ
رفتہ رفتہ زندگی بارِ گراں ہوجائے گی

شبلی:

عیبے بزرگ تر ز ہنر در زمانہ نیست
شبلیؔ بحال مردم دانا گریستیم

ترجمہ:

ہوگا ہنر سے بڑھ کر زمانے میں عیب کیا
اے شبلی حالِ مردمِ دانا پہ رویئے

صائب:

چوں گذارد خشتِ اول بر زمیں معمار کج
گر رساند بر فلک باشد ہماں دیوار کج

ترجمہ:

جب زمیں پر خشتِ اول ہی رکھے معمار کج
آسماں تک بھی جو پہنچائے رہے دیوار کج

قانع سیوستانی

من نگویم کہ دلِ ما تو بدزدی بردی
خود بخود بر سرِ حرفست نگہ دزدیدن

ترجمہ:

میں کیا کہوں کہ دل کا مرے چور کون ہے
کہتا ہے خود ترا یہ چرانا نگاہ کا

ڈاکٹر نجم الاسلام صاحب نے مخطوطات کی تدوین و تحقیق کا کام بھی نہایت باریک بینی اور احتیاط سے کیا ہے۔ روضۃ الانوار، قصہ احوال بیلہ، کلیات مرزا جان طپش، تفسیر مرادیہ، انتخاب خریطہ، جواہریا ترجمہ منظوم، مزید مطالعات کے علاوہ سندھی ادبی بورڈ کے مخطوطات کی وضاحتی فہرست

DESCRIPTIVE CATALOGUE OF THE
MANUSERIPTS OF SINDH ADABI BOARD

تین سال کی محنت و کاوش کے بعد تیار کی ہے "جام شورو کے مخطوطات" پر بھی ڈاکٹر صاحب کام مکمل کرچکے ہیں۔ ان تمام کاموں کی کتابی شکل میں اشاعت جلد متوقع ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے پچاس سے زائد تحقیقی مقالات نقوش لاہور، صحیفہ لاہور، مجلہ تحقیق (پنجاب یونیورسٹی) لاہور، صریر خامہ (سندھ یونیورسٹی) حیدر آباد، خیابان (پشاور یونیورسٹی) پشاور، نئی قدریں حیدر آباد، مجلہ تحقیق (سندھ یونیورسٹی) حیدر آباد، چراغِ راہ اور اردو کالج کے میگزین برگ گل میں شائع ہوچکے ہیں۔

آپ نے کئی قومی و بین الاقوامی اور شعبہ جاتی ادبی کانفرنسوں اور سیمیناروں میں شرکت کی اور اپنے کانفرنس پیپرز پڑھنے کا اعزاز حاصل کیا۔ ان میں سے بیشتر مقالات شائع ہوچکے ہیں۔ طویل مقالات اور کانفرنس پیپرز کے علاوہ آپ نے شعبہ اردو، جامعہ سندھ کی "مجلس تحقیق و مذاکرہ" کے زیر اہتمام ہونے والے مباحثوں میں بھی دلچسپی لی اور ان اجتماعات میں مقالات پڑھے، جن میں اردو زبان و ادب کی

تاریخیں' سحرالبیان کا ایک نادر قلمی نسخہ' مسدس کی ایک غیر مطبوعہ مثنوی' بیاض دولت رائے سندھی' ارشاد نامہ مولوی مخصوص اللہ نبیرہ شاہ ولی اللہ' بیاض عاجز' لب التواریخ رگلستا' کریم الدین پانی پتی کی شرح و انتخاب کلام سودا اور رسالہ تنقید بر کلام شہید شامل ہیں۔

یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ ڈاکٹر نجم الاسلام صاحب نے قلم سے وابستگی کا حق ادا کیا ہے۔ آپ کے تحقیقی و تنقیدی کام کو امتیاز حاصل ہے۔ آپ نے خاموشی کے ساتھ علمی' ادبی' تعلیمی اور تحقیقی و تنقیدی کام سے ثابت کیا ہے کہ انہماک اور دلچسپی کے ساتھ کام کیا جائے تو وہ رہنمائی کا فریضہ بھی انجام دیتا ہے۔ ڈاکٹر نجم الاسلام صاحب کے روشن کئے ہوئے چراغوں کی روشنی میں آج بہت سے طالبانِ علم و فن اپنا علمی سفر جاری رکھے ہوئے ہیں۔ یہ اعزاز محترم موصوف کی خوش قسمتی کی علامت بھی ہے۔

مولانا نذیر احمد خجندی

مولانا نذیر احمد خجندی ہی نہیں' آپ کا خاندان بھی محتاجِ تعارف نہیں ہے۔ اس خاندان نے علم و ادب اور دین و ملت کی جتنی خدمت کی ہے وہ اب تاریخ کا حصہ ہے۔ آپ کے والد عبدالحکیم صدیقی صاحب اعلیٰ شعری و علمی ذوق رکھتے تھے اور جوش و حکیم تخلص فرماتے تھے۔ آپ کے چچا مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی سے کون واقف نہیں ہے۔ خجندی صاحب کے ایک بھائی مولانا مختار احمد صدیقی نے تبلیغ اسلام کے سلسلے میں جنوبی افریقہ میں رہائش اختیار کر لی تھی۔ دوسرے بھائی مبلغ اسلام مولانا شاہ عبدالعلیم صدیقی ہیں جن کے دستِ حق پرست پر لاتعداد غیر مسلم مشرف بہ اسلام ہوئے۔ ممتاز عالم دین محترم مولانا شاہ احمد نورانی اس عظیم مفکر کے صاحبزادے اور ممتاز اسکالر ڈاکٹر فضل الرحمٰن انصاری داماد ہیں۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس خاندان میں کیسی کیسی قد آور شخصیات پیدا ہوئیں۔

مولانا نذیر احمد خجندی کی تعلیم و تربیت علمی و مذہبی ماحول میں ہوئی۔ درس نظامی کے مطالعے سے فارغ ہو کر طب پڑھا۔ آپ نے بمبئی میں کچھ عرصہ طبابت بھی کی۔ مولانا نے عمر کا بڑا حصہ یہیں گزارا۔ اس لئے بمبئی والے آپ کی ادبی' سماجی اور سیاسی شخصیت سے بخوبی واقف ہیں۔ بمبئی میں مولانا خجندی کے دو کارنامے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ ایک یہ کہ آپ نے محمد ذکریا حسنار اور حکیم ابو یوسف اصفہانی کی معاونت سے بمبئی کے آزاد میدان میں نمازِ عیدین کا اہتمام کیا جو آج تک جاری ہے۔ آپ کی دوسری اہم خدمت جشن عید میلاد النبیؐ کا اہتمام ہے جو بڑے عظیم الشان طریقے سے منایا جاتا تھا۔ اس موقع پر منعقدہ جلسوں میں ہر مذہب اور ہر مکتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے اکابرین کو شمولیت و اظہارِ خیال کی دعوت دی جاتی تھی۔ اسی پلیٹ فارم سے قائداعظم محمد علی جناح' نواب بہادر یار جنگ اور مولانا شوکت علی جیسی شخصیات بھی نذرانہ عقیدت پیش کر چکی ہیں۔ اسی پلیٹ فارم سے مسز سروجنی نائیڈو اور سردار تیجا سنگھ جیسے قائدین سیرتِ طیبہ پر اظہارِ خیال کر چکے ہیں۔

بمبئی کے ہی چند ادب دوست حضرات نے ایک ادبی انجمن "بزمِ خیال" کے نام سے قائم کی تھی اس کے صدر جناب ضیاء الدین برنی اور نائب صدر مولانا خجندی تھے۔ اس بزم کی طرف سے کئی کل ہند مشاعرے منعقد ہوئے جن کی وجہ سے اہلِ بمبئی آزاد انصاری' ساغر میرٹھی' جوش ملیح آبادی' سیماب اکبر

آبادی، احسن مارہروی اور بسمل الہ آبادی جیسے شعراء سے متعارف ہوئے۔ مولانا خجندی ان مشاعروں کے انتظامات میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیا کرتے تھے۔

مولانا نذیر احمد خجندی عرصہ دراز تک مسجد خیرالدین بمبئی کے امام رہے۔ یہ مسجد مولانا ابوالکلام آزاد (۱۸۸۸ء۔۱۹۵۸ء) کے والد مولانا خیرالدین مرحوم نے تعمیر کرائی تھی اور آج بھی انہیں کے نام سے مشہور ہے۔ مولانا موصوف مسلم لیگ کے فعال کارکن اور بمبئی مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے رکن تھے۔ آپ نے ہی حضرت قائداعظم کا نکاح رتی بائی سے پڑھایا تھا۔

مولانا بڑے پاک باز، نیک سیرت، صابر و متوکل تھے۔ ایک رات آپ مسجد سے گھر جا رہے تھے کہ راستہ میں موٹر سے ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ عام لوگوں کا خیال تھا کہ بمشکل بچیں گے۔ اللہ کا کرم ہوا اور آپ صحت یاب ہو گئے۔ اس کے بعد حج بیت اللہ کا شوق ہوا اور حجازِ مقدس چلے گئے۔ حج کے بعد بیمار ہو گئے اور شہرِ آرزو مدینہ منورہ میں جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔ یہی آپ کی دیرینہ آرزو تھی جس کے لئے ہمیشہ دعائیں مانگتے تھے۔

حضرت نذیر احمد خجندی نثر و نظم اور خطابت پر پوری قدرت رکھتے تھے۔ آپ کی طبیعت کا یہ عالم تھا کہ کسی بھی مقرر کی تقریر کے ساتھ ساتھ تقریر کو نظم کا جامہ پہناتے جاتے تھے۔

ماخذ : محسنوں کے چراغ، ص ۲۷۵ تا ۲۷۶

نواب الحسن آفاقی

نواب الحسن آفاقی

نواب الحسن آفاقی اپنی ذات میں ایک ایسا ادارہ تھے جس میں ایثار و محبت و خدمت کا درس دیا جاتا تھا۔ وہ زندگی کے ہر حصہ میں دوسروں کی بھلائی کو سینے سے لگائے رہے۔ ان کے نام کے ساتھ آفاقی کا لاحقہ محض تخلص نہیں بلکہ ان کے آفاقی نظریات کا عکاس ہے۔ انسانیت سے محبت اور انسان کی خدمت ان کی حیاتِ مستعار کا مقصود رہا۔

نواب الحسن آفاقی ۱۹۳۳ء میں انچولی ضلع میرٹھ کے ایک معزز شہری شیخ اللہ بخش بن عبدالمجید کے گھر پیدا ہوئے۔ جن کی اولاد میں پانچ بیٹیاں اور دوسرے تین بیٹے شمیم الحسن، تجمل حسین اور پروفیسر شیخ رؤف الحسن ہیں۔ آفاقی صاحب نے ابتدائی تعلیم کا آغاز مکتب اسلامیہ سے کیا۔ پھر پانچویں جماعت کے لئے فیض عام ہائی اسکول میرٹھ میں داخلہ لیا۔ اس وقت تحریکِ آزادیٔ ہند اور تحریکِ پاکستان پورے شباب پر تھی۔ متعصب لوگوں نے مسلمانوں کی جان و مال اور عزت و آبرو کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔ جگہ جگہ فسادات ہو رہے تھے۔ ان حالات سے دل برداشتہ ہو کر ان کے والد نے پاکستان ہجرت کر جانے کا حکم دیا۔ لہٰذا موصوف اپنے بڑے بہنوئی شمس الحسن صاحب کے ہمراہ دسمبر ۱۹۴۷ء میں بمبئی سے سمندری راستے کے ذریعہ کراچی پہنچے اور پھر راولپنڈی میں سکونت اختیار کی اور ساتویں کلاس میں داخلہ لیا۔ ۱۹۵۱ء میں صادق آباد سے میٹرک امتیازی نمبروں کے ساتھ پاس کیا۔ اور پھر ۱۹۵۵ء میں لاہور کے گورنمنٹ انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی سے الیکٹریکل و مکینکل ڈپلومہ دوسری پوزیشن سے حاصل کیا۔ لاہور کے قیام کے عرصے میں دینی و تبلیغی سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ۱۹۵۵ء میں ہی تونسہ بیراج میں اوورسیئر کی حیثیت سے ملازمت کا آغاز کیا۔ شمشاد علی صدیقی کے مطابق "آپ کی اصولی زندگی پی ڈبلیو

ڈی کے بدنام محکمے سے بناہ نہ کرسکی" آفاقی صاحب اپنا دامن بچا کر رخصت پر لاہور چلے گئے وہاں متحدہ آئل ملز موجودہ وزیر علی انڈسٹریز حیدر آباد کی طرف سے تین گناہ زیادہ تنخواہ اور اسسٹنٹ انجینئر کے عہدہ کی پیش کش ہوئی تو موصوف حیدر آباد منتقل ہو گئے۔ وہاں نو سال خدمات انجام دیں۔ پھر فیصل آباد اور شکار پور کے صنعتی کارخانوں میں انجینئر کی حیثیت سے وابستہ رہے اور آخر میں گھی کارپوریشن ڈپٹی جنرل منیجر کے عہدے تک پہنچے۔

کراچی میں ایجولی ایسوی ایشن کے بانی کی حیثیت سے آپ کی خدمات انتہائی یادگار ہیں۔ آفاقی صاحب ادبی ذوق بھی رکھتے تھے۔ مطالعہ کے بہت شوقین تھے۔ آپ کی لائبریری میں مختلف موضوعات سے متعلق اہم کتب کا بڑا ذخیرہ تھا جس سے آفاقی صاحب کے اعلیٰ علمی ذوق کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

نواب الحسن آفاقی صاحب کی شادی ۱۹۶۱ء میں سائرہ بیگم دختر خادم حسین سے ایجولی (میرٹھ) میں ہوئی۔ اولاد میں ارشد نواب، اطہر نواب، امجد مجید اور اسعد عزیز کے علاوہ چار بیٹیاں شگفتہ نواب، انجم پروین، طلیبہ ارجمند اور عظمیٰ پروین ہیں۔

۲۰ نومبر ۱۹۸۶ء کو کسی سے خدمت لئے بغیر خالق حقیقی سے جا ملے۔ اس وقت مرحوم جھنگ گئے ہوئے تھے۔ آپ کی میت کراچی لائی گئی اور سخی حسن کے قبرستان میں تدفین ہوئی۔

صدائے ایجولی مجلہ خصوصی ۱۹۸۷ء

نواب حسین زبیری

نواب حسین زبیری ان شخصیات میں شامل ہیں جو اعلیٰ انسانی قدروں کی امین ہیں۔ انسانیت سے محبت، مزاج کی شرافت، دوسروں کی معاونت، صاف ستھری معاملت اور ہم وطنوں سے قلبی انسیت آپ کی وہ ذاتی صفات ہیں، جنھوں نے آپ کی طبیعت میں مزید انکسار اور دردمندی پیدا کی ہے۔

نواب حسین زبیری خلف جناب نواب محمد زبیری کی ولادت 13 ستمبر 1940ء کو میرٹھ میں ہوئی۔ آپ کے والدین نے 1947ء میں پاکستان ہجرت کی۔ اس وقت آپ کی عمر صرف سات سال تھی۔ ابتدائی تعلیم کا اہتمام راولپنڈی میں ہوا پھر کراچی میں سلسلہ تعلیم جاری رکھا۔ پنجاب یونیورسٹی سے گریجویشن کیا۔

زبیری صاحب نے عملی زندگی کی ابتداء 1969ء میں حکومت پاکستان کی فارن سروسز میں شمولیت سے کی۔ آپ ہی کے ہاتھوں کویت میں پاکستانی مشن قائم ہوا۔ بعد میں آپ نے مختلف حیثیتوں سے ویانا، برلن اور نیویارک میں خدمات انجام دیں۔ نیویارک کے پاکستانی قونصل خانہ میں چودہ سال کام کیا۔ 1988ء میں وزارت خارجہ سے ریٹائر ہو کر امریکہ میں مستقل سکونت پسند کی۔

دوران ملازمت نواب حسین زبیری صاحب نے اپنے وطن کی بے لوث خدمت کی۔ آپ کی شرافت نفس کا ثبوت خدمت کے وہ سلسلے ہیں جن سے آپ کبھی گریزاں نہیں رہے۔ انسانیت کی خدمت کر کے طمانیت حاصل کرنا زبیری صاحب کی شخصیت کا جوہر ہے۔

آپ نے زبیری فیملی کیلئے بھی بیش بہا قربانیاں دی ہیں۔ موصوف زبیری یوتھ ایسوی ایشن کراچی کے سرگرم بانی ارکان میں شامل ہیں۔ امریکہ منتقلی کے بعد وہاں زبیری ایسوی ایشن کے قیام کی منصوبہ بندی کی۔ آپ کی کوششوں سے امریکہ میں زبیری ایسوی ایشن عالم وجود میں آئی، جس کا دفتر نیویارک میں ہے۔ زبیری صاحب اس کے بانی صدر ہیں۔ امریکہ کی مختلف ریاستوں میں اس کی شاخیں قائم ہیں۔ اس ادارے کے مقاصد میں زبیری فیملی میں اتحاد و یکجہتی کو فروغ دینا، نئی نسل کو اپنی روایات واقدار سے متعارف کرانا، ہندوستان میں مقیم برادری کے مستحق افراد کی مالی مدد کرنا اور باہمی رابطوں کو مضبوط بنانا شامل ہیں۔ آپ کی جدوجہد زبیری برادری کے لئے باعث تقویت ہے۔

نواب حسین زبیری صاحب کی شادی محترمہ شاکرہ زبیری سے ہوئی۔ اولاد میں ایک صاحبزادے ریحان زبیری اور دو بیٹیاں فائزہ زبیری اور سحرین زبیری ہیں۔ فائزہ صاحبہ لیڈی ڈاکٹر ہیں۔ ریحان زبیری اپنا کمپیوٹر کا کاروبار کر رہے ہیں اور سحرین زبیری یونیورسٹی میں زیر تعلیم ہیں۔

وجاہت شیر خاں

وجاہت شیر خاں

وجاہت شیر خاں کی وجہِ شہرت مصوری ہے۔ قدرتی مناظر کو پیش کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ ان کے فن میں پورٹریٹ اور پرند و عمارات شامل ہیں۔ مصوری میں وجاہت صاحب حقیقت پسندی کے قائل ہیں۔ تجریدی آرٹ سے انہیں کوئی رغبت نہیں ہے۔ وہ جس منظر کو اپنے کینوس پر دوام بخشنے کا ارادہ کرتے ہیں اسے اپنی پوری صلاحیتوں کے ساتھ قرطاس پر منتقل کر دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ مجسمہ سازی سے بھی انہیں دلچسپی ہے۔ ان کے بنائے ہوئے مجسمے اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔

وجاہت صاحب کے والد شیر علی خاں محکمۂ پولیس سے وابستہ تھے۔ اس لئے آئے دن سکونت تبدیل ہوتی رہتی تھی۔ وہ بسلسلۂ ملازمت سیتاپور میں تعینات تھے، یہ علاقہ کوہ ہمالیہ کے دامن میں واقع ہے اور قدرتی مناظر، سرسبز، درختوں اور ندیوں نالوں سے مزین ہے۔ اسی شہر میں وجاہت صاحب کی ولادت ۱۹۴۷ء میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم کی منزلیں کانپور، بدایوں، رام پور اور پرتاپ گڑھ سے طے کرتے ہوئے علی گڑھ پہنچے، جہاں سے ۱۹۷۰ء میں انجینئرنگ کی سند حاصل کی اور پاکستان آگئے۔ یہاں ان کے بھائی کرامت شیر خاں، عنایت شیر خاں اور ڈاکٹر رفاقت شیر خاں پہلے سے موجود تھے۔

کراچی میں وجاہت صاحب نے ایک دوا ساز کمپنی میں چند سال ملازمت کی اور پھر امریکہ چلے گئے اب مستقل قیام وہیں ہے۔ امریکہ میں ایک انجینئرنگ ادارے سے وابستہ ہیں۔

وجاہت صاحب کی شادی ۱۹۷۳ء میں چچا توصیف علی خاں کی صاحبزادی دردانہ سے ہوئی۔ اپنے بچوں شارق، کاشف، نادیہ اور شہروز کی تعلیم و تربیت میں مصروف ہیں۔ موصوف ملائشیا، دبئی اور دیگر ممالک کا سفر اور

حج کی سعادت حاصل کر چکے ہیں۔

وجاہت شیر خاں کے چند فن پارے ملاحظہ فرمائیے۔

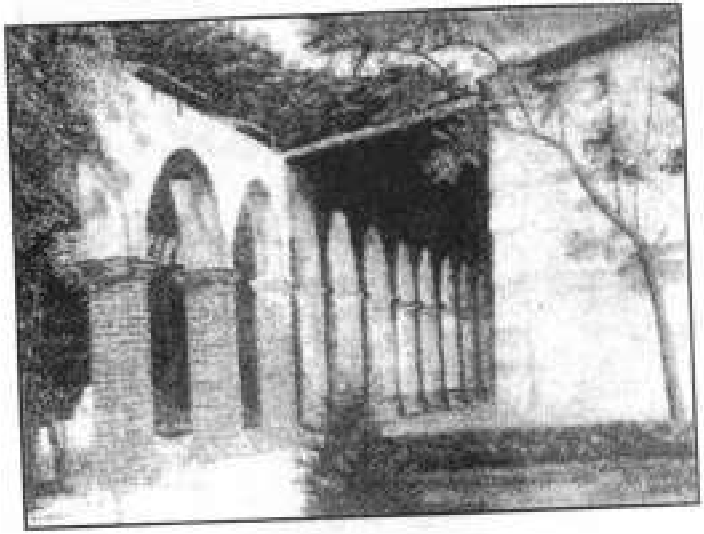

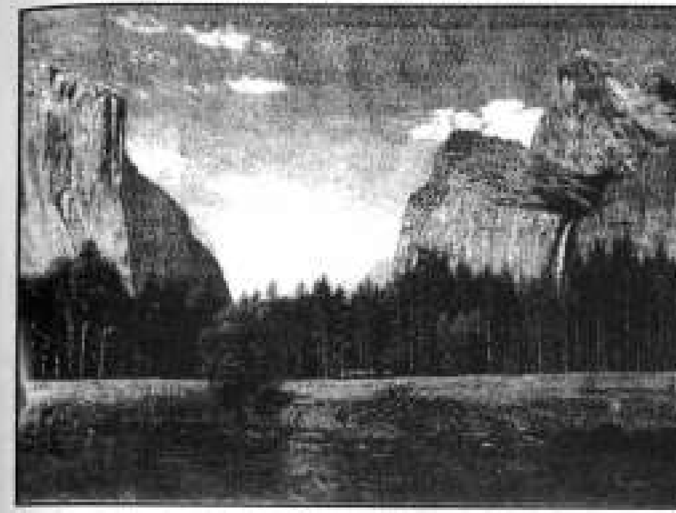

حاجی محمد وجیہ الدین

خان بہادر حاجی وجیہ الدین

خان بہادر حاجی وجیہ الدین میرٹھ کے ایک معزز شیخ گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ اس خاندان کے مورثِ اعلیٰ شیخ خدا بخش ڈھائی سو سال پہلے میرٹھ میں آکر آباد ہوئے تھے اور ایک بڑے کاروبار کے مالک تھے۔ شیخ خدا بخش نے شہر اور قرب و جوار کی تجارتی اور سیاسی زندگی میں جو ایک ممتاز حیثیت حاصل کی تھی وہ وقت کے ساتھ اس خاندان کی ایک روشن روایت بن گئی۔

۱۸۳۵ء میں اس خاندان کے ایک عظیم فرد شیخ حاجی سراج الدین نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے میں الٰہی بخش اینڈ کمپنی کے نام سے بیرونی ممالک سے اسلحات درآمد کرنے کے لئے ایک بڑی فرم قائم کی۔ یہ ہندوستان میں اپنی نوعیت کی پہلی فرم تھی۔ شیخ حاجی سراج الدین کے بعد ان کے بیٹے حاجی شیخ حفیظ الدین نے کاروبار کو اور آگے بڑھایا اور ان کے بھائی حاجی حافظ شیخ فصیح الدین بھی اس کاروبار سے متعلق ہو گئے۔

حاجی وجیہ الدین ۱۸۸۱ء میں میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ گھر پر عربی، فارسی اور انگریزی کی تعلیم حاصل کی۔ آپ کی شادی شیخ کریم الدین کی صاحبزادی سے ہوئی۔ آپ نے ۱۹۰۰ء میں ایک فرم رائل پائنیر کمپنی کے نام سے قائم کی۔ اس فرم نے بہت شہرت حاصل کی۔ ۱۹۳۲ء میں کمپنی کا نام بدل کر پائنیر آرمس کمپنی رکھا گیا اور ۱۹۳۳ء میں اس کا صدر دفتر میرٹھ سے دہلی منتقل کر دیا گیا۔ پاکستان کے قیام کے بعد کراچی میں سکونت اختیار کر کے کاروبار شروع کیا۔ یہاں بھی اس کمپنی نے شہرت حاصل کی۔

خان بہادر حاجی وجیہ الدین نے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی سے بیعت ہو کر دینی کاموں میں بھرپور حصہ لیا۔ اس خاندان نے مدرسوں کی مالی مدد کی، فلاحی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ یہ گھرانہ روایات و اقدار کا امین رہا۔ خان بہادر موصوف انہیں خدمات کے حوالے سے ہر دل عزیز تھے۔ ہندوستان کی مجلس قانون ساز کے ممبر رہے۔ مولانا امداد صابری نے تحریر کیا ہے کہ ان کی کمائی کا بیشتر حصہ مساجد و

مدارس کی تعمیرات پر خرچ ہوتا تھا۔

آپ انتقال سے چند سال پہلے ہجرت کر کے مدینہ منورہ پہنچے اور وہیں سکونت اختیار کی اور وہیں۔ ۱۰ شعبان المکرم ۱۳۸۳ھ مطابق ۲۶ دسمبر ۱۹۶۳ء کو جمعرات کے روز فوت ہوئے۔ اپنی جسمانی یادگار دو صاحبزادے حاجی حافظ جمیل الدین اور حاجی فرید الدین چھوڑے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس خاندان کی بیشتر افراد حاجی بھی ہیں اور حافظ بھی۔ حاجی وجیہ الدین صاحب کو شاعری سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ کبھی کبھی شعر کہتے تھے۔ چند نعتیہ اشعار بطور نمونہ پیش خدمت ہیں۔

عالم نہ متقی ہوں نہ پرہیزگار یا رسولؐ
ہوں امتی تمہارا گنہگار یا رسولؐ

دونوں جہاں میں مجھ کو وسیلہ ہے آپؐ کا
ہوں معصیت سے اپنی بہت خوار یا رسولؐ

ذات آپؐ کی تو رحمت و شفقت ہے سر بہ سر
گو میں تمام تر ہوں خطاوار یا رسولؐ

جس روز عاصیوں کی شفاعت کریں حضورؐ
اس دن نہ بھولئے مجھے زنہار یا رسولؐ

ماخذ : حجاز مقدس کے اردو شاعر۔

حافظ جمیل الدین اوجیہ

وحید الدین احمد

ڈاکٹر سرضیاء الدین احمد کے بڑے بھائی محترم فرید الدین احمد کے صاحبزادے وحید الدین احمد صاحب کا مکان خیر نگر میں تھا۔ وہ زندگی بھر محکمہ ریلوے سے وابستہ رہے۔ اس وابستگی کی وجہ سے مختلف شہروں میں فرائض کی ادائیگی کے لئے قیام کرنا معاشی مجبوری تھی۔ علی گڑھ میں سکونت کے زمانے میں ۲۶ جنوری ۱۹۲۹ء کو ان کے ہاں پہلے بیٹے کی ولادت ہوئی جس کا نام وحید الدین احمد رکھا گیا۔ اس کے بعد تین اور بیٹوں زین الدین احمد (نیوی سے ریٹائرڈ) مسیح الدین احمد (ٹیکسٹائل انجینئر) اور حسام الدین احمد (فزیوتھراپسٹ) سے اللہ تعالیٰ نے نوازا۔

وحید الدین احمد صاحب کی ابتدائی تعلیم علی گڑھ میں ہی ہوئی۔ پھر جہاں جہاں والد کا تبادلہ ہوتا رہا تعلیمی سلسلہ جاری رہا۔ اس لئے کانپور سے میٹرک اور الٰہ آباد سے انٹر کے امتحانات میں کامیابی حاصل کی۔ ۲ فروری ۱۹۴۸ء کو براستہ بمبئی بحری جہاز سے پاکستان آئے اور کراچی میں رہائش پذیر ہوئے۔ یہاں تعلیمی تسلسل قائم رکھتے ہوئے ۱۹۵۲ء میں این۔ ای۔ ڈی انجینئرنگ کالج سے فارغ التحصیل ہوئے۔ شروع میں تھوڑے تھوڑے عرصے سندھ پی۔ ڈبلیو۔ ڈی کے علاوہ پرائیویٹ اور مختلف تعمیراتی کمپنیوں سے وابستہ رہے اور پھر ۱۹۵۸ء میں پاکستان نیوی کی انجینئرنگ سروس میں آئے۔ منوڑہ میں قیام رہا۔ بعد میں یہ شعبہ آرمی کے ملٹری انجینئرنگ سروسز کا حصہ بن گیا۔ جس کے بعد وحید الدین احمد صاحب کا تبادلہ ہوں میں ہوا۔ آپ نے بری، بحری اور فضائی افواج کے لئے اپنی صلاحیتیں وقف رکھیں۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں وحید الدین احمد صاحب کو تمغہ جنگ اور فرنٹ پر رہنے کی وجہ سے ستارہ حرب سے بھی نوازے گئے ۱۹۸۷ء میں گریڈ بیس سے ریٹائر ہوئے۔ یہ گریڈ بریگیڈیئر کے عہدے کے مساوی ہے۔ آپ نے شاہراہ قراقرم کی تعمیر میں دل و جان سے کام کیا ہے۔ بقول وحید صاحب "یہ ایک اہم دلچسپ اور سخت زندگی رہی"۔ آپ نے دوران ملازمت جون ۱۹۷۸ء سے دسمبر ۱۹۸۱ء تک ڈیپوٹیشن پر سعودی عرب میں بھی خدمات انجام دی ہیں۔

ذاتی زندگی میں وحید الدین احمد صاحب قسمت کے دھنی رہے۔ ۱۹۵۴ء میں پہلی بار میرٹھ گئے تو وہاں آپ کی شادی حاجی مصطفیٰ علی کی صاحبزادی اور اشرف علی زبیری صاحب کی بہن قیصر جہاں سے ہوئی۔ آپ کی اولاد میں ایک صاحبزادے نعیم الدین احمد ہیں جو پاکستان آرمی میں میجر ہیں۔ ایک ہی صاحبزادی معین فاطمہ ہیں جن کی شادی ڈاکٹر مجاہد ظفر سے ہوئی۔ ڈاکٹر مجاہد ظفر سعودی عرب کی وزارت صحت سے منسلک ہیں۔

وحید الدین احمد صاحب مطالعہ کے شوقین ہیں۔ ادب کا صاف ستھرا ذوق رکھتے ہیں۔ دینی مزاج ہے۔ کئی مرتبہ حج کی سعادت حاصل کر چکے ہیں۔ اور بے شمار عمرے بھی کئے ہیں۔

وزیر علی

ضلع میرٹھ کے تمام علاقے تاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس ضلع کے باشندوں نے زندگی کے تمام شعبوں میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ انچولی بھی میرٹھ کا ایک قدیم قصبہ ہے۔ یہاں کے لوگ ہمیشہ نڈر اور بیباک بھی رہے ہیں اور ہمیشہ حالات کا عزم و حوصلہ سے مقابلہ کیا ہے۔

۱۸۵۷ء کے جنگ آزادی میں انچولی کے شہریوں نے اپنے عظیم سپوت وزیر علی کی قیادت میں تاریخی قربانیاں دیکر سنہری باب رقم کیا۔ وہ انچولی کے ایک بزرگ قلندر علی شاہؒ کے بیٹے تھے۔ ان کے بڑے بھائی امیر علی اور دو چھوٹے بھائی منیر علی اور مہربان علی تھے۔ وزیر علی صاحب کی ولادت ۱۸۰۱ء میں ہوئی۔ ۱۸۴۰ء میں ان کے والد کا انتقال ہوا۔ اس وقت والد کی عمر ساٹھ سال تھی۔ والد کے رخصت ہو جانے کے بعد تمام ذمہ داریاں امیر علی صاحب کا فرض بن گئیں۔ انہوں نے اپنے تینوں چھوٹے بھائیوں کی تعلیم و تربیت پر بھرپور توجہ دی۔

وزیر علی صاحب بچپن ہی سے نہایت باشعور اور بہادر تھے۔ انہوں نے فن سپاہ گری جنرل بخت خاں کے تجربہ کار استادوں سے حاصل کیا۔ وہ جنرل بخت خاں کے انتہائی بااعتماد ساتھیوں میں سے تھے۔ جنرل بخت خاں نے وزیر علی صاحب کے مشورہ سے ایک لشکر تیار کیا تھا تاکہ وقت ضرورت یہ بہادر شاہ ظفر کے کام آسکے۔ وزیر علی صاحب کا نمایاں وصف یہ تھا کہ وہ ہر کام فوری کرتے تھے اور اس قدر برق رفتاری کے ساتھ کہ لوگ تعجب کرتے رہ جاتے۔ ان کے تربیت یافتہ مجاہد انگریزوں کی حکمت عملی اور منصوبوں سے آگہی حاصل کر کے ان تک پہنچاتے تھے اور وزیر علی صاحب ان خفیہ اطلاعات سے جنرل بخت خاں کو آگاہ کرتے تھے۔ جنگ آزادی کے دوران وزیر علی کی سپاہ جنرل بخت خاں کے زیرکمان کشمیری گیٹ دہلی کے قرب و جوار میں فصیل کے دونوں طرف انتہائی بہادری سے لڑیں اور کئی مرتبہ انگریزی افواج کا محاصرہ توڑنے میں کامیاب ہوئیں۔ مغل بادشاہوں کی شکست کے بعد ان کے لشکر کے اکثر افراد نیپال کی ترائی میں چلے گئے اور ایک عرصے تک انگریز افواج پر شب خون مارتے رہے۔

وزیر علی صاحب کا اس دور کا ایک واقعہ زبان زد ہے۔ یہ غالباً ۱۸۷۶ء کی بات ہے کہ انہوں نے اپنے مختصر ساتھیوں کی مدد سے سات اضلاع میں برطانوی حکومت کے خزانے ایک ہی رات میں لٹوا دیے تھے۔

ان کو بڑی قدر و منزلت حاصل تھی اور ایک ہیرو کی حیثیت سے ان کا احترام کیا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ ڈاکو تک ان کی عزت و عظمت کا بڑا خیال رکھتے تھے۔

یہ بہادر، نڈر اور زیرک سالار جو تلوار کے جوہر اور گھوڑے کی سواری میں یکتائے روزگار تھا ۱۸۸۲ء میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر اسی سال تھی۔ ان کی آخری آرام گاہ انچولی میں پکے کنویں کے قبرستان میں ہے۔ آج بھی وزیر علی صاحب کی بہادری کے قصے گھروں میں سنائے جاتے ہیں۔

(بہ شکریہ سرفراز حسین عابدی)

==========

وقار احمد زبیری

وقار احمد زبیری

تحریکِ پاکستان کے مخلص کارکن اور ممتاز سماجی رہنما وقار احمد زبیری اپنی متحرک شخصیت کے حوالے سے پورے ملک میں پہچانے جاتے ہیں۔ خصوصی طور پر قائدینِ ملت کے ایام کے مواقع پر تقاریب کا اہتمام کرنے میں پیش پیش رہتے ہیں۔

آپ کی ولادت ۸ نومبر ۱۹۲۸ء کو میرٹھ میں ہوئی۔ آپ کے والد صدیق احمد زبیری کا تعلق ایک علمی و ادبی گھرانے سے تھا۔ آپ سات بہن بھائی انعام احمد' سعید احمد' خورشید احمد' وقار احمد' خورشید بانو' سعید بانو اور روشن آراء تھے۔ اب صرف آپ کے علاوہ ایک بہن سعید بانو حیات ہیں۔

وقار احمد زبیری صاحب نے ابتدائی تعلیم خیر نگر کی مسجد میں حاصل کی پھر گورنمنٹ ہائی اسکول اور فیض عام انٹر کالج میں زیرِ تعلیم رہے۔ اسکول کے زمانے میں غیر تدریسی سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے اور گورنمنٹ ہائی اسکول کی ہاکی ٹیم کے دو سال تک کپتان رہے۔ اسکول ہی کے زمانے سے سیاست میں بھی دلچسپی لی۔ میرٹھ میں سید تسنیم الحسن کے ساتھ میرٹھ مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن اور مولانا شرافت علی کے ساتھ بزمِ پاکستان کے جوائنٹ سیکریٹری رہے۔ بزمِ پاکستان دہلی' میرٹھ اور کانپور میں قائم تھی۔

وقار صاحب نے مسلم لیگ کے اجلاس کے موقع پر دہلی میں قائداعظم سے ملاقات کا شرف حاصل کیا۔ سید تسنیم الحسن' اقبال حسین اور خود وقار صاحب نے اپنے خون سے پاکستان کا نقشہ بنا کر ۲۱ جنوری ۱۹۴۶ء کو میرٹھ اسٹیشن پر قائداعظم کو پیش کیا۔ یہ جامعہ کراچی میں محفوظ ہے۔ آپ نے تحریکِ پاکستان کے زمانے میں کئی جلوس منظم کئے اور انگریز پولیس سے بھی ٹکرا گئے۔

اسکول کے زمانے میں اپنے ذاتی اخراجات کے لئے چھوٹے موٹے کاروبار کئے۔ اپنے ایک دوست انور علی کے ساتھ مل کر آلو کے کھیت خریدے' کبھی بکری کے بچے پالے اور کبھی ہوا شوٹ خرید کے بیچے۔ قائداعظم کی بڑی بڑی تصویریں لاہور سے خرید کر میرٹھ لاتے۔ اسی دوران قیامِ پاکستان کا اعلان ہوا اور

یہ تصویریں وہاں نہ بک سکیں البتہ آپ یہ تمام تصویریں لے کر اسپیشل ٹرین سے کراچی آگئے اور یہاں اپنے بہنوئی ظہور حیدر زبیری کے گھر کو اپنا مستقر ٹھہرایا جو ریلوے میں ملازم ہونے کی وجہ سے یہاں پہلے ہی سے مقیم تھے۔ کراچی میں انٹر کامرس کرنے کے بعد ایک کمپنی میں ملازم ہوئے اور کمپنی کے کاموں کے سلسلے میں پورے ملک کے دورے کئے۔ کراچی میں مہاجرین کی آبادکاری کے کاموں میں بھی آپ نے حصہ لیا اور کئی رہائشی بستیوں میں عمل دخل ہوتے ہوئے بھی نہ کوئی مکان حاصل کیا اور نہ پلاٹ بلکہ حکومت کی اعانت کے بغیر سماجی شعبے میں جدوجہد جاری رکھی۔

آپ نے کراچی میں مجلس کارکنانِ تحریکِ پاکستان کی بنیاد رکھی اور اس کے جنرل سیکریٹری کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ مسلم لیگ کے جلسوں میں پابندی سے شرکت کرتے رہے ہیں۔ آپ کے مضامین بھی اخبارات و رسائل کی زینت بنتے رہتے ہیں۔

وقار احمد زبیری صاحب کی قومی خدمات کے اعزاز میں اپنے وقت کے وزراء اعظم بے نظیر بھٹو نے نیشنل ایوارڈ اور محمد خان جونیجو نے تحریکِ پاکستان گولڈ میڈل اور سند پیش کی۔ نواب وقار الملک ایوارڈ اور لیاقت میموریل ایوارڈ بھی حاصل کر چکے ہیں۔ کئی دوسرے اداروں نے بھی اعزازات سے نواز کر آپ کی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔

وقار احمد زبیری، اقبال حسین اور تسنیم الحسن کے خون سے بنا ہوا پاکستان کا نقشہ جو میرٹھ کے مسلم طلبہ کی طرف سے قائداعظم کو ۲۱ جنوری ۱۹۴۶ء کو پیش کیا گیا۔

ہارون احمد زبیری

ہارون احمد زبیری

ہارون احمد زبیری صاحب کے والد مصطفی احمد زبیری مرحوم ابن محمد علی مرحوم میرٹھ کے "لال کا بازار" میں درزی والی حویلی میں رہتے تھے۔ وہیں ۱۴ دسمبر ۱۹۵۳ء کو ہارون احمد زبیری صاحب نے آنکھ کھولی۔ آپ کے دوسرے بھائی اسعد اللہ زبیری، امان اللہ زبیری اور سلیمان احمد زبیری کے علاوہ ایک بہن کشور معین زبیری ہیں۔ چاروں بھائی زندگی کے خدوخال سنوارنے میں مصروف ہیں۔ اسعد اللہ زبیری بینکار ہیں۔ امان اللہ زبیری کا تعلق بھی بینکنگ سے رہا اور اب ذاتی کاروبار کررہے ہیں۔ سلیمان احمد زبیری کمپیوٹر ٹیکنالوجی کے اے بی ایم ۲۱۵ سسٹم سے وابستہ ہیں۔ علم و ادب کی خدمت اس خاندان کا ورثہ رہا ہے۔

ہارون احمد زبیری صاحب کی تعلیم و تربیت میرٹھ میں ہی ہوئی۔ تعلیم کا آغاز محلہ کوٹلہ میں واقع اسکول سے ہوا اور پھر گورنمنٹ کالج میرٹھ سے ۱۹۷۰ء میں انٹر کرکے پاکستان کی شہریت حاصل کی اور کراچی میں سکونت پسند کی۔ یہاں کراچی یونیورسٹی سے ۱۹۷۲ء میں بی کام اور ۱۹۷۷ء میں سی اے (اے ایف فرگوسنز) کرکے اپنی اعلیٰ تعلیم مکمل کی۔

آپ کی تربیت اور کردار سازی میں والدین اور اساتذہ کا بنیادی کردار ہے۔ والدین جھوٹ سے نفرت کرتے تھے۔ والد مصطفی احمد زبیری کے قول و فعل میں کوئی تضاد نہیں تھا۔ وہ ایک صاف ستھرے کردار کے حامل شخص تھے۔ میرٹھ میں تعلیم کے دوران آپ کے ایک استاد جناب مراری لال نے گہرے نقش چھوڑے۔ وہ ایک بااصول، انسانیت پسند اور اپنے فرائض دیانت داری سے ادا کرنے والے شفیق مدرس تھے۔ سی اے کے دوران نور عالم صاحب کے معمولات سے متاثر ہوئے جن کا ظاہر و باطن ایک تھا۔ ہارون صاحب نے زندگی کے ان اوصاف کو عزیز رکھا ہے اور اپنی متاع گم گشتہ کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ محنت اور سچ کو انسانیت کی معراج قرار دیتے ہیں۔

ہارون صاحب نے گریجویشن کے ساتھ ہی عملی تگ و دو کا آغاز کیا۔ ملٹی نیشنل کمپنی ایبٹ میں چیف

اکاؤنٹینٹ ہوئے پھر آئی۔ سی۔ آئی۔ ایوری میں فائنینس منیجر رہے۔ یہاں سے منتقل ہو کر گندھارا گروپ آف انڈسٹریز میں جنرل منیجر فائنینس کی حیثیت سے خدمات انجام دیں اور پھر گندھارا لیزنگ سے متعلق ہوئے اور مینیجنگ ڈائریکٹر کے فرائض سنبھالے۔ آج کل جنرل ربر اینڈ ٹائرز میں مینیجنگ ڈائریکٹر ہیں۔ گندھارا سے وابستگی کے زمانے میں ریٹائرڈ جنرل حبیب اللہ خان سے مراسم رہے۔ ان کے نظم و ضبط اور معاملہ فہمی کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ہارون صاحب کہتے ہیں کہ وہ ایک ایسے جنرل تھے جو شہری امور میں بھی گہرا شعور رکھتے تھے اور شہری زندگی کے کامیاب منصوبہ ساز تھے۔ زمانہ طالب علمی اور فرائض کی ادائیگی کے دوران ہارون صاحب نے جو مشاہدہ کیا اور تجربات حاصل کئے ان سے ان میں صحیح تجزیہ کرنے کی قدرت حاصل ہوئی اور آج وہ زندگی کے ایک ایسے ناقد ہیں جس میں توازن کی جلوہ آرائی بھی ہے اور وہ وصف بھی جو آدمی کو انسان بناتا ہے۔ آپ نے ہمیشہ مثبت پہلو سامنے رکھے اور اسی کی افادیت کے قائل ہیں۔ کردار سازی ہارون صاحب کی شخصیت کا جوہر ہے۔

موصوف نے دوران کار متعدد بار جاپان، کوریا، تھائی لینڈ، سنگاپور، سوئٹزرلینڈ، فرانس، ترکی اور مصر کے دورے کئے۔ کئی مرتبہ عمرے اور دو مرتبہ حج کی سعادت سے مشرف ہو چکے ہیں۔ ہارون احمد زبیری صاحب کی شادی ۱۹۸۱ء میں آنسہ عروسہ بنت نواب علی خاں سے کراچی میں ہوئی۔ نواب صاحب حیدرآباد میں ایس۔ پی پولیس رہ چکے ہیں۔ آپ کی اولاد میں چار بیٹیاں سحر، ثمر، نورین اور منال ہیں جو تعلیم حاصل کررہی ہیں۔

ڈاکٹر فریدہ احمد

دخترانِ میرٹھ میں جن خواتین نے زندگی کے مسائل کے حل قومی بیداری اور فکر و عمل کے چراغ روشن کئے ہیں ان میں ڈاکٹر فریدہ احمد بھی قابلِ ذکر ہیں۔ ان کی زندگی محنت سے عبارت ہے۔

مبلغِ اسلام مولانا شاہ عبدالعلیم صدیقی کی صاحبزادی ڈاکٹر فریدہ احمد کی ولادت میرٹھ میں ۱۹۳۵ء میں ہوئی۔ آپ سات بہن بھائی ہیں جن میں سب سے بڑے ممتاز عالم مولانا شاہ احمد نورانی صدیقی ہیں۔

محترمہ کی ابتدائی تعلیم و تربیت خاندانی روایات کے مطابق ہوئی۔ آپ نے سلسلۂ تعلیم جاری رکھتے ہوئے ۱۹۵۸ء میں ایم۔ اے، بی۔ ایڈ کیا اور پھر ایم۔ پی۔ ایچ۔ ایس کرنے کے بعد سماجی، فلاحی اور دینی کاموں کا آغاز کیا۔ ۱۹۵۹ء میں وومین اسلامک مشن کی بنیاد رکھی اور پھر ۱۹۷۱ء میں سیاسی میدان میں متحرک ہوگئیں اور جنرل سیٹ سے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ ڈاکٹر فریدہ احمد جمعیت علمائے پاکستان کے شعبہ خواتین کی پورے پاکستان میں صدر بھی رہ چکی ہیں۔ آپ نے ایک دور میں سوشلزم کے خلاف انتھک کام کیا اور ملک کے ہر حصے کے دورے کئے۔ ۲۰۰۲ء کے انتخابات میں خواتین کی مخصوص نشستوں پر قومی اسمبلی کی رکن بنی ہیں۔

ڈاکٹر فریدہ احمد پاکستان اسلامک مشن انٹرنیشنل کی وائس چانسلر، سندھ زکوۃ کونسل اور نیشنل کمیشن آف اسٹیٹس آف وومین (قومی کمیشن برائے صنفِ خواتین) کی ممبر ہیں۔ وومین اسلامک مشن ایک فعال تحریک کے طور پر سرگرمِ عمل ہے۔ یہ ایک رفاہی، تعلیمی اور مذہبی انجمن ہے جس کے قیام کے محرکات، اغراض و مقاصد میں نرسری، پرائمری و سیکنڈری اسکولز اور فری ڈسپنسریز کا قیام شامل ہے۔ اس ادارے کے زیرِ اہتمام پورے ملک میں ۶۵ کے قریب ترجمۃ القرآن سینٹرز کام کر رہے ہیں۔ اس تنظیم کے تحت تبلیغی دوروں کا بھی انتظام کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر فریدہ احمد کو دین سے بے پناہ محبت ہے۔ وہ پردے کی پابندی کرتے ہوئے دین کی تبلیغ کے لئے ہمہ وقت مصروف رہتی ہیں۔ انہوں نے اپنے عالمی دوروں میں بھی پردے کا خاص خیال رکھا ہے۔ وومین اسلامک مشن کی وائس چانسلر کی حیثیت سے برطانیہ، امریکہ، فرانس، کینیڈا، ہالینڈ، ماریشس اور دوسرے یورپی ممالک کا سفر کر چکی ہیں۔ محترمہ نے وہاں کے عوام کو اسلامی تعلیمات سے روشناس کرانے کا فریضہ پوری ذمہ داری کے ساتھ ادا کیا۔ آپ کا اندازِ خطابت بھی سادہ اور دلنشیں ہوتا ہے۔ بڑے اجتماعات میں بھی اپنے مدلل خطاب سے حاضرین کو متاثر کرتی ہیں۔

ڈاکٹر فریدہ احمد باہمی اعتماد و یکجہتی کو وطنِ عزیز کے استحکام کے لئے ضروری قرار دیتی ہیں۔ محترمہ خواتین میں تعلیم کی اہمیت کا شعور اجاگر کرنے اور تعلیمی تناسب کو بڑھانے کے لئے اپنے وسائل میں کام بھی کر رہی ہیں اور

اس کے ساتھ ساتھ اپنی تجاویز سے متعلقہ اداروں کو آگاہ بھی کرتی رہتی ہیں۔ اپنے بڑے بھائی مولانا شاہ احمد نورانی صدیقی کو آئیڈیل شخصیت سمجھتی ہیں۔

ڈاکٹر فریدہ احمد کی شادی الٰہ آباد کے ایک دیندار گھرانے سے تعلق رکھنے والے محمد احمد صدیقی صاحب سے اپریل ۱۹۶۳ء میں ہوئی۔ محترم محمد احمد صدیقی جمعیت علمائے پاکستان کے مرکزی سیکریٹری نشر و اشاعت ہیں۔ موصوف اپنی اہلیہ کے کاموں میں معاونت کرتے ہیں۔ آپ کی اولاد میں دو بیٹے طلحہ صدیقی اور جنید صدیقی کے علاوہ ایک صاحبزادی ہیں جو سعودی عرب میں مقیم ہیں۔ طلحہ صدیقی کینیڈا اور جنید صدیقی ہانگ کانگ میں مقیم ہیں۔

مؤلف کتاب

رقم السطور نور احمد میرٹھی خلف سید محمد احمد بن سید عبدالقدیر بن سید عبدالعزیز کی میرٹھ سے جذباتی وابستگی بھی ہے۔ اس کا ایک سبب یہ ہے کہ میری پرورش نانا سید نور الٰہی مرحوم بن مولوی سید مظفر حسین کے زیر سایہ ہوئی۔ ان کے چھوٹے بھائیوں محمد الٰہی' حافظ اشفاق الٰہی' صوفی مشتاق الٰہی اور تعریف الٰہی صاحبان کی محبتیں بھی مجھے حاصل رہیں۔ ان چاروں بھائیوں نے شادی نہیں کی تھی۔ نانا مرحوم فطرتاً نیک' ایثار پرور' شرافت کا نمونہ اور خاموش طبع تھے۔ دین کی طرف بہت زیادہ رجحان تھا۔ اکثر علماء کرام اور صوفیا حتیٰ کہ مجذوب اور فقراء بھی ان کے مہمان ہوتے تھے۔ میرٹھ چھاؤنی کے بارونق علاقہ صدر میں ان کا کاروبار تھا۔ یہاں پنجابی سوداگران کثیر تعداد میں آباد تھے۔ اس لئے ہمارا طرز معاشرت بھی ویسا ہی رہا۔ پھر نانی بسم اللہ مرحومہ اسی برادری کی ایک فرد تھیں۔ آج یہ کتاب مکمل کرتے ہوئے مجھے اپنے بے حد شفیق نانا یاد آرہے ہیں جن کی تربیت اور دعاؤں کا فیض ہے کہ میں نے میرٹھ کے حوالے سے اپنا یہ کام مکمل کیا۔

نور الٰہی

محمد الٰہی

حافظ اشفاق الٰہی

میری پیدائش تقسیم ہند سے چند ماہ قبل دہلی میں ہوئی۔ دہلی میرا ددھیال ہے۔ سوا مہینے کے بعد جب والدہ محترمہ شکیلہ خاتون میرٹھ آئیں تو اس وقت دادی احمد سلطان مرحومہ نے مجھے میرے نانا کو سپرد کرتے ہوئے

صوفی مشتاق الٰہی

تعریف الٰہی

سید محمد احمد

کہا کہ ماموں یہ آپ کی امانت ہے۔ نانا مرحوم کی کوئی نرینہ اولاد زندہ نہ رہی تھی۔ اس لئے دادی مرحومہ چاہتی تھیں کہ انہیں کوئی خلاء محسوس نہ ہو۔ میں نے آنکھ کھول کر نانا نانی کو ہی دیکھا تھا۔ 1948ء میں میرے والد' دادا' دادی' دو چچا' پھوپھی پاکستان آگئے۔ چند سال بعد والدہ بھی کراچی آگئیں جبکہ میں اپنے نانا کے پاس میرٹھ میں ہی رہا۔ اس وقت میرے تین تایا' ایک چچا اور بڑے بھائی ڈاکٹر سید نثار احمد دہلی میں تھے۔ یہ خاندان اب بھی دہلی میں سکونت پذیر ہیں۔

میں نے سب سے پہلے مدرسہ امداد الاسلام صدر میرٹھ میں دینی تعلیم حاصل کی۔ پھر وکٹوریہ اسکول صدر میں داخل ہوا جہاں مولانا محمد تقی اور ماسٹر فراہیم خان سے ابتدائی درجات میں پڑھا۔ چھٹی اور ساتویں کلاس میں نیشنل جونیئر ہائی اسکول میں پڑھنے کے بعد فیض عام انٹر کالج میں داخل ہوا۔ وہاں جب دسویں کلاس میں پڑھ رہا تھا کہ جنوری 1962ء میں نانا مرحوم نے پاکستان ہجرت کی۔ میں انہیں کے ساتھ کراچی آیا۔ یہاں والدین کے ساتھ ساتھ چھوٹے بھائیوں سید عزیز احمد' سید اعجاز احمد اور سید گلزار احمد کے علاوہ دونوں بہنوں شاہجہاں اور عز الدکی قربتیں میسر آئیں۔

تقسیم ہند کے بعد نانا مرحوم کا کاروبار بتدریج کم سے کم تر ہوتا گیا چونکہ وہاں کے بیشتر مسلمان پاکستان آگئے تھے اور پھر نانا مرحوم کی سماجی مصروفیات بھی بہت بڑھ گئی تھیں۔ صدر کے علاقہ میں واقع بیشتر مساجد کا انتظام انہیں کے سپرد ہو گیا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ اپنے کاروبار پر توجہ بھی نہ دے پاتے تھے۔ آہستہ آہستہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ پیٹ بھرنا مشکل ہو گیا تھا۔ انہوں نے ان حالات میں میرٹھ چھوڑا۔ یہاں آ کر احساس ہوا کہ اس سے بھی گئے گزرے حالات میں رہنا ہوگا۔ نانا کی ضعیفی کا وقت تھا پیسے پاس نہ تھے لہٰذا سلسلہ تعلیم منقطع کر کے یہاں ایک سال اپنے ایک عزیز کی دکان پر سیلز مین رہا۔ پھر میریٹ روڈ پر ملازم ہوا۔ اس ملازمت میں وہ سب

ڈاکٹر یوسف جاوید

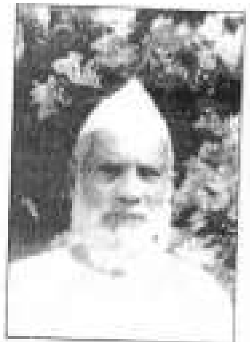

شیخ عمر الٰہی

احمد سعید

کچھ کیا جس کے بارے میں کبھی سوچا نہ تھا۔ جعلی افغانی پیٹیاں پیک کیس وغیرہ یوں وقت گزرتا رہا۔ اس دور میں میرے قریبی رشتے کے ماموں شیخ عمر الٰہی میرٹھ والے اور نانا مرحوم کی بہن کے داماد محمد شفیق صاحبان نے جن محبتوں کا مظاہرہ کیا وہ میرے ماضی کی یادوں کا روشن حصہ ہے۔

1964ء میں ڈاکٹر یوسف جاوید کے کلینک واقع کورنگی میں ملازم ہوا اور اللہ کا کرم ہے کہ تعلق ہنوز قائم ہے۔ ڈاکٹر جاوید سے بعد میں میری ہمشیرہ شاہجہاں منسوب ہوئیں۔ موصوف صاف اور کھرے شخص ہیں۔ اس طویل رفاقت میں ان کی جو محبتیں مجھے حاصل رہی ہیں وہ اب خال خال نظر آتی ہیں۔ اس دوران میرے کرم فرما محمد رفیق چوہان صاحب کا مسلسل اصرار رہا کہ میں تعلیمی سلسلہ شروع کروں۔ ان کی رہنمائی میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اور پھر انٹر۔ حالات تو سازگار نہ تھے مگر بلاشبہ اس میں میرے تساہل کا بھی دخل ہے کہ میں مزید امتحان نہ دے سکا۔

ڈاکٹر یوسف جاوید صاحب خوش فکر شاعر بھی ہیں اور سماجی کارکن بھی۔ اس لئے مجھے اپنے فطری ذوق یعنی سماجی و ادبی کاموں میں حصہ لینے میں آسانی رہی۔ کئی سماجی اور ادبی ادارے بنائے جن میں اتحاد سوشل کلب، بزم اتحاد ادب، انجمن اتحاد مقررین، انجمن اتحاد خواتین، بزم اتحاد اطفال اور اتحاد پبلک لائبریری شامل ہیں۔ تنظیم فکر چمن اور غنچہ کلب کی سرگرمیوں میں بھی فعال کردار ادا کیا۔ بزم شعر و سخن (کراچی شاخ) کے معتمد اور بزم ندرت کے ناظم نشر و اشاعت کی حیثیت سے بھی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ شعراء سے ملاقات اور مشاعروں میں پابندی سے شرکت روز و شب کا معمول رہا۔ مرزا محمد تقی شوق مرحوم کے مشورہ پر روزنامہ "نئی روشنی" سے تعلق قائم کیا۔ اس اخبار میں کئی سال اعزازی طور پر کام کیا۔ پھر دوسرے روزناموں میں بھی کام کرتا رہا مگر یہ تعلق مجھے راس نہ آیا۔

اسی دور میں حضرت مولانا انجم فوقی بدایونی کی قربتیں میسر آئیں۔ مولانا کی شخصیت کسی تعارف کی

انجم فوقی بدایونی

محتاج نہیں ہے۔ وہ قادر الکلام شاعر، صاحب طرز ادیب، باریک بین نقاد اور انتہائی شفیق و مخلص بزرگ تھے۔ میں مولانا سے اکثر تبادلہ خیال کرتا تھا۔ میں نے موصوف سے بہت کچھ سیکھا۔ میرے ادبی مذاق کو پختگی عطا کرنے میں مولانا کا فیض ہمیشہ شامل رہا ہے۔ آج میں اپنے استاد کو یاد کرتا ہوں تو سوچتا ہوں۔

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

میری پہلی کتاب "اذکار و افکار" 1985ء میں منظر عام پر آئی۔ اس دوران خیال اپنے آبائی وطن میرٹھ کی طرف گیا۔ میں نے ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب سے ذکر کیا۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ آپ یہ کام ضرور کیجئے۔ سو میں شعرائے میرٹھ پر کام میں مصروف ہو گیا۔ اس درمیان غیر مسلم شعراء کا نعتیہ انتخاب "نور سخن" کے نام سے 1409ھ میں شائع کیا۔ 1989ء میں ممتاز تاریخ گو جناب صابر براری کی شخصیت پر ایک کتاب مرتب کی۔ 1996ء میں میری دس سالہ کاوش "بہر زماں بہر زباں صلی اللہ علیہ وسلم" منظر عام پر آئی۔ اس کتاب میں عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے عصر حاضر تک کے 336 غیر مسلم شعراء کا نعتیہ کلام اور ان شعراء کے حالات زندگی قلم بند ہوئے ہیں۔ یہ عالمی تذکرہ ہے جس میں چودہ زبانوں کی نمائندگی ہے۔ "بہر زماں بہر زباں" کو عالمی سطح پر پسند کیا گیا۔ اس کتاب کی تقریب اجراء اس وقت کے گورنر سندھ محترم معین الدین حیدر کی دلچسپی اور قدر دانی کی وجہ سے گورنر ہاؤس کراچی میں ہوئی۔ گورنر موصوف کی توجہ مبذول کرانے میں معروف شاعر جناب ضیاء الحق قاسمی نے خاص دلچسپی لی۔ یہ اللہ رب العزت کا خاص کرم اور خاتم الانبیاء و رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آفاقی شخصیت کا اعجاز ہے۔

مجھے چند بزرگوں اور دوستوں کے شعری مجموعے مرتب کرنے کا اعزاز بھی حاصل ہے جن میں مہر و ماہ: انجم فوقی بدایونی، فراز خودی: افتخار بدایونی، چشم شوق: صابر براری، اشک فروزاں: بدر فاروقی، تاریخ رفتگاں: صابر براری کے علاوہ کئی دوسری کتب شامل ہیں۔

تقریباً چوبیس سال پہلے ادارہ فکر نو کراچی کی تشکیل کی۔ اس ادارے کے زیر اہتمام کئی یادگار مشاعرے مذاکرے اور سیمینار ہوئے۔ کئی کتب کی تقاریب رونمائی کا اہتمام ہوا۔ ادارہ فکر نو کے زیر اہتمام ایک درجن سے زائد کتب بھی شائع ہوئیں۔

1980ء فرزانہ بیگم میری شریک سفر بنیں۔ میرے خسر محترم احمد سعید ایثار و اخلاص کا پیکر تھے یہ انہیں کی تربیت کا نتیجہ ہے کہ اہلیہ میری علمی کوششوں میں ہمیشہ معاون و مددگار رہی ہیں۔

کتابیات

۱۔ابیات سندھی	ترجمہ: ڈاکٹر نجم الاسلام	انسٹی ٹیوٹ آف سندھیالوجی، جام شورو	سندھ یونیورسٹی پریس، حیدرآباد	۱۹۹۹ء
۲۔ابیات شاہ کریم	ترجمہ: ڈاکٹر نجم الاسلام	انسٹی ٹیوٹ آف سندھالوجی، جام شورو	سندھی ادبی بورڈ پرنٹنگ پریس، جام شورو	۱۹۸۷ء
۳۔ارباب سیف وقلم	بریگیڈیئر (ر) آئی۔ آر۔ صدیقی	نیشنل بک فاؤنڈیشن لاہور	کیپٹن پرنٹرز، لاہور	۱۹۹۷ء
۴۔اردو ادب میں تاریخی ناول	ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ	ابلاغ، لاہور	گنج شکر پرنٹرز، لاہور	۱۹۹۳ء
۵۔اردو ادب میں تاریخی ناول کا ارتقاء	ڈاکٹر نزہت سمیع الزماں	———	نامی پریس، لکھنؤ	۱۹۸۴ء
۶۔انسان کا دشمن	حسن منظر	توسین، لاہور	سلیم تنویر پرنٹرز، حیدرآباد	۱۹۹۱ء
۷۔انسائیکلوپیڈیا پاکستانیکا	سید قاسم محمود	شاہکار بک فاؤنڈیشن کراچی	رحمت سنز پرنٹرز، کراچی	۱۹۹۸ء
۸۔تاریخ اسلام کی چار سو باکمال خواتین	طالب ہاشمی	حسین اسلامک پبلشرز لاہور	———	۱۹۹۲ء
۹۔تاریخ دارالعلوم دیوبند، جلد دوم	سید محبوب رضوی	دارالعلوم دیوبند	جید پریس، دہلی	۱۹۷۸ء
۱۰۔تاریخ رفتگاں جلد دوم	صابر براری	ادارہ فکر نو، کراچی	نیو حجاز پریس، کراچی	۱۹۹۸ء
۱۱۔تحریک پاکستان اور علماء کرام	محمد صادق قصوری	زاویہ، لاہور	———	۱۹۹۹ء
۱۲۔حکیم فصیح الدین رنج میرٹھی	ڈاکٹر راحت ابرار	———	بھارت آفسٹ پریس، دہلی	۱۹۹۹ء
۱۳۔حیات بشیر	سید حبیب الرحمٰن شاہ	بصیر الدین میموریل سوسائٹی میرٹھ	جمال پرنٹنگ پریس، دہلی	۱۹۷۵ء

۱۴۔ خوں بہا	حکیم احمد شجاع	تاج کمپنی لمیٹڈ، لاہور	مرکنٹائل پریس، لاہور	۱۹۳۳ء
۱۵۔ دلی کی یادگار ہستیاں	مولانا امداد صابری	———	کامل صدیقی جمال پریس، دہلی	۱۹۷۲ء
۱۶۔ دو آہنگ	ڈاکٹر نجم الاسلام	ادارۂ اردو، حیدرآباد	بھائی پرنٹنگ پریس، حیدرآباد	۱۹۸۹ء
۱۷۔ رنج میرٹھی: حیات، شخصیت اور کارنامے	ڈاکٹر مقصود حسن	———	———	۱۹۸۸ء
۱۸۔ روایاتِ علی گڑھ	محمد ذاکر علی خاں	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کراچی	خواجہ پرنٹرز اینڈ پبلشرز، کراچی	۱۹۹۵ء
۱۹۔ زبیری انٹرنیشنل ڈائرکٹری	ظفر عمر زبیری، جمیل زبیری	زبیری پبلشرز، کراچی	خواجہ پرنٹرز، کراچی	۲۰۰۰ء
۲۰۔ سوال یہ ہے؟	شمیم احمد	چاورز ریڈرز، مستونگ	———	۱۹۸۹ء
۲۱۔ عظمتوں کے چراغ	ولی مظہر	مجلس کارکنان تحریک پاکستان، ملتان	تشکیل نو پرنٹرز، ملتان	۱۹۸۸ء
۲۲۔ غالب شناسی کے کرشمے	افتخار احمد عدنی	پاکستان رائٹرز کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی، لاہور	ایچ۔ وائی۔ پرنٹرز، لاہور	۱۹۹۵ء
۲۳۔ غالب کی فارسی غزلوں سے انتخاب ترجموں کے ساتھ	افتخار احمد عدنی، رالف رسل	پاکستان رائٹرز کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی، لاہور	ایچ۔ وائی۔ پرنٹرز، لاہور	۱۹۹۷ء
۲۴۔ قاموس القرآن	قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی	دار الاشاعت، کراچی	مشہور پریس، کراچی	۱۹۷۸ء
۲۵۔ کاروانِ تھانوی	حافظ محمد اکبر شاہ بخاری	ادارۃ المعارف، کراچی	احمد پرنٹنگ کارپوریشن کراچی	۱۹۹۷ء
۲۶۔ گئے دنوں کا سراغ	مظفر وارثی	خزینۂ علم و ادب، لاہور	زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور	۲۰۰۰ء
۲۷۔ مشاہیر بہاولپور	شہاب دہلوی	اردو اکیڈمی، بہاولپور	———	۱۹۸۷ء
۲۸۔ مشرق	سلیم احمد	اردو مرکز، لندن	فضلی سنز لمیٹڈ، کراچی	۱۹۸۹ء

۲۹۔ مکاتیبِ حبیب	مرتبہ ذکاء صدیقی	———	کاتب کمپیوٹرز، امراؤتی	۱۹۹۸ء
۳۰۔ میر اثر شناسی	کرشن چندر شرما	کرشنا دیوی شیتل پرشاد ایجوکیشن ٹرسٹ میرٹھ	پربھات پریس، میرٹھ	۱۹۷۳ء
۳۱۔ نئے خاکے	اختر حامد خاں	سٹی پریس بک شاپ کراچی	ایجوکیشنل پریس کراچی	۱۹۹۹ء
۳۲۔ ودربھ میں اردو شاعری	ڈاکٹر ایم۔ آئی۔ ساجد	———	سیماب اردو پریس، کھام گاؤں	۱۹۸۷ء
۳۳۔ ہمارے کپتان	خالد مسعود	جنگ پبلشرز، لاہور	جنگ پبلشرز پریس لاہور	۱۹۹۰ء
۳۴۔ یادِ رفتگاں حصۂ اول	سلطان رفیع	جمعیت پنجابی سوداگران دہلی کراچی	افریشیا پرنٹنگ پریس کراچی	۱۹۷۹ء
۳۵۔ یادِ رفتگاں	صابر براری	ادارۂ فکرِ نو، کراچی	ایجوکیشنل پریس، کراچی	۱۹۸۶ء

رسائل و جرائد

۱۔ ابلاغ، کراچی: جلد ۲۳، شمارہ ۷

۲۔ العلم، کراچی: اپریل تا جون ۱۹۶۸ء

۳۔ ایشیا، میرٹھ: دسمبر ۱۹۳۷ء

۴۔ چراغِ راہ، کراچی: فروری ۱۹۶۷ء

۵۔ خلیل الہدیٰ، امراؤتی: مارچ ۱۹۷۹ء

۶۔ صحیفۂ عثمانیہ، کھام گاؤں: ستمبر، اکتوبر ۱۹۳۰ء

۷۔ صدائے انچولی، کراچی: ۱۹۷۵ء

۸۔ صدائے انچولی، کراچی: ۱۹۸۷ء

۹۔ صدائے انچولی، کراچی: ۱۹۸۸ء

۱۰۔ صدائے انچولی، کراچی: دسمبر ۲۰۰۱ء

۱۱۔ فن اور شخصیت، کوائف نمبر

اذکار و افکار

''چند آراء سے اقتباسات''

میں اسے دور جدید کے تمام ان تذکروں میں شمار کرتا ہوں جو کتاب بہت سلیقے سے شائع کی گئی ہے۔ نور احمد میرٹھی نے شعراء کے کلام پیش کر کے اس تذکرے کی قدر و قیمت میں اضافہ کیا۔

ڈاکٹر جمیل جالبی

جناب نور احمد میرٹھی ایک صاحب ذوق ادیب اور صاحب قلم کی حیثیت سے بزم ادب و مومنین میں شریک ہوتے ہیں۔ مؤلف کا قلم شگفتہ اور بے ساختہ زبان اور اسلوب بیان دلکش اور دل آویز ہے۔ موصوف کا تبصرہ خود ایک لطف شیریں اور حسن بیان کا ایک نمونہ ہے۔

مولانا ناظم ندوی

جناب نور احمد میرٹھی کی یہ کوشش ہر اعتبار سے قابل تحسین ہے۔ ندرت آمیز اور جدت آموز۔

رئیس امروہوی

اس تذکرے میں کئی خصوصیات یکجا ہو گئی ہیں۔ مرتب نے اس کو شعراء کا ایک خوبصورت البم بنا دیا ہے جس میں شعراء کی فوٹو کیمرہ تصویریں بھی ملیں گی اور قلمی چہرے بھی۔ تذکرہ تنقید سے ہم آہنگ بھی نظر آئے گا اور اس کے ذریعے تاریخ ادب سے بھی مل جائیں گے۔

ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی (بھارت)

یہ ایک منفرد کتاب ہے اور تذکروں میں یہ ایک نئے باب کا اضافہ ہے اور ایک دستاویزی مرقع ہے کہ معاصر شعراء کا حال اس میں ملتا ہے جو تاریخ ادب میں ایک اہم ماخذ قرار پائے گا۔

سید قدرت نقوی

''اذکار و افکار'' ایک ضخیم تحقیقی، تحسین اور ایسی تاریخی کتاب ہے جو بلاشبہ مجمع البحرین نظر آتی ہے۔ اسے اگر ایک اچھی تالیف کہا جا سکتا ہے تو اس میں تصنیفی موثر حصہ بھی تالیف کے دوش بدوش موجود ہے۔

سید رفیق عزیزی

جناب نور احمد میرٹھی نے کتاب ہذا میں مختلف جدتوں کے ساتھ ساتھ کلام کا جو انتخاب دیا ہے وہ ان کے اعلیٰ ذوق شاعری کا آئینہ دار ہے۔

ڈاکٹر وقار راشدی

ہم ہندوستانی اہل اردو نور احمد میرٹھی کی اس خوبصورت اور بامقصد پیشکش کا استقبال کرتے ہیں اور ان سے امید کرتے ہیں کہ [illegible] کے سلسلے کے مزید چراغ روشن کریں گے۔

ندیم صدیقی (بھارت)

نور سخن

''چند آراء سے مختصر اقتباسات''

نور سخن ایک منفرد مجموعہ ہے۔ آپ نے یہ کام بڑی تندہی محنت اور توجہ سے کیا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی

نور احمد میرٹھی کی نگاہ جستجو اور طبیب خیال نے بحر نعلمات میں غواصی کا فریضہ ادا کیا ان موتیوں کو جب آپ سے باہر نکالا اور کبھی آپ و تاب کے ساتھ اس طرح منظر عام پر لے آئے کہ عاشقان رسول ﷺ کے دیدہ و دل منور ہو گئے۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری

نور سخن ثواب کا کام ہے اور مغفرت کا توشہ ہے۔

مالک رام

نور سخن ایک پاکیزہ ادبی دستاویز ہونے کے علاوہ دو قوموں کو ایک دوسرے سے نزدیک تر ہونے کی ایک مستحسن اور مبارک کوشش ہے۔

پروفیسر منظور حسین شور

نور احمد میرٹھی کا اردو سے ایک خاص تعلق اور نعت رسول ﷺ سے محبت اور شعر فہمی کا نور سخن ایک بے مثال نمونہ ہے۔

مولانا سید عبداللہ بخاری (شاہی امام جامع مسجد دہلی)

یہ قوت سے کہتا ہوں کہ غیر مسلموں کی نعتوں کا ایسا معیاری ذخیرہ میں نے پہلے نہیں دیکھا۔

مولانا ولی رازی

نور سخن معنا اور صورتاً ہر لحاظ سے پاکیزہ اور خوبصورت ہے۔

ڈاکٹر محمد سعد اللہ

نور سخن نور احمد میرٹھی محض ایک ذاتی تسکین کا وسیلہ نہیں ایک ملی خدمت بھی کہی جائے گی۔

ڈاکٹر معین الدین عقیل

نور سخن نور احمد میرٹھی کی تالیف ہی نہیں تحقیق ہے بلکہ تاریخ ادب میں آئندہ اس موضوع پر ہونے والے کسی بھی کام میں اس کے حوالے مستند اور معتبر ہوں گے۔

کرشن بہاری نور لکھنوی

محنت اور لگن سے قطع نظر نعتیہ کلام کے انتخاب میں بھی جس ذوق کا ثبوت دیا گیا ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ صرف ایسا کلام منتخب کیا جائے جس میں جذبے کی صداقت اور فنی خوبی کا کوئی پہلو ضرور موجود ہو۔

حکیم محمد سعید

”نورِ سخن“ کا ظاہر بھی روشن ہے اور باطن بھی روشن۔ یہ کتاب بڑے حسن کے ساتھ شائع کی گئی ہے۔

ڈاکٹر ابوالخیر کشفی

منافقت اور منافرت کی موجودہ فضا میں ”نورِ سخن“ جیسی کتاب توحیدِ الٰہی اور انوارِ محمدی سے دلوں کو منور کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوگی۔

ڈاکٹر وفا راشدی

نور احمد میرٹھی کی یہ سعیِ بلیغ تو اس قدر واضح اور روشن ہے کہ اس سلسلے میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ میرا ایمان ہے کہ نور میرٹھی بندوں کی طرف سے داد و ستائش کے حقدار تو ہیں ہی اللہ کریم کے کرم کے بھی مستحق ٹھہریں گے۔

ڈاکٹر حنیف اسعدی

نور احمد میرٹھی نے نورِ سخن مرتب کرکے اہلِ دل پر ایک احسان کیا ہے۔

اختر احمد عدنی

نورِ سخن نور احمد میرٹھی کی خوش ذوقی ہے۔ [illegible] ستائش [illegible] بہت فخر [illegible] رہا ہے۔

شان الحق حقی

نور احمد میرٹھی نے یقیناً بڑا کام کیا ہے۔ یہ کتاب سیرت لٹریچر میں ایک گرانقدر اضافہ ہے۔

مولانا عبدالعزیز عرفی

نور احمد میرٹھی قابلِ ستائش ہیں کہ انہوں نے نہایت محنت و مشقت لگن اور حوصلے کے ساتھ غیر مسلم شعراء کی نعتیں کھوج نکالیں اور نہایت حسن و خوبی اور دیدہ ریزی کے ساتھ مرتب کرکے پیش کیا۔

ڈاکٹر محمود الرحمٰن

نور احمد میرٹھی کا دم غنیمت ہے کہ ان سے سلسلہ ”اہلِ جنوں“ باقی ہے۔

خالد علیگ

نور احمد میرٹھی کی یہ کاوش اردو زبان و ادب کیلئے باعثِ افتخار ہے۔ یہ نعتیہ اردو ادب کی تاریخ میں ایک سنگِ میل کی حیثیت کی حامل رہے گی۔

ہیرا نند سوز

بہر زماں بہر زباں
(مختصر آراء سے اقتباسات)

عزیز محترم گرامی قدر نور احمد میرٹھی سلّمہ اللہ نے بعنوان ”بہر زماں بہر زباں“ مجموعہ نعت بزبانِ عقیدت غیر مسلم شعراء کو مرتب فرما کر ایک منفرد کام کیا ہے۔ اہلِ ایمان و عرفان کے لئے ایک تحفۂ بے بہا مہیا کر دیا کہ پڑھتے رہیں اور کیف و سرور میں بے خود رہیں۔ وہ کام جو مختلف حضرات مل کر کرتے وہ انہوں نے کر دکھایا۔

مولانا شاہ احمد نورانی

ہمارے دوست اور بھائی جناب نور احمد میرٹھی شعر و ادب کے میدان میں سنگلاخ راستے منتخب کرنے کا امتیاز رکھتے ہیں اس ہمت مردانہ کے لئے میرے علم میں ان سے موزوں تر شخصیت کوئی اور نہ تھی چنانچہ وہ سالہا سال مردانہ وار اور والہانہ انداز میں اس دھن میں لگے رہے اور اپنی عرق ریزی کا ثمرہ انہوں نے ”بہر زماں بہر زباں“ کے معنی خیز نام سے ہماری اور آپ کی تواضعِ خاطر کے لئے پیش کر دیا ہے۔ نعت کے اس نرالے مجموعے کو پڑھ کر اس سے بہرہ اندوز ہونے والے تو بہت ہونگے لیکن یہ احساس بہت کم لوگوں کو ہوگا کہ اس خوانِ نعت کے سجانے میں میزبان نے محنت و مشقت کے کتنے پہاڑ عبور کئے ہیں۔

مولانا مفتی محمد تقی عثمانی

اس محنت و مشقت سے جہاں نور احمد میرٹھی نے علم و ادب کی خدمت کی وہاں انہوں نے غیر مسلم شعراء کے نعتیہ کلام کو منضبط کر کے انہیں شہرت سے ہمکنار کیا لیکن میری سوچ اور سمجھ کے مطابق نور احمد میرٹھی صاحب نے ملتِ مسلمہ کی طرف سے ایک قرض اتارا اور ان غیر مسلم شعراء کو خراجِ عقیدت اس لئے پیش کیا کہ انہوں نے ہمارے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں ہادیِ انسانیت، معلمِ اخلاق صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت میں مدح سرائی کی۔ افرادِ ملت کا اخلاقی فرض تھا کہ وہ اس اظہارِ محبت و عقیدت پر ہدیۂ تشکر پیش کریں۔

مولانا مفتی اطہر نعیمی

”بہر زماں بہر زباں“ اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک منفرد اور اہم کتاب ہے۔ غیر مسلموں کی نعتیہ شاعری کے حوالے سے یہ ایک جامع، مستند اور تاریخی اہمیت کا حامل تذکرہ ہے، جس کی اہمیت و افادیت وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتی جائے گی۔

زیڈ۔ اے۔ نظامی

یہ کتاب فی الحقیقت ایک غیر معمولی پیش کش ہے جس سے نور احمد میرٹھی کا ذوقِ جمال اور حسنِ ترتیب و

تو دین بھی نمایاں ہے۔ نور احمد میرٹھی نے اتنے بہت سے غیر مسلم شعراء کا نعتیہ کلام اس قدر عمدہ طور پر جمع کیا ہے کہ مسلم شعراء بھی رشک کریں تو بجا ہے۔

ڈاکٹر نجم الاسلام

نور احمد میرٹھی نے ریاضتِ فن سے عجزِ فن کا طویل سفر جس عمیق مطالعہ، احتیاط اور خونِ جگر کی آمیزش سے طے کیا ہے اس کے نتیجے میں موصوف ربع صدی سے ایک معتبر شخصیت کی حیثیت سے فضائے شعر و ادب اور تالیف و تذکرے کی راہ گزر پر نمایاں ہو چکے ہیں۔ نور صاحب نے حواشی و اشارات کے ساتھ جو گرانقدر مقدمہ بھی تحریر کیا ہے جو بے حد اثر انگیز ہے۔ وہ ادبی، تحقیقی، تنقیدی احوال و افکار سے مکمل شعور و آگہی بھی رکھتے ہیں۔ نور احمد میرٹھی کے نثری اسلوب کی بنیادی صفت توازن، استدلال اور وضاحت کے عناصر ثلاثہ سے عبارت ہے۔ انہی خوبیوں کے سبب وہ اپنے فکر و نظر، تحقیقی ذوق اور سلیس و شگفتہ اسلوب کی بدولت عہدِ رواں کے تذکرہ نگاروں اور مولفوں کی کہکشاں میں دور سے پہچانے جاتے ہیں۔

پروفیسر ڈاکٹر خالد حسین خان، میرٹھ

نعت گو شعراء کے بارے میں معلومات و کوائف کے سلسلہ میں بھی نور احمد میرٹھی صاحب نے نعت پر مستند کتابوں سے حوالے فراہم کر کے کتاب کی تحقیقی اساس مستحکم کر دی ہے۔ توقع ہے کہ اس موضوع پر مزید کام کرنے والے ناقدین اور محققین اس کتاب سے صرفِ نظر نہ کر سکیں گے کہ یہ خود اس فن میں ایک مستند حوالے کی صورت اختیار کرے گی۔

ڈاکٹر سلیم اختر، لاہور

''بہر زماں بہر زباں'' نے ایک اور ہی دنیا دکھائی ہے، ایک ایسی دنیا جو مثالی ہے جذبہ و احساس کے لحاظ سے بھی، جو اس میں متن کے ہر صفحہ پر عیاں ہے اور دوسری اس متن و مطالب کی جمع آوری کے لحاظ سے بھی جو اس کا ایک وصفِ خاص نظر آتی ہے۔ نعتیہ مجموعے تو سینکڑوں مرتب ہوئے ہیں، خود اس کے مرتب نے بھی کئی اور کام کئے ہیں لیکن کام تو ایک ہی ہوتا ہے۔ حاصلِ عمر یوں لگتا ہے کہ یہ کام کیا نہیں گیا۔ ہو گیا ہے۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست

تحقیق کے معاملات میں بعض اوقات ''القا'' بھی ہوتا ہے۔ یہاں اس تذکرے / مجموعے میں، مواد کی فراہمی میں، ماخذ کی دستیابی اور ترتیب کے حسن و سلیقہ میں کچھ ''غیبی'' معاونت کا سا احساس ہوتا ہے ورنہ ایسے پر شکوہ اور مرعوب کن کام محض انسان کے بس کے نہیں لگتے۔ خدا کرے کہ مرتب کی ایسی کاوشوں کا یہ بھی بس آغاز ہی ہو۔ یہی آغاز تو حمد و توحید کی بنیاد ہے اور اب تو حمد ہی رہ جاتی ہے۔

ڈاکٹر معین الدین عقیل، کراچی

نور احمد میرٹھی کی یہ سعی اس قدر جامع، بھرپور اور قابلِ قدر ہے کہ اس موضوع پر مزید کام کرنے والوں کو ہم

اٹھانے سے پہلے بہت کچھ سوچنا پڑے گا اور اس میدان میں قدم رکھنے سے پہلے دیکھنا ہوگا کہ اس نواح میں سوا در ہنہ پا بھی ہے۔

پروفیسر محمد اقبال جاوید، گوجرانوالہ

باری تعالیٰ نے ''نورِ سخن'' کے مرتب کرنے پر نور احمد صاحب کو ''بہر زماں بہر زباں'' کے انعام و اکرام سے نوازا ہے۔ غالباً اس جیسی اشاعت کے سلسلے میں ''عشقِ رسول'' نے رہنمائی فرمائی اور یہیں سے ہمت و حوصلہ عطا ہوا ورنہ اتنا اہم کام مرتب ہو جانے کب تک نظروں سے اوجھل رہتا۔ نئی اور اہم یہ کوشش اپنی جگہ خود ہی ایک بڑا اعزاز ہے جس کی مقبولیت کے لئے تو پہلے ہی ''نور افشاں ذکر'' فرما دیا گیا ہے۔ اس لئے محترم نور احمد میرٹھی اپنے اس کارنامے پر جتنا ناز کریں وہ کم ہے۔

ڈاکٹر علی خان، کراچی

نور احمد میرٹھی نے پاکستان میں یہ کتاب مرتب کر کے نہ صرف اسلام کی وسعتوں کی نشاندہی کی ہے بلکہ غیر مسلموں پر اعتماد کا چراغ بھی روشن کیا ہے۔ ''بہر زماں بہر زباں'' کئی اعتبار سے اہم کتاب ہے۔ اس کی تحقیقی تاریخی اور ادبی اہمیت پر گفتگو ہوتی رہے گی اور اس کی معاشرتی افادیت کے گوشے بھی نمایاں ہوتے جائیں گے۔

کتاب میں شامل نور احمد میرٹھی کا مقالہ نہایت اہم اور معلومات آفریں ہے۔

حمایت علی شاعر، کراچی

نور احمد میرٹھی کی حالیہ تحقیقی و تنقیدی تالیف ''بہر زماں بہر زباں'' ایک ایسا کارنامہ ہے جس کی کوئی دوسری مثال نظر نہیں آتی۔ انہوں نے تلاش و جستجو کے جس جذبے سے کام لیا ہے اس کا اعتراف نہ کرنا کھلی ہوئی ناانصافی کے مترادف ہوگا۔ نور احمد میرٹھی نے سخن فہمی کی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے غیر مسلم شعراء کے نعتیہ کلام سے ایسے اشعار پیش کئے ہیں جن کا اسلوب واضح طور پر گواہی دیتا نظر آتا ہے کہ یہ دل کی آواز ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ نور احمد میرٹھی کا یہ کارنامہ علمی و ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا اور مذہب کے نام پر فساد برپا کرنے والوں اور تعصب و تنگ نظری کی فضا ابھارنے والوں کو راہِ مستقیم دکھانے میں ممد و معاون ثابت ہوگا۔

احمد ہمدانی، کراچی

بحیثیت مجموعی جب جناب نور احمد میرٹھی کی تالیف کا جائزہ لیا جائے اور ان کا ان مقالوں سے مقابلہ کیا جائے جو آج کل پاک و ہند کی یونیورسٹیوں میں پی ایچ ڈی کے طلباء پیش کر رہے ہیں، جس کے بارے میں مشہور ہے کہ شعبہ اردو اپنی لاج رکھنے میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری تو عطا کر رہی ہے لیکن مقالہ کی اشاعت پر پابندی لگا دی جاتی ہے۔ کاش کچھ یونیورسٹیاں ایسی بھی ہوتیں جو اعلیٰ تحقیقی کتابوں کی اشاعت پر اعترافِ خدمت کے طور پر از خود ڈاکٹریٹ عطا کرتیں۔ اگر ایسا ہوتا تو جناب نور احمد میرٹھی کی کتاب بھی اس کی مستحق ٹھہرتی۔

شاہ مصباح الدین شکیل، کراچی

ضمیمہ

ترتیب

۱۔ ڈاکٹر اعجاز فاطمہ ۳۰۵
۲۔ مبارک شاہ زبیری ۳۰۸
۳۔ پروفیسر ڈاکٹر وقار الدین احمد ۳۱۲
۴۔ خان بہادر محمد یاسین خاں ۳۱۶
۵۔ اسد احمد ۳۱۷
۶۔ ایڈمرل یو۔اے۔سعید ۳۱۹
۷۔ حشمت اللہ خاں رحمۃ اللہ علیہ ۳۲۱
۸۔ پرتھوی سنگھ بے دھڑک ۳۲۲
۹۔ حشمت اللہ خاں ۳۲۳
۱۰۔ کیپٹن خالد احمد ۳۲۵
۱۱۔ فصیح الدین احمد ۳۲۷
۱۲۔ عقیل احمد صدیقی ۳۳۰
۱۳۔ ڈاکٹر رگھو ویر شرن مترا ۳۳۲
۱۴۔ قاضی عقیل احمد ۳۳۳
۱۵۔ پنڈت گوری دت شرما ۳۳۳
۱۶۔ ہری شرن شری واستو مرال ۳۳۵
۱۷۔ ڈاکٹر نزہت اکرام ۳۳۶

ڈاکٹر اعجاز فاطمہ

ڈاکٹر اعجاز فاطمہ

بعض افراد اپنے بزرگوں کے حوالے سے پہچانے جاتے ہیں اور خود کچھ نہیں ہوتے اور بعض شخصیات کی وجہ سے ان کے بزرگ پہچانے جاتے ہیں مگر کچھ لوگ ایسے بھی خوش نصیب ہوتے ہیں، جن کے بزرگ قابلِ فخر اور وہ خود قابلِ قدر ہوتے ہیں۔ ایسے ہی افراد میں ڈاکٹر اعجاز فاطمہ کا شمار ہوتا ہے۔ برصغیر کے ممتاز ماہرِ تعلیم اور ریاضی داں، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پہلے وائس چانسلر اور ریکٹر اور سرسید احمد خاں کے خاص پیروکار ڈاکٹر سرضیاء الدین احمد محترمہ کے والد ہیں اور خود موصوف نے طبی شعبہ میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں وہ آج ضیاء الدین ہسپتال اور ضیاء الدین میڈیکل یونیورسٹی کی شکل میں ہمارے سامنے ہیں۔ ڈاکٹر اعجاز فاطمہ اس لیے اور قابلِ احترام ہیں کہ صنفِ نازک سے تعلق رکھنے کے باوجود انہوں نے جرأت، عمل اور کامیاب منصوبہ بندی سے وہ مقام حاصل کر لیا ہے جس کی لوگ تمنا کرتے ہیں۔

ڈاکٹر اعجاز فاطمہ ۳۱ر دسمبر ۱۹۲۷ء کو دہلی میں پیدا ہوئیں۔ ارشاد فاطمہ اور شمیم فاطمہ ان کی بہنیں اور ذکاء الدین عرف نواب میاں ان کے بھائی ہیں۔ اعجاز فاطمہ صاحبہ نے ابتدائی درجات سے آگے بڑھتے ہوئے ہارڈنگ کالج دہلی اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تعلیمی سلسلہ جاری رکھتے ہوئے ۱۹۴۷ء میں پاکستان آگئیں۔ یہاں کراچی کے ڈاؤ میڈیکل کالج سے ۱۹۵۱ء میں ایم۔بی۔بی۔ایس کیا۔ ایک سال کراچی کے سول ہسپتال اور پھر چھ سال کراچی کے مشہور جناح ہسپتال میں پروفیسر عبدالصمد چودہری کی نگرانی میں کام کیا۔

۱۹۵۳ء میں ڈاکٹر تجمل حسین صاحب سے شادی ہوئی جن کی رفاقت میں کچھ یادگار کام کرنے کے لیے سوچتی رہیں اور پھر ۱۹۶۰ء میں ناظم آباد کراچی میں گول مارکیٹ کے قریب ضیاء الدین ہسپتال قائم کیا۔ یہ ہسپتال آہستہ آہستہ مقبول ہو کر بڑھتا رہا اور اب پچاس بستروں پر مشتمل ہے۔ پندرہ سال بعد یعنی ۲۳ دسمبر ۱۹۷۵ء کو ڈاکٹر سرضیاء الدین احمد مرحوم کی برسی کے موقع پر نارتھ ناظم آباد میں ڈاکٹر ضیاء الدین ہسپتال کا افتتاح شہیدِ ملت خان لیاقت علی خان کی اہلیہ محترمہ بیگم رعنا لیاقت کے دستِ مبارک سے ہوا۔ آج یہ ہسپتال

ڈاکٹر تجمل حسین، ڈاکٹر اعجاز فاطمہ

ملک کے بڑے پرائیوٹ ہسپتالوں میں بہت نمایاں ہے۔ ایک وسیع قطعہ زمین پر واقع چار منزلہ خوبصورت عمارت میں قائم ڈھائی سو بستروں پر مشتمل یہ ہسپتال ایک بڑی آبادی کی اُمیدوں کا مرکز ہے۔ اس میں فوری

ڈاکٹر ضیاء الدین ہسپتال کراچی

طبی امداد کا معقول انتظام ہے۔ مختلف امراض کے ماہرین اس ادارہ سے وابستہ ہیں۔ ضیاء الدین ہسپتال کے قیام کے بیس سال بعد یعنی ۱۹۹۵ء میں ضیاء الدین میڈیکل یونیورسٹی کے قیام کا سہرا بھی ڈاکٹر اعجاز فاطمہ صاحبہ کے سر جاتا ہے۔ یہ یونیورسٹی بتدریج مستحکم ہو رہی ہے۔ اس جامعہ کے تین کانوکیشن ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر صاحبہ کے بڑے صاحبزادے ڈاکٹر عاصم حسین اس یونیورسٹی کے چانسلر ہیں۔

شخصی خصوصیات کے حوالے سے یہ بتانا مناسب ہے کہ ڈاکٹر اعجاز فاطمہ بہت سادہ ہیں۔ مطالعہ وسیع ہے۔ تاریخ سے بھی دلچسپی رکھتی ہیں۔ آہستگی کے ساتھ مدلل گفتگو کرتی ہیں۔ ان کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ مد مقابل کی بات توجہ سے سنتی ہیں، جذباتی نہیں ہوتیں، حقیقت پسند ہونے کی بناء پر سچائی پر یقین رکھتی ہیں۔ انہوں نے مختلف قوموں کے تہذیب وتمدن کا قریبی مشاہدہ کیا ہے۔ امریکہ کے علاوہ یورپ اور فار ایسٹ کے ممالک کی سیاحت کی ہے۔ امریکہ میں مقیم ممتاز شخصیت مبارک شاہ زبیری کے والد ذکی الدین احمد کی حقیقی ماموں زاد بہن ہیں۔ محترم مبارک شاہ زبیری بتاتے ہیں کہ "ڈاکٹر اعجاز فاطمہ ہر ایک سے بلا امتیاز اخلاق سے ملتی ہیں اور ملنے والا ان کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ ان کے شوہر ڈاکٹر تجمل حسین بھی اعلیٰ انسانی اوصاف کی حامل پُرکشش شخصیت ہیں۔ ان دونوں نے خاندانی روایات کے مطابق بچوں کو اعلیٰ تعلیم سے آراستہ کیا ہے۔ اس گھرانے کے افراد کا حسنِ سلوک بھی مثالی ہے۔ بلاشبہ یہ فیملی اپنے اسلاف کی چھوڑی ہوئی اقدار کی امین ہے۔" ڈاکٹر اعجاز فاطمہ کی اولاد میں ڈاکٹر عاصم حسین کے علاوہ ڈاکٹر رو بینہ، سیمہ اور ڈاکٹر عارف حسین ہیں۔ سیمہ دبئی میں لیکچرر ہیں۔

۱۹۴۷ء میں ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد کے انتقال کے بعد کراچی میں ضیاء الدین میموریل سوسائٹی قائم ہوئی۔ اس کے سرپرستوں اور بانی ارکان میں محترم پیر پگارا، پروفیسر عبدالمجید قریشی، ایم اے باری، رزاق داد، ایڈمرل یو۔ اے۔ سعید، ڈاکٹر محمد یاسین زبیری، مبارک شاہ زبیری، حسین امام، فرید الدین احمد، رؤف زبیری، ولی الدین احمد، احمد ای ایچ جعفر اور ذکی الدین زبیری صاحبان شامل ہیں۔ اس وقت ممتاز سائنسدان پروفیسر ڈاکٹر وقار الدین احمد صدر اور جلیس اشرف زبیری سیکریٹری کے فرائض سنبھالے ہوئے ہیں۔ سوسائٹی کی بیرونِ ملک سرگرمیوں کی ذمہ داری مبارک شاہ زبیری صاحب کے سپرد ہے۔ اس سوسائٹی کی کوششوں سے کراچی کی ایک خوبصورت اور معروف شاہراہ ڈاکٹر ضیاء الدین کے نام نامی سے منسوب ہوئی۔

ڈاکٹر اعجاز فاطمہ اپنے قائم کردہ اداروں کی نگراں بھی ہیں اور پابندی سے مریض بھی دیکھتی ہیں۔

مبارک شاہ زبیری

مبارک شاہ زبیری

مبارک شاہ زبیری ہمہ صفت شخصیت کے حامل ہیں۔ انہوں نے پاکستان اور پھر امریکہ میں زبیری فیملی کے لیے ہی نہیں بلکہ پاکستان اور انسانیت کی خدمت کے لیے شب و روز محنت کی ہے۔ انہوں نے امریکہ میں عالمی مسائل پر پاکستان کے موقف کی وضاحت اور ملک کے استحکام و ترقی میں درپیش مسائل کے لیے رائے عامہ ہموار کرنے میں متعدد بھرپور کوششیں کی ہیں جو بارآور بھی ہوئی ہیں۔ ایک متحرک انسان دوست کی حیثیت سے ان کو پہچانا جاتا ہے۔

مبارک شاہ زبیری ۱۷ اکتوبر ۱۹۳۶ء کو جھانسی میں پیدا ہوئے، جہاں ان کے والد محی الدین احمد بن ڈاکٹر جمال الدین احمد معاشی امور کے سلسلے میں مقیم تھے۔ زبیری فیملی کی کئی نامور شخصیات قریبی عزیزوں میں ہیں۔ جن میں نواب وقار الملک، مولوی محمد بشیر الدین، ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد اور نواب سر محمد یامین خاں بھی شامل ہیں۔

مبارک شاہ زبیری صاحب نے اپنی تعلیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں مکمل کی اور تقسیم ہند کے بعد پاکستان ہجرت کی۔ تعلقاتِ عامہ میں ماہر کی حیثیت سے رکھتے ہیں۔ پروفیسر ظفر عمر زبیری نے لکھا ہے کہ ''آپ جہاں بھی رہے، تعلقات عامہ کے ذریعے اپنی پہچان کرانے میں کامیاب رہے۔'' انسانیت سے محبت اور انسانی مسائل کے حل کے لیے آپ کی تڑپ دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف ایک ایسے شخص ہیں جو مجسم درد اور خدمت ہے۔ پاکستان میں پیشہ ور لوگ ہی خون کے عطیات دیتے تھے۔ آپ نے صحت مند لوگوں کو اس ایثار کی طرف متوجہ کیا اور خون فروخت کرنے والوں کی ہمت شکنی کی۔ خود بھی سترہ بار خون کا عطیہ دے چکے ہیں۔ ان خدمات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ریڈ کراس نے بلڈ ڈونیشن کمیٹی کا پہلا اعزازی چیئرمین مقرر کیا۔ اس تقرر کے بعد آپ نے ''خون دو، زندگی بچاؤ'' کے عنوان پر ایک بین الاقوامی سیمینار کا اہتمام کیا۔ ان کوششوں سے رضا کارانہ طور پر خون کی فراہمی کی مہم مقبول اور کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ برٹش ریڈ کراس کی

طرف سے آپ کے جذبہ اور خدمت کے اعتراف میں گولڈن پن اعزازاً پیش کی گئی۔ برٹش ریڈ کراس کی سربراہ ملکہ الزبتھ ہیں۔ لیگ آف ریڈ کراس / کریسنٹ، صدر پاکستان اور گورنر سندھ نے بھی ان خدمات کا اعتراف کیا اور متعدد اعزازات پیش کیے گئے۔

مبارک شاہ زبیری اس کمیٹی کے سینئر رکن تھے جس نے امام مسجد نبوی عبدالعزیز بن صالح اور امام خانہ کعبہ محترم عبداللہ ابن سبیل صاحبان کے استقبال کے لیے حکومتِ پاکستان نے تشکیل دی تھی۔ اس کمیٹی کے چیئرمین ایس ایچ ہاشمی تھے۔ امام صاحبان نے کراچی میں بھی نماز جمعہ کے عظیم اجتماعات کی امامت فرمائی تھی۔ یہ نمازیں ٹیلی ویژن پر بھی براہ راست ٹیلی کاسٹ ہوئیں۔ مبارک شاہ صاحب زبیری ایسوسی ایشن کے بانیوں میں بھی ہیں۔ اور ڈاکٹر سر ضیاء الدین میموریل سوسائٹی کے بانی ارکان میں بھی شامل ہیں۔ ان اداروں کے فروغ کے لیے جوش وخروش کے ساتھ مصروف رہتے ہیں۔

اسی کی دہائی میں مبارک شاہ زبیری امریکہ چلے گئے اور انہوں نیویارک اسٹیٹ میں قیام کا فیصلہ کیا۔ اپنی رہائش کے فوری بعد وہیں آپ نے پاکستان امریکن فرٹرنل سوسائٹی کی بنیاد رکھی اور بانی صدر کی حیثیت سے جدوجہد کا آغاز کیا۔ اس سوسائٹی نے آپ کی قیادت میں حیرت انگیز کامیابیاں حاصل کیں اور پاکستانی و امریکی سیاستدانوں کی توجہ حاصل کی اور دونوں ملکوں کے نیویارک اسٹیٹ میں مقیم افراد میں باہمی اعتماد و یکجہتی کی فضا قائم ہوئی۔ سوسائٹی کے زیر اہتمام ۱۹۸۳ء میں پاکستان امریکن ڈے ریاستی گورنر کی سربراہی میں منایا گیا۔ اب ہر سال یہ روایت دہرائی جاتی ہے۔ ان مواقع پر امریکی زعماء کو خطاب کے لیے مدعو کیا جاتا ہے۔ تقریبات کی عالمی سطح پر تشہیر ہوتی ہے۔ آپ نے ہی امریکن پبلک لائبریریز میں پہلی مرتبہ سیرت طیبہ سے متعلق اجتماعات کا انعقاد کیا جن میں مختلف شہروں سے مسلمانوں کے علاوہ مقامی افراد کثرت سے شریک ہوتے ہیں۔ ان اجتماعات کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ گورنر، سینیٹرز اور ارکان کانگریس اس موقع پر خصوصی پیغامات ارسال کرتے ہیں اور نشریاتی ادارے کوریج کے لیے رابطے کرتے ہیں۔ دوسرے اسلامی ایام کے مواقع پر بھی باقاعدگی سے تقریبات منعقد کراتے ہیں۔ آپ کی ایک قابلِ ذکر کارکردگی اور بھی ہے اور وہ یہ کہ آپ کی کوششوں سے سات امریکی مشرف بہ اسلام ہوئے ہیں۔

مبارک شاہ زبیری صاحب کو امریکہ میں غیر سرکاری گشتی سفیر کہا جا سکتا ہے۔ آپ امریکی سیاسی رہنماؤں کی توجہ پاکستان کے جوہری توانائی اور مسئلہ کشمیر پر دلاتے رہتے ہیں۔ آپ کے افکار و خیالات باقاعدگی کے ساتھ امریکی نشریاتی اداروں اور اخبارات کے ذریعے عوام الناس تک پہنچتے ہیں۔ ان پروگراموں میں ناظرین آپ سے براہ راست سوالات کرتے ہیں اور آپ اپنے دلائل سے انہیں مطمئن کرتے ہیں۔ آپ امریکہ میں اسلام اور پاکستان سے متعلق کتب کی اشاعت، غیر ملکی افراد کو پاکستان کی سیاحت کی ترغیب، تجارتی امور میں معاونت، قومی فضائی کمپنی کے ذریعے سفر کا فروغ اور نشر و اشاعت کے ذرائع میں پاکستانی مفادات کا تحفظ اور مطالعاتی ذوق کو عام کرنے کی مہم جاری رکھے ہوئے ہیں۔ موصوف کے افکار کا دائرہ

تقریبات تک محدود نہیں ہے بلکہ ایک عملیت پسند شخص کی حیثیت سے تحریری سطح پر بھی نظر آتے ہیں۔ شاہ صاحب کے مضامین اور کالم معروف اخبارات کی زینت بنتے ہیں۔ ڈاکٹر منظور الدین احمد لکھتے ہیں کہ وہ عوامی مسائل کے بین الاقوامی مبصر ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے ایک طویل مضمون میں آپ کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"When he was leaving Pakistan, vetran Journalist and public relations specialist wrote in his column:

"There is nothing alarming at the thought of Pakistanis going abroad. It is good for the economy and the overall employment situation foreign remittances go up. The country's image rises but there is a thought that is saddening, when you realise that those who have actually contributed to the welfare of this society have left it for good. Admittedly, no one is indispensable. Neither Mubarak Shah Zuberi nor any one else. But one does occasionally feel a little weaker when some people like Mubark Shah Zuberi leave. I have seen Mubarak Shah crusading inthe field of Red Cross/Crescent, Blood Donation Drives and many a times he donated blood himself and through his efforts many lives were saved."

Mubarak Shah Zuberi posseses great motivations and public relations capabilities. His articles and interview have widely appeared in the United States and Pakistani, National and Regional Newspapers and magazines. He has a great knak for enhancing and projecting the positive images."

مبارک شاہ صاحب نے میرٹھ گورنمنٹ ہائی اسکول، اسلامیہ کالج لکھنؤ اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اسکول میں تعلیم حاصل کی۔ زمانہ طالب علمی میں غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتے رہے اور مضامین بھی لکھے۔ پاکستان آمد کے بعد برٹش ٹوبیکو کمپنی میں شامل ہوئے اور اٹھارہ سال کمپنی کے جنرل منیجر تعلقات عامہ رہے۔ آپ کی شادی محترمہ آصفہ کے ساتھ ۱۹۶۷ء میں ہوئی۔ محترمہ ممتاز اسکالر مولوی عبدالواحد جامعی سندھی کی صاحبزادی ہیں۔ ممتاز صحافی آصف جیلانی محترمہ کے بھائی ہیں۔ آپ کے صاحبزادے عماد زبیری بھی امریکہ میں ہی مقیم ہیں۔

مبارک شاہ زبیری صاحب اپنی والدہ کے جذبہ خدمت اور مذہبی رجحان سے متاثر ہیں۔ شخصیات میں نواب وقار الملک، سر سید احمد خان، ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد، مولانا حسرت موہانی، مولانا مودودی، مفتی محمد شفیع، مولانا عبداللہ بخاری، سیدنا طاہر سیف الدین احمد، قاری محمد طیب اور مولانا احتشام الحق تھانوی کو بہت پسند کرتے ہیں۔ شاہ صاحب قائد ملت میموریل سوسائٹی پاکستان سے گولڈ میڈل کے علاوہ دیگر اداروں سے متعدد اعزازات حاصل کر چکے ہیں۔ آپ اپنے حسب نسب پر نہیں بلکہ اللہ کے حضور اظہار تشکر کرتے ہیں۔

پروفیسر ڈاکٹر وقارالدین احمد

ڈاکٹر وقارالدین احمد

اقوام میں بعض افراد زمین کا فخر، علم کی آبرو اور وطن کا حقیقی سرمایہ ہوتے ہیں۔ اسی صف میں وقار الدین احمد کا اسم گرامی آتا ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر وقارالدین احمد ہمارے وطن کے قابل ذکر سینئر سائنسدان ہیں۔ دنیا کے باخبر سائنسی حلقے آپ کے علم وفضل کے معترف ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے تحقیقی شعبہ میں گراں قدر کام کیا ہے۔ کئی سائنسی کتب کے مصنف ہیں۔ ان کے علاوہ لاتعداد مقالات معتبر بین الاقوامی سائنسی رسائل میں لکھ چکے ہیں۔ آپ کے کاموں کا سرکاری سطح پر بھی اعتراف کیا گیا ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر وقارالدین احمد ۶ / جولائی ۱۹۴۰ء کو میرٹھ کے اپنے آبائی مکان میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد جناب محمد الدین احمد میرٹھ کی مشہور زبیری فیملی کے فرد تھے۔ اس خاندان نے کئی نامور شخصیات پیدا کی ہیں جنہوں نے تاریخ ساز کردار ادا کیا ہے۔ خود محمد الدین احمد صاحب نے تعلیمی شعبہ میں گہری دلچسپی لی۔ وہ یو۔ پی گورنمنٹ میں ڈپٹی ڈائریکٹر ایجوکیشن رہے۔

وقار صاحب بچپن سے ہی ذہین تھے۔ اس دور کے طریقے کے مطابق ابتدائی تعلیم وتربیت ہوئی۔ ۱۹۵۳ء میں یو۔ پی بورڈ کے میٹرک کے امتحان میں حساب میں امتیازی نمبروں کے ساتھ کامیابی حاصل کی۔ ۱۹۵۵ء میں یو۔ پی بورڈ سے ہی فرسٹ ڈویژن میں انٹر کیا۔ ۱۹۵۷ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے بی۔ ایس سی اور اسی یونیورسٹی سے صرف انیس سال کی عمر میں ۱۹۵۹ء میں ایم۔ ایس سی فرسٹ ڈویژن فرسٹ پوزیشن میں کر کے گولڈ میڈل حاصل کیا۔ پاکستان ہجرت کے بعد اعلیٰ تعلیم جاری رکھتے ہوئے ۱۹۶۶ء میں معروف سائنسداں ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی کی نگرانی میں پی۔ ایچ۔ ڈی کیا۔ آپ کے مقالے کا عنوان تھا :

"Studies in the Alkaloidal Constituents of Some Indigenous Medicinal Plants"

ڈاکٹر وقارالدین احمد کراچی یونیورسٹی سے کیمسٹری میں ڈاکٹریٹ کرنے والے پہلے اسکالر ہیں۔ اس

کے صرف دو سال بعد موصوف نے بون یونیورسٹی جرمنی سے اپنے مقالے

"5-Hydroxy -3- Methoxy And 5, 6 - Dihydroxy 1-Naphthyl Acetic Acid As Possible Metabolites of 1 - Naphthyl Acetic Acid"

پر ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔ ۱۹۹۲ء میں کراچی یونیورسٹی سے ڈی۔ ایس سی کا اعزاز حاصل کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے دوران تعلیم اپنے علم ومطالعہ کو وسعت دینے کے لیے ۱۹۵۹ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے فرانسیسی اور ۱۹۶۶ء میں گوئٹے انسٹی ٹیوٹ کراچی سے جرمن زبانوں میں ڈپلومہ حاصل کر کے ان زبانوں میں مہارت حاصل کر لی تھی جبکہ اردو، انگریزی اور ہندی میں پہلے ہی سے مکمل دسترس رکھتے ہیں۔

پروفیسر ڈاکٹر وقارالدین احمد ۱۹۵۹ء میں پاکستان کونسل آف سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ لیبارٹریز (پی سی ایس آئی آر) سے بحیثیت ٹیکنیکل اسسٹنٹ وابستہ ہوئے۔ ۱۹۶۱ء میں ریسرچ کیمسٹ، ۱۹۶۵ء میں ریسرچ آفیسر اور ۱۹۶۶ء میں سینئر ریسرچ آفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۹۷۶ء میں کراچی یونیورسٹی کے ایچ۔ ای۔ جے ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف کیمسٹری میں پروفیسر ہوئے۔ ۱۹۹۰ء میں متعلقہ شعبہ کے ہاسٹل انچارج اور کوڈائریکٹر کے فرائض سنبھالے۔ کچھ عرصہ بعد فیکلٹی آف سائنس کراچی یونیورسٹی کے ڈین بنائے گئے۔ اسی دوران ۱۹۹۳ء میں کارنل یونیورسٹی امریکہ کے کیمسٹری ڈیپارٹمنٹ میں وزیٹنگ سائنٹسٹ رہے جہاں طلباء نے آپ سے استفادہ کیا۔ کراچی یونیورسٹی کے سائنس جرنل کے چیف ایڈیٹر اور کیمیکل سوسائٹی آف پاکستان کے جرنل کے معاون مدیر کے فرائض بھی انجام دے رہے ہیں۔

پروفیسر وقارالدین احمد نے کثیر تعداد میں نئے مرکبات کو پاکستان میں پائے جانے والے پودوں سے الگ کر کے ان کی کیمیائی ساخت کا تعین کیا۔ ان کی تحقیق کے مطابق ان میں سے کئی مرکبات میں دلچسپ حیاتیاتی عنصر پائے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر آپ نے ایک پودے Prosopis Juliflova سے ایک نئے الکلائی مرکب کو علیحدہ کیا جو فنگس اور بکٹیریاز کے خلاف مزاحمت پیدا کرتا ہے۔ کئی ایسے مرکبات بھی موصوف محترم نے دریافت کیے جو بہت سی بڑی بیماریوں کے خلاف موثر مزاحمت کرتے ہیں۔ ان میں سے کچھ Triterpenoidal کا کام Brine Shrimp میں سے زہر کو الگ کرتا ہے۔ ان کے علاوہ پروفیسر صاحب نے ترکی سے تعلق رکھنے والے پودے Symphytum Officinale پر تحقیق کی اور اس میں سے ایک Saponins کو علیحدہ کیا۔

وقار صاحب کی ان عظیم خدمات کے مداح پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ امریکہ، برطانیہ، سویڈن اور سوئٹزرلینڈ کے ماہرین نے آپ کی تگ ودو کو زبردست خراج تحسین پیش کیا ہے۔ متعلقہ شعبہ کے ماہرین کی تنظیمیں ڈاکٹر صاحب کو مسلسل اعزازات سے نوازتی رہی ہیں۔ پاکستان اکیڈمی آف سائنس نے آپ کے غیر معمولی کام کو سراہتے ہوئے دو مرتبہ گولڈ میڈل پیش کیے۔ ۱۹۸۶ء میں "سائنٹسٹ آف دی ایئر" اور

وزیراعظم گولڈ میڈل سے نوازے گئے۔ ۱۹۹۶ء میں پاکستان بک فاؤنڈیشن نے کیش ایوارڈ دیا۔ اسی سال حکومتِ پاکستان کی طرف سے صدرِ مملکت نے قومی اعزاز "ستارہ امتیاز" عطا کیا اور اس کے دو سال بعد حکومتِ ایران کی طرف سے ایرانی صدر نے اپنے ملک کے اعزاز سے نوازا۔

پروفیسر ڈاکٹر وقار الدین احمد کے تراسی مقالات قومی سائنسی رسائل اور دو سو اڑتیس مقالات مختلف ممالک کے معتبر سائنسی رسائل کی زینت بن چکے ہیں۔ آپ کی سات اہم کتب بھی طبع ہوئی ہیں جن میں سے تین امریکہ اور ایک ایمسٹرڈم سے منظرِ عام پر آئی ہیں۔ ان کتب کے نام اور سنِ اشاعت درج ذیل ہیں:

1. Pakistan Encyclopaedia Planta Medica, Vol.I. 1986
2. Pakistan Encyclopaedia Planta Medica, Vol.II. 1987
3. Pakistan Encyclopaedia Planta Medica, Vol.III. 1989
4. ^{13}C-NMR of Natural Products. Vol. I. 1992
5. ^{13}C-NMR of Natural Products. Vol. II. 1992
6. Hand Book of Natural Products Data. Vol. 2. 1994
7. Spectroscopic Data Of Saponins, Vol. I. II & III. 2000

سائنسی علوم کی تدریس میں بھی ڈاکٹر صاحب کو امتیاز حاصل ہے۔ آپ کی نگرانی میں اب تک ۳۳ طلباء پی۔ ایچ۔ ڈی اور دو طالب علم ایم۔ فل کی اسناد حاصل کر چکے ہیں۔ مزید سات طلباء اپنی اسناد کے لیے آپ کی رہنمائی میں کام کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب ۱۹۹۰ء سے ایم۔ فل کے طلباء کو

Structural Organic Chemistry

کا کورس باقاعدگی سے پڑھا رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ متعدد قومی و عالمی منصوبوں میں بھی شریکِ کار ہیں جن میں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن پاکستان، انٹرنیشنل فاؤنڈیشن فار سائنس سویڈن، پاکستان سائنس فاؤنڈیشن، آفس آف دی نیول ریسرچ امریکہ اور پاک تازک جوائنٹ ریسرچ فنڈ قازکستان شامل ہیں۔ بین الاقوامی اور قومی کانفرنسوں اور سیمینارز میں ڈاکٹر وقار الدین احمد نے موثر کردار ادا کیا ہے۔ جامعہ کراچی کی سنڈیکیٹ کے رکن اور پاکستان کیمیکل سوسائٹی کے صدر بھی رہے۔

پروفیسر ڈاکٹر وقار الدین احمد کراچی یونیورسٹی کے موسٹ سینئر پروفیسر ہیں۔ پاکستان کونسل فار سائنس اینڈ ٹیکنالوجی کے کتابچے "لیڈنگ سائنٹسٹ آف پاکستان" کے مطابق وقار صاحب پاکستان کے دوسرے اعلیٰ ترین کیمسٹ ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی خانگی زندگی کا آغاز ۱۹۷۱ء میں جناب حشمت اللہ خاں کی صاحبزادی پروین سے شادی کے ساتھ ہوا۔ محترمہ پروین وقار ایک مخلص اور باوقار خاتون ہیں۔ اپنے ہمسفر کی بہترین معاون ہیں۔ آپ کی اولاد میں منزہ، شمیلا اور شامہ یعنی تین بیٹیاں ہیں۔ ڈاکٹر صاحب یورپ اور افریقہ کے مختلف ممالک

کے علاوہ جرمنی میں بھی رہے ہیں۔ عمرہ اور حج کی سعادت سے بھی مشرف ہو چکے ہیں۔ مشرقی تہذیب کا جیتا جاگتا نمونہ ہیں۔

خان بہادر محمد یاسین خاں

خان بہادر محمد یاسین خاں خلف حاجی محمد سلیمان خاں میرٹھ کے رؤسا کی صف میں شامل تھے۔ آپ کا تعلق میرٹھ کے قدیم و معروف زبیری خاندان سے تھا۔ اس فیملی سے تعلق رکھنے والے بیشتر افراد اعلیٰ تعلیم سے آراستہ ہیں، جنہوں نے زندگی کے مختلف شعبوں میں کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔

محمد یاسین خاں صاحب کی ولادت ۱۸۸۸ء کے قریب میرٹھ میں ہوئی اور چھیاسی سال کی عمر میں ۱۹۷۴ء میں کراچی میں انتقال کیا۔ پاپوش نگر کراچی کے قبرستان میں اپنے بڑے بھائی ممتاز رہنما اور پارلیمنٹیرین نواب سر محمد یامین خاں کی آخری آرام گاہ کے قریب محو خواب ہیں۔ جناب یاسین خاں کے دوسرے بھائیوں میں سلیمان محمود، محمد ہارون خاں اور محمد عیسیٰ خاں کے علاوہ تین بہنیں بھی تھیں۔

آپ کی ابتدائی تعلیم و تربیت کا اہتمام میرٹھ میں ہی ہوا۔ آپ نے میرٹھ کالج اور پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے تعلیمی اسناد حاصل کیں اور ایل ایل بی بھی کیا۔ تعلیم سے فارغ ہوئے تو حکومت ہند نے انڈین پولیٹکل سروس کے لیے منتخب کر کے عدن بھیج دیا۔ وہاں ایک طویل عرصے یعنی ستائیس سال رہے۔ عدن میں جج کی حیثیت سے تقرر ہوا تھا اور وہاں جج آفیسر بھی رہے۔ آپ کی بے لوث اور دیانت دارانہ خدمت کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ ہندوستان کی حکومت کی طرف سے خان بہادر کا خطاب بھی عطا ہوا۔

محمد یاسین خاں صاحب وضعدار اور اصولوں کے پابند تھے۔ میرٹھ میں ان کی رہائش گاہ "کوٹھی جنت نشاں" کے نام سے مشہور تھی۔ جہاں بہن بھائیوں نے بچپن گزار کر جوانی میں قدم رکھا۔ پاکستان آمد کے بعد کراچی کے علاقے ناظم آباد میں کوٹھی بنائی تو اس کا نام جنت نشاں ہی رکھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مرحوم کو اپنے ماضی سے گہری دلچسپی تھی اور یہ بھی آبائی وطن کی یاد تازہ رکھنے کی ایک صورت تھی۔ خان بہادر مرحوم کا حلقہ احباب بھی وسیع تھا۔

محمد یاسین خاں صاحب کی ہمسفر نواب اسعد اللہ خاں کی پوتی اور نواب سعد اللہ خاں کی بیٹی گوہر بانو مرحومہ تھیں۔ جن کے بطن سے دو بیٹیاں جہاں آراء اور زینت آراء ہوئیں۔ جہاں آراء صاحبہ اسعد احمد صاحب اور زینت آراء صاحبہ ممتاز احمد صاحب سے منسوب ہوئیں۔ اسعد احمد اور ممتاز احمد صاحبان بھی حقیقی بھائی ہیں۔ ممتاز احمد صاحب کا انتقال ہو چکا ہے۔ اسعد احمد صاحب وفاقی حکومت کے سیکریٹری فنانس کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے ہیں۔

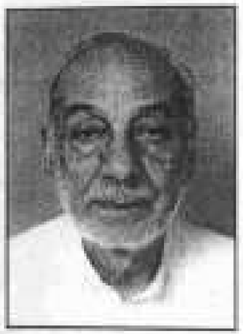

اسعد احمد

اسعد احمد

جناب اسعد احمد پاکستان کے ان اولین افسران میں سے ہیں جنہوں نے مملکت اسلامیہ پاکستان کے مالیاتی نظام کو مستحکم بنیادیں فراہم کرنے کی کوششوں میں اپنی بہترین صلاحیتوں کے ساتھ کام کیا۔ آپ وفاقی حکومت کے مرکزی سیکریٹری فنانس کے عہدے سے ریٹائر ہوئے ہیں۔

اسعد احمد صاحب ۲۰ر جون ۱۹۲۳ء کو میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد محمد احمد مرحوم ریاست حیدرآباد دکن میں پوسٹ ماسٹر جنرل رہے۔ دادا محمد صدیق صاحب میرٹھ کے مشہور انجینئر تھے۔ جنہیں نظام حیدرآباد دکن نے اپنے یہاں بلا لیا تھا۔ ممتاز احمد، سعید احمد، سرجن مسعود احمد، خالد احمد اور عارف احمد، اسعد صاحب کے بھائی ہیں جنہوں نے مختلف شعبوں میں خدمات انجام دیں۔

اسعد احمد صاحب کے والد حیدرآباد دکن میں مقیم تھے اس لیے تعلیمی سلسلے بھی وہیں طے ہوئے۔ سٹی کالج حیدرآباد سے میٹرک اور عثمانیہ یونیورسٹی سے ۱۹۴۷ء میں ایم۔ ایس سی کے امتحانات میں کامیاب ہوئے ہی تھے کہ تقسیم ہند عمل میں آئی اور پھر سقوط حیدرآباد کا واقعہ رونما ہوا۔ جس کے بعد آپ ستمبر ۱۹۴۸ء میں پاکستان آ گئے۔ یہاں آ کر پہلے سپیریئر سروس کمیشن کے امتحان میں شریک اور کامیاب ہوئے۔ اولاً انکم ٹیکس سروس میں منتخب ہوئے مگر اپنی علمی لیاقت کی وجہ سے اس سے مطمئن نہ تھے اور چاہتے تھے کہ وزارت خارجہ یا کسی اور وزارت میں کام کریں۔ چودھری محمد علی نے اسعد صاحب سے ذاتی ملاقات میں کہا کہ میں تمہارا بزرگ ہوں اور تمہارے خاندان کی خدمات سے متعارف ہوں۔ میرا مشورہ ہے کہ تم مالیات کے شعبہ میں رہو۔ یہ ملک کے لیے بھی بہتر ہوگا۔ آپ نے اس مشورے کو قبول کر لیا اور دلچسپی سے کام کرنے لگے۔ انکم ٹیکس سے ملٹری اکاؤنٹس سروس میں تبادلہ ہوا۔ دو سالہ تربیتی کورس میں نمایاں کامیابی حاصل کرنے کے بعد لاہور، کراچی، راولپنڈی، چاٹگاؤں اور سیف پور میں سینئر فائننس آفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے ہوئے ۱۹۵۹ء میں منسٹری آف فائننس میں انڈر سیکریٹری کی حیثیت سے پہنچے۔ اس دوران میں ایگری کلچر اور پلانٹ

کارپوریشن، کراچی ڈویلپمنٹ اتھارٹی اور ٹریڈنگ کارپوریشن آف پاکستان سے متعلق بھی رہے۔ مختلف سرکاری محکموں سے مالیات سے متعلق ماہرین کے گروپ میں بھی شریک رہے۔

ٹریڈنگ کارپوریشن آف پاکستان میں پوسٹنگ کے بعد ذمہ داریاں مزید بڑھ گئی تھیں۔ امپورٹس کے اُمور، انتظامی معاملات، شپنگ کے جملہ امور اور مال کے تقسیم کا نظام سب کچھ ہی آپ کے سپرد تھا۔ جوائنٹ سیکریٹری کے فرائض ادا کر رہے تھے کہ مرکزی وزارت مالیات میں ایڈیشنل سیکریٹری کے عہدے پر ۱۹۷۵ء میں تقرر ہوا۔ پاک سعودی انویسمنٹ میں ذمہ داریاں سنبھالیں۔ مرکزی حکومت نے ۱۹۸۳ء میں ریٹائرمنٹ میں دو سال کی توسیع کرتے ہوئے منسٹری آف فائننس میں مرکزی سیکریٹری کے ایک بڑے عہدے پر فائز کیا۔ اسی عہدے پر دو سالہ اضافی مدت پوری کر کے ۱۹۸۶ء میں ریٹائر ہوئے۔

اسعد احمد صاحب نے دوران ملازمت پہلا سفر ۱۹۶۳ء میں کیا اور کینیڈا گئے۔ وہاں چھ ماہ کے ترقی کورس میں بھی شرکت کی۔ اپنے اس دورے میں دیگر ممالک ہوتے ہوئے واپسی میں عمرے کی سعادت حاصل کی۔ اس کے بعد ساؤتھ امریکن کنٹریز، مڈل ایسٹ، یورپی ممالک اور متعدد ایشیائی ممالک کے سفر کئے۔ یوگوسلاویہ کے ایگری کلچر ڈیپارٹمنٹ کی دعوت پر وہاں کا بھی دورہ کیا۔ اپنے ان دوروں میں اسعد صاحب نے مختلف کانفرنسوں اور سیمینارز میں اپنے ملک کی نمائندگی کا اعزاز حاصل کیا۔ ۱۹۶۶ء اور ۱۹۷۵ء میں حج کی سعادت بھی حاصل کر چکے ہیں۔ بی۔ ایس سی اور ایم۔ ایس سی کے امتحانات میں فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن حاصل کر کے یونیورسٹی سے گولڈ میڈل حاصل کرنے کا اعزاز بھی آپ کو حاصل ہے۔

اسعد صاحب کو مطالعہ کے علاوہ باغبانی سے گہرا شوق رہا۔ باغبانی سے متعلق اسلام آباد کے ادارے میں دو مرتبہ چیئرمین منتخب ہوئے۔ دنیا کی تمام رنگینیاں آنکھوں میں بسائے اور ایک طویل عرصہ قوموں اور زندگی کے نشیب و فراز کا مطالعہ کرنے کے بعد خانہ نشین ہیں۔ علالت کی وجہ سے گھر پر ہی رہتے ہیں۔ آپ کی شادی مارچ ۱۹۵۴ء میں نواب محمد یاسین خاں کی صاحبزادی جہاں آراء صاحبہ سے ہوئی جن کی پرورش ان کے تایا نواب سر محمد یامین خاں کے زیر شفقت ہوئی۔ آپ کی اولاد میں ایک صاحبزادے مجاز احمد ہیں جو سٹی بینک لندن سے وابستہ ہیں۔ چار بیٹیاں نالہ رخ، رُوبابہ، ملیحہ (کینیڈا) اور آمنہ ہیں۔ اپنی زندگی میں اسعد احمد صاحب اپنے والد کے علاوہ سید ہاشم رضا کے بھائی مسعود رضا اور سابق آڈیٹر جنرل مشتاق احمد صاحبان سے متاثر رہے ہیں۔

ایڈمرل یو۔اے۔سعید

ایڈمرل یو۔اے۔سعید

پاکستان کی مسلح افواج کے نامور افراد میں سعید الدین احمد، ایڈمرل یو۔اے۔سعید کے نام سے معروف تھے۔ مرحوم پاکستان بحریہ کے اعلیٰ عہدوں پر رہے اور اپنی بہترین صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے یادگار خدمات انجام دیں۔

یو۔اے۔سعید مرحوم جناب رشید الدین احمد کے بیٹے اور ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد کے بھتیجے اور داماد تھے۔ ۱۹۲۳ء میں آپ کی ولادت ہوئی۔ تعلیم و تربیت کا زیادہ عرصہ علی گڑھ میں گزارا۔ تعلیمی مدارج طے کرتے ہوئے ۱۹۴۳ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی ایس سی کے امتحان میں کامیاب ہوئے اور اسی سال ہندستان بحریہ میں شمولیت اختیار کی۔ ۱۹۴۷ء میں ایڈوانس کورس کے لیے برطانیہ روانہ ہوئے۔ اسی دوران اسلامی مملکت پاکستان قائم ہوئی اور آپ وہاں سے براہ راست پاکستان پہنچے۔ پاکستان نیوی میں مختلف عہدوں پر فرائض انجام دیتے ہوئے آگے بڑھتے رہے اور ایڈمرل بنائے گئے۔

یو۔اے۔سعید صاحب نے پاکستان کے استحکام کے لیے ہر لمحہ زیست وقف رکھا۔ کئی اہم اداروں کی تعمیر و ترقی میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ پاکستان کی مشہور نیشنل شپنگ کارپوریشن کے منیجنگ ڈائریکٹر کی حیثیت سے انہوں نے انتھک محنت کی۔ انہیں کے دور میں نیشنل شپنگ کارپوریشن کی خوبصورت عمارت تعمیر ہوئی۔ کراچی کی معروف ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی کے بانی ارکان میں بھی شامل ہیں۔ ڈی۔ ایچ۔ اے کے سیکریٹری بھی رہے۔ سوسائٹی میں واقع پاکستان کی ایک خوبصورت اور دلکش مسجد ''مسجد طوبیٰ'' کے بانی کی حیثیت سے ان کا نام یاد رکھا جائے گا۔ اس مسجد کے منصوبے کو انہوں نے بڑی دلچسپی اور محنت سے ترکی کے ماہرین تعمیرات کے تعاون سے مکمل کیا۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر سر ضیاء الدین میموریل سوسائٹی کراچی کے صدر بھی رہے۔

سعید صاحب کی ذاتی زندگی بھی خوش گوار رہی۔ ۱۹۵۰ء میں ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد کی صاحبزادی

ارشاد فاطمہ سے آپ کی شادی ہوئی جن کے بطن سے ڈاکٹر فیصل سعید (پی۔ ایچ۔ ڈی) اور فوزی سعید کے علاوہ ایک بیٹی فریدہ ہیں جو ڈاکٹر عترت حسین زبیری کے ایک صاحبزادے کی ہم سفر ہیں۔

۱۹۷۱ء میں یو۔ اے۔ سعید صاحب بحریہ سے ریٹائر ہوئے۔ ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی جنگوں میں حصہ لے چکے تھے۔ ۱۹۶۳ء میں پاکستان کا قومی اعزاز "ستارہ پاکستان" سے بھی نوازے جا چکے تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد گوشہ نشین رہے اور عملی جدوجہد سے عبارت بھرپور زندگی گزار کر ۷۳ سال کی عمر میں ۱۹۹۷ء میں جہان رنگ و بو سے رخصت ہو کر مالک حقیقی کے پاس پہنچے۔ مرحوم کی تدفین نیوی کے قبرستان واقع کراچی میں پورے فوجی اعزاز کے ساتھ ہوئی۔

سعید صاحب کے انتقال پر پاکستان امریکہ فرٹرنل سوسائٹی کا تعزیتی اجلاس امریکہ میں منعقد ہوا جس کی صدارت مبارک شاہ زبیری نے فرمائی۔ انہوں نے اپنے صدارتی خطاب میں مرحوم کی خدمات کو خراج عقیدت پیش کیا۔ اجلاس میں ایک قرارداد منظور ہوئی جس میں مطالبہ کیا گیا کہ ایک بحری جہاز سعید صاحب کے نام سے منسوب کیا جائے اور پی۔ این۔ ایس۔ سی کی عمارت کا نام ایڈمرل سعید اسکوائر رکھا جائے۔

حشمت اللہ خاںؒ

احمد اللہ خاں میرٹھ کی مشہور شخصیت تھے۔ انہیں تصنیف و تالیف سے بھی دلچسپی تھی۔ حکایات اس و حکایات امراء اور اخلاق احمدی ان کی یادگار ہیں۔ انہوں نے مختلف جہتوں میں کام کیا۔ انگریزوں نے ان کے خاندانی اعزاز و اثر و رسوخ کو دیکھ کر توابی اور ۱۸۸۸ء میں خان بہادر کا خطاب عطا کیا تھا۔ ان کے بیٹے نواب اسد اللہ خاں بھی اپنے والد کے صحیح جانشین ثابت ہوئے۔ وہ میونسپل بورڈ اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے ممبر رہے، پھر مجسٹریٹ مقرر ہوئے۔ انہیں صوبے کے میونسپل بورڈز کی جانب سے لیجسلیٹیو اسمبلی میں نمائندگی کا اعزاز بھی حاصل ہوا۔ ان کے چھوٹے بھائی احسن اللہ خان بھی اپنے خاندانی وقار کو قائم رکھنے میں نمایاں رہے۔

حشمت اللہ خاں صاحب احسن اللہ خاں مرحوم کے صاحبزادے تھے جن کی ولادت آبائی مکان کوٹھی جنت نشاں میں ۱۸۹۸ء میں میرٹھ میں ہوئی۔ حشمت صاحب کے دوسرے بھائی شوکت اللہ اور رحمت اللہ تھے۔

جناب حشمت اللہ خاں میرٹھ کے مشہور تحصیلدار تھے۔ ان کی عمر عزیز کا بیشتر حصہ عبادت و ریاضت اور خدمت انسانی میں گزرا۔ پاکیزگی و طہارت کا بہت اہتمام رکھتے تھے۔ اسلامی علوم و تعلیمات سے گہرا لگاؤ رکھنے کی وجہ سے طبیعت میں بے نیازی کا عنصر زیادہ تھا۔ بزرگان دین سے بہت عقیدت و محبت رکھتے تھے۔ آپ نے صرف چھیالیس سال کی عمر پائی اور جون ۱۹۴۳ء میں رڑکی میں دنیا کو خیرباد کہہ کر خالق حقیقی کے پاس پہنچے۔ آپ کی تدفین معروف بزرگ حضرت علاؤ الدین صابر کلیریؒ کے مزار مبارک کے احاطہ میں پائینتی کے رخ ہوئی۔

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

حشمت اللہ مرحوم کی شادی اسلام نبی خاں کے بڑے بھائی اسلام حامد خاں کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ حامد خاں صاحب ڈپٹی کلکٹر رہے ہیں۔ آپ کی اولاد میں ایک صاحبزادی نیلوفر سلطانہ ہیں جو کیپٹن خالد احمد انصاری سے منسوب ہیں۔ خالد صاحب بھی تصوف سے گہرا شغف رکھتے ہیں۔ حشمت صاحب کی دوسری شادی بھی عزیزوں میں ہوئی جن سے ایک صاحبزادے لطف اللہ خاں احسن ہیں۔ دونوں بہن بھائی ایک دوسرے سے بڑی محبت کرتے ہیں۔

پرتھوی سنگھ بے دھڑک

میرٹھ کے جن باشندوں نے معاشرتی ناہمواریوں اور جہالت کے خلاف مسلسل کام کیا، ان میں پرتھوی سنگھ بے دھڑک بھی شامل ہیں۔ میرٹھ ضلع کی تحصیل باغپت کے گاؤں شکوہ پور کے ایک غریب کسان گھرانے میں پیدا ہونے والے پرتھوی سنگھ کی فکر نے دیہی زندگی میں ایک خاموش انقلاب برپا کیا۔ انہوں نے گاؤں گاؤں اور شہر شہر گھوم کر اپنے بھجنوں کے ذریعہ سماجی انقلاب کا بگل بجایا۔ ان کی کوششیں رائیگاں نہیں گئیں اور ہر چھوٹے بڑے گاؤں میں عوامی شعور بیدار ہوا۔

پرتھوی سنگھ بے دھڑک نے سماج سدھار کے ہر گوشے پر کام کیا لیکن جہالت اور طبقاتی امتیاز کے خلاف ان کی جدوجہد مثالی رہی۔ اتر پردیش کے علاوہ دوسرے صوبوں راجستھان اور ہریانہ میں بھی ان کی کوششیں رنگ لائیں۔ ان صوبوں میں بھی ان کے پیغام کی اہمیت کو سمجھا اور اس کی افادیت کو تسلیم کیا گیا۔ یہ پرتھوی سنگھ کا کارنامہ ہے کہ وہ دیہاتی جو جاہل اور گنوار کہے جاتے تھے، تعلیم کی طرف راغب ہوئے۔ خصوصاً عورتوں میں تعلیمی رجحان بہت بڑھا۔ دیہاتی عورتیں تعلیم سے بہت دور تھیں اور دیہی زندگی میں ان کی تعلیم کو غیر ضروری بھی سمجھا جاتا تھا۔

پرتھوی سنگھ نے چھوٹی چھوٹی آبادیوں سے چندہ اکٹھا کر کے لڑکیوں کی تعلیم کے لیے اتر پردیش، ہریانہ اور راجستھان میں ہزاروں اسکول اور کالج کھلوائے۔ اس طرح انہوں نے ہزاروں لڑکیوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کر کے بہتر مستقبل کی نوید دی۔ ان کے اس عمل سے دیہی زندگی کی فضا تبدیل ہوئی۔ یہ سب کچھ انہوں نے اپنے بھجنوں کے ذریعہ کیا۔ ان کے ہر بھجن میں کسی نہ کسی سماجی برائی پر چوٹ ہوتی تھی جو دلوں کو چھو جاتی تھی۔ اس عمل سے برائیوں کی زنجیریں آہستہ آہستہ ڈھیلی ہوتی گئیں اور لوگ آزاد ہوتے گئے۔

پرتھوی سنگھ محب وطن، دور اندیش اور عملیت پسند شخص تھے۔ انہیں ایک مہان سماج سدھارک مانا گیا اور آج بھی یہ کہا جاتا ہے کہ ان کے کارنامے چند صفحات میں نہیں سما سکتے۔

مجلہ نوچندی میلہ، ۱۹۹۳ء

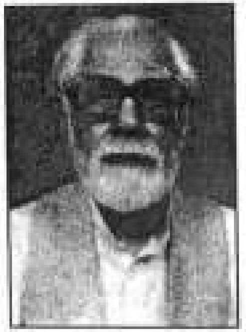

حشمت اللہ خاں

حشمت اللہ خاں

حشمت اللہ خاں خلف محمد ذکریا خاں بن عصمت اللہ خاں میرٹھ سے تعلق رکھنے والے بزرگ ہیں۔ متانت و سنجیدگی آپ کے چہرے سے ظاہر ہے۔ کتاب زیست کے اوراق پلٹتے ہیں تو ماضی کی پرچھائیاں لہجے سے بھی نمایاں ہوتی ہیں اور آنکھوں کی نمی سے بھی آشکار ہو جاتی ہیں۔

جناب حشمت اللہ خاں ۱۰ر فروری ۱۹۱۴ء کو مارہرہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے خاندان کے تمام بزرگوں کا وطن میرٹھ ہے۔ والد محترم مارہرہ کے زمیندار تھے اور جائیداد بھی کافی تھی۔ اس کی نگرانی کی وجہ سے انہوں نے مارہرہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ وہیں دور اندیش باپ نے بیٹے کی تعلیم و تربیت کا بہتر انتظام کیا اور حشمت صاحب کو علی گڑھ بھیج دیا۔ علی گڑھ میں ہی تعلیم کی ابتداء ہوئی اور بوجوہ لاء فائنل ایئر میں چھوڑا۔ یونیورسٹی میں تعلیم کے دوران لاء سوسائٹی کے سکریٹری رہے۔

۱۹۳۶ء میں ڈائریکٹریٹ آف کاٹنیک میں ملازم ہوئے۔ جہاں سے محکمہ آب و ہوا میں فرائض سنبھالے۔ دنیا میں قائم ہونے والی پہلی مسلم مملکت پاکستان میں ذمہ داریاں سنبھالنے کی غرض سے ۳۰ر جون ۱۹۴۷ء کو آئے۔ اس طرح موصوف پہلے سرکاری ملازم ہیں جو قیام پاکستان سے پہلے پاکستان پہنچے۔

حشمت صاحب نے دیانتداری اور فرض شناسی کے ساتھ شب و روز محنت کی۔ پاکستان میں محکمہ آب و ہوا سے متعلق رہتے ہوئے اس ادارے کو منظم و فعال بنانے میں آپ نے خاص کردار ادا کیا جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ آپ ہی کی کوششوں سے ریجنل آفس، ہیڈ کوارٹر میں تبدیل ہوا۔ اولاً آپ اسسٹنٹ ایڈمنسٹریٹو آفیسر رہے پھر ایڈمنسٹریٹو آفیسر کلاس فرسٹ، پھر چیف ایڈمنسٹریٹو آفیسر ہوئے۔ اسی دوران میں ریجنل ڈائریکٹر لاہور کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ ریجنل ڈائریکٹر کی حیثیت سے لاہور میں فرائض کی ادائیگی پر آپ نے لوگوں کو بہت متاثر کیا۔ بہترین منصوبہ بندی کے ساتھ ادارہ کو متحرک کیا اور اہل افراد کی قدر کی۔

۱۹۶۳ء میں حشمت صاحب کا تبادلہ سول ایوی ایشن میں ڈپٹی ڈائریکٹر کی حیثیت سے ہوا۔ پانچ سال

بعد ڈائریکٹر ایڈمنسٹریشن سول ایوی ایشن مقرر ہوئے۔ یہ محکمہ بھی مرکزی حکومت کے تحت ہے۔ ڈائریکٹر ایڈمنسٹریشن کی ذمہ داریاں بھی وسیع تھیں۔ آپ کے فرائض میں اکاؤنٹس اور بجٹ کے علاوہ تقریباً چار پانچ ہزار ملازمین کی کارکردگی پر نظر رکھنا بھی شامل تھا جنہیں موصوف احسن طریقے سے پورا کرتے ہوئے ریٹائر ہو کر پنشن یاب ہوئے۔ ۱۹۷۱ء میں سقوط ڈھاکہ کے بعد پاکستانی شہریوں کی ہر ممکن مدد حشمت صاحب کی دردمندی و دل سوزی کی عکاس ہے۔ آپ نے رنگون اور کھٹمنڈو میں پھنسے ہوئے بے سروسامان پاکستانیوں کی وطن واپسی کے لیے بھرپور کوششیں کیں اور وطن آنے میں ان کی مدد کی۔ اب خانہ نشین ہونے کے باوجود حتی المقدور ضرورتمندوں کی معاونت کرتے ہیں اور قانونی مشاورت کے ذریعے ان کے مسائل کے حل کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ آپ کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے حکومت پاکستان نے تمغہ خدمت عطا کیا۔ یہ سول سروس کے افراد کے لیے ایک اعزاز ہوتا ہے۔

زمانہ طالب علمی اور جوانی میں ہاکی، کرکٹ اور ٹینس پسندیدہ کھیل رہے۔ دائرہ احباب بھی وسیع ہے مگر آج بھی اپنے دوستوں عزل اللہ خاں، حسن مسعود، شفیق حسن، سعید احمد، قیوم انور، عمر عادل، نعیم احمد اور عزیز احمد صاحبان کا ذکر بڑی محبت سے کرتے ہیں۔

حشمت اللہ صاحب کی ذاتی زندگی کا آغاز ۱۹۴۷ء میں محترمہ رشیدہ خاتون بنت جناب رشید احمد خاں صاحب کے ساتھ شادی سے ہوا۔ رشید احمد خاں صاحب اشرفیہ سلسلے میں خلیفہ تھے اور اپنے حلقے میں احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ حشمت صاحب کی اولاد میں پانچ بیٹے شاداب حشمت خاں (دبئی)، اورنگ زیب حشمت خاں، خسرو حشمت خاں (امریکہ)، خرم حشمت خاں (ریاض) اور خاور حشمت خاں کے علاوہ دو بیٹیاں پروین وقار اور شیریں منیر ہیں۔ اورنگ زیب حشمت پی آئی اے میں پائلٹ اور خاور حشمت تجارت کے شعبہ سے وابستہ ہیں۔ پروین صاحبہ ممتاز سائنسداں پروفیسر ڈاکٹر وقار الدین احمد کی اہلیہ ہیں۔

کیپٹن خالد احمد

خالد احمد

محترم خالد احمد سلسلہ نقشبندیہ اور مجددیہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ کے والد محمد احمد صاحب میرٹھ کے رہنے والے تھے۔ دادا محمد صدیق مرحوم کا تعلق بھی میرٹھ سے ہی تھا۔ میرٹھ میں ان کی رہائش کا کوٹھی جنت نشاں کے قریب چھوٹی کوٹھی کے نام سے مشہور تھی۔ محمد صدیق صاحب پیشہ کے اعتبار سے انجینئر تھے۔ اپنے شعبہ میں مکمل دسترس رکھتے تھے جس سے متاثر ہو کر نظام حیدرآباد دکن نے ان کو اپنے ہاں رہنے کی پیشکش کی۔ صدیق صاحب نے متعدد عذر پیش کیے مگر ہر مجبوری کا حل موجود رہا، اس لیے وہ انکار نہ کر سکے اور حیدرآباد چلے گئے۔ ان کے صاحبزادے محمد احمد مرحوم بھی علی گڑھ یونیورسٹی سے اپنی تعلیم مکمل کر کے حیدرآباد پہنچے۔ وہیں ملازمت قبول کر لی۔ وہ پوسٹ ماسٹر جنرل حیدرآباد کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔

خالد احمد صاحب ۳۰ رنومبر ۱۹۲۸ء کو حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ اسکول سے میٹرک کر کے اپنے والدین کے پاس حیدرآباد چلے گئے اور وہاں نظام کالج میں پڑھا۔ وہیں آپ نے آرمی جوائن کر لی تھی۔ سقوط حیدرآباد کے بعد یکم جنوری ۱۹۴۹ء کو براستہ بمبئی کراچی پہنچے۔ پاکستان میں ۱۹۵۰ء کے پہلے مہینے میں پاکستان ایئرفورس میں پائلٹ کے طور پر شمولیت اختیار کی۔ ۱۹۵۷ء میں قومی فضائی کمپنی پی آئی اے نے ایئرفورس سے آپ کی خدمات مستعار لیں۔ تین سال بعد آپ سے کہا گیا کہ آپ پر منحصر ہے کہ آپ ایئرفورس میں واپس آ جائیں یا پھر پی آئی اے سے مستقلاً وابستہ ہو جائیں۔ خالد صاحب نے پی آئی اے کو پسند کیا۔ قومی ایئرلائن سے ہی آپ ۱۹۹۱ء میں ریٹائر ہوئے۔ آپ کا فلائنگ پیریڈ بیالیس سال رہا۔ اس طویل دورانیہ میں پی آئی اے کے ہر جہاز پر چیف پائلٹ رہے۔ انسٹرکٹرز کی تربیت بھی فرائض میں شامل رہی۔ فیری فلائٹس پر آپ کو مکمل کنٹرول رہا۔ فیری فلائٹس میں چار انجن کے جہاز کو تین انجنوں کی مدد سے اڑا کر اپنے مستقر پر لانا مشکل کام ہوتا ہے۔ اس کے لیے اعلیٰ تربیت اور پیشہ ورانہ مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس میں آپ کو ملکہ حاصل تھا۔

خالد احمد صاحب کے دوسرے بھائی ممتاز احمد فوج میں میجر، اسعد احمد وفاقی حکومت میں سیکریٹری، سعید احمد اکاؤنٹینٹ، ڈاکٹر مسعود احمد ممتاز سرجن اور عارف احمد بر ماشیل میں ایگزیکٹیو پوسٹ پر رہے۔ ممتاز احمد، سعید احمد اور عارف احمد انتقال کر چکے ہیں۔ آپ کی اہلیہ نیلوفر سلطانہ صاحبہ میرٹھ کے تحصیلدار حشمت اللہ خاں صاحب کی صاحبزادی ہیں جو ۱۹۵۴ء میں ہمسفر بنیں۔ اولاد میں عمران احمد، غزالہ، ریاض احمد، یحییٰ احمد، احمد کوثر، شادمان خالد اور سعد احمد ہیں۔

خالد احمد صاحب کو تصوف سے گہرا شغف ہے۔ آپ کے والد محمد احمد صاحب نقشبندی مجددی سلسلے کے بزرگوں میں تھے۔ کئی مرتبہ آقائے دوجہاں رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ان کو زیارت ہوئی۔ والدہ قادری سلسلے سے وابستہ تھیں۔ وہ بھی زہد وتقویٰ اور پرہیزگاری میں بہت آگے تھیں۔ ان کو یہ بڑی سعادت حاصل رہی کہ ہر پیر کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوتی تھی۔ اپنے مرشد محترم صہیب العدروس رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت شیخ عبدالقادر گیلانی رحمتہ اللہ علیہ کو ہمراہ دیکھتی تھیں۔ خالد صاحب کے والد کو ایک پیالہ بھی عطا ہوا تھا۔ اس پیالے کے علاوہ خالد صاحب کے پاس کئی تبرکات ہیں جن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دو موئے مبارک، خانہ کعبہ کے غلاف کا ایک بڑا ٹکڑا اور حضرت غوث الاعظم رحمتہ اللہ علیہ کے مزار مبارک کی چادر کا حصہ شامل ہیں۔ ان تبرکات کا اہتمام بارہ ربیع الاول کو ہوتا ہے۔

محترم خالد احمد نہایت خاموشی سے خلق خدا کو فیض پہنچا رہے ہیں۔ حضرت ابوخلیل خان محمد رحمتہ اللہ علیہ سے بیعت ہیں اور اپنے مرشد اور والد سے اجازت یافتہ ہیں۔ ضرورت مند اور مریض موصوف سے رجوع کر کے فیض حاصل کر رہے ہیں۔ مسجد ختم نبوت میں ہر جمعہ کو بعد نماز عصر ختم خواجہ خواجگان بھی کراتے ہیں۔ لاتعداد عمرے اور دو مرتبہ حج کی سعادت سے بھی مشرف ہو چکے ہیں۔

ایف۔ یو۔ احمد

فصیح الدین احمد

عمر کے کسی بھی حصہ میں کوئی کام وجہ افتخار بن سکتا ہے لیکن بچپن میں کوئی بچہ کوئی ایسا کام کر جائے جو تاریخ کا حصہ بن جائے تو اسے عطیہ خداوندی ہی کہا جائے گا۔ فصیح الدین احمد کا شمار ایسے ہی خوش نصیب اشخاص میں ہوتا ہے۔ موصوف نے تحریک پاکستان کے دور میں علی گڑھ میں بچہ مسلم لیگ کی بنیاد رکھی تھی جس کے اثرات ملک کے دوسرے علاقوں میں بھی ظاہر ہوئے۔

فصیح الدین احمد صاحب کے والد رشید الدین احمد مرحوم ممتاز دانشور ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد کے بھائی تھے۔ اس فیملی کا تعلق میرٹھ کے قدیم زبیری خاندان سے ہے۔ فصیح صاحب کے دوسرے بھائی ایڈمرل یو۔ اے۔ سعید اور ولی الدین احمد ہیں۔ آپ کی ولادت ۱۹۲۹ء میں علی گڑھ میں ہوئی۔ وہیں اسکول سے یونیورسٹی تک کی تعلیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں حاصل کی۔ ۱۹۴۹ء میں بی ایس سی (الیکٹرک انجینئرنگ) کرنے کے بعد پاکستان آئے۔ زمانہ طالب علمی میں غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی پیش پیش رہے۔ خطابت کا بیحد شوق تھا۔ ایک اہم تقریری مقابلے میں ہیرلڈ کاکس پرائز حاصل کیا۔ ۱۹۴۸ء میں یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین کے نائب صدر منتخب ہوئے۔ اس وقت یونین کا صدر وائس چانسلر ہوتا تھا جبکہ طلباء نائب صدر کا انتخاب کرتے تھے۔

فصیح الدین احمد صاحب بتاتے ہیں کہ تحریک پاکستان کے ایام میں میری عمر ایسی نہ تھی کہ مسلم لیگ کا ممبر بنتا یا مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن سے وابستہ ہوتا۔ فضا میں پاکستان کے نعرے تھے، قائداعظم سے محبت تھی اور مسلم لیگ کے لیے سب کچھ کر گزرنے کا جذبہ تھا۔ میں بچہ تھا اور دوسرے ساتھیوں کی طرح متفکر تھا کہ کیا کیا جائے؟ اور کیسے کیا جائے؟ ۱۹۴۴ء میں اس پر غور وفکر کے لیے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ہائی اسکول کے طلباء کی ایک میٹنگ ہوئی جس میں بچہ مسلم لیگ کے قیام کا فیصلہ ہوا۔ ہم نے قائداعظم سے رابطہ کیا اور ان سے صدارت کی درخواست کی۔ قائداعظم نے صدارت سے معذرت کرتے ہوئے لکھا کہ وہ آل انڈیا مسلم

لیگ کے صدر ہیں اس لیے وہ کسی دوسری تنظیم کی صدارت قبول نہیں کر سکتے۔ اسی خط میں انہوں نے ہدایت کی کہ تعلیم حاصل کریں، نظم و ضبط کو قائم رکھیں اور مسلم لیگ کا پیغام دوسروں تک پہنچائیں۔ بچہ مسلم لیگ کی دوسری میٹنگ میں قائداعظم کو سرپرست بنانے کا فیصلہ ہوا۔ فصیح صاحب نائب صدر منتخب ہوئے۔ فصیح الدین احمد صاحب نے قائداعظم کو مطلع کیا۔ قائداعظم نے سرپرستی قبول فرمالی۔ بچہ مسلم لیگ نے قائد کے ارشادات کی روشنی میں مسلم لیگ کے مقاصد کے لیے کام کیا اور تعلیم پر بھی توجہ مرکوز رکھی۔ قائداعظم نے بچہ مسلم لیگ کے اراکین کے ساتھ گروپ فوٹو بھی بنوایا جس میں شامل ذمہ داران مسلم یونیورسٹی کی یونیفارم پہنے ہوئے تھے۔ علی گڑھ بچہ مسلم لیگ کی سرگرمیاں "ڈان" دہلی میں باقاعدگی سے شائع ہوتی تھیں۔ اس لیے دوسرے علاقوں کے بچوں میں بھی یہ تحریک نہ صرف مقبول ہوئی بلکہ پروان چڑھی۔ دہلی میں حکیم محمد سعید شہید نے بچہ مسلم لیگ کو منظم کیا جس نے فعال کردار ادا کیا۔

فصیح الدین احمد صاحب نے علی گڑھ سے پندرہ روزہ اخبار "پاکستان ٹائمز" جاری کیا جس کے ایڈیٹر اور پبلشر رہے۔ پنجاب مسلم لیگ کے رہنما میاں افتخار الدین مرحوم نے فصیح صاحب کو بتایا کہ قائداعظم نے انہیں ہدایت کی ہے کہ وہ لاہور سے انگریزی روزنامہ نکالیں جو مسلم لیگ کا ترجمان ہو۔ میاں صاحب کو نام کی تلاش تھی۔ فصیح صاحب نے پاکستان ٹائمز ان کے نام منتقل کر دیا۔ جس کے بعد پاکستان ٹائمز نے لاہور سے اشاعت کا آغاز کیا۔

فصیح الدین احمد صاحب کی اپنے شعبہ سے گہری وابستگی ہے۔ آپ پرل انجینئرنگ (پرائیویٹ) لمیٹڈ کے چیئرمین ہیں۔ یہ ادارہ آپ نے ۱۹۷۲ء میں قائم کیا تھا۔ اپنی پیشہ ورانہ مہارت کے سبب فیڈریشن آف انسٹی ٹیوٹ آف انجینئرز کی سینٹرل کمیٹی کے رکن بھی منتخب ہوئے۔ سر شاہ سلیمان ایوارڈ، لیاقت میموریل گولڈ میڈل اور پاکستان سوومنٹ ٹرسٹ کا گولڈ میڈل حاصل کر چکے ہیں۔ یورپ اور مشرق وسطیٰ کے ممالک کی سیاحت بھی مشاغل میں شامل رہی ہے۔

آپ کی شادی نواب وقار الملک کے صاحبزادے نواب مشتاق احمد کی صاحبزادی محترمہ صفدر جہاں سے ۱۹۵۴ء میں ہوئی۔ اولاد میں ایک صاحبزادے سیفی احمد اور دو بیٹیاں شیریں (کینیڈا) اور سائرہ (امریکہ) ہیں۔

عقیل احمد صدیقی

عقیل احمد صدیقی

عقیل احمد صدیقی کے والد محکمہ پولیس میں افسر تھے۔ وہ اپنے فرائض کی بجا آوری کے سلسلے میں میرٹھ سے ملحقہ حلقوں میں رہے۔ ۱۹۲۵ء میں وہ مظفرنگر میں تعینات تھے۔ وہیں جس بچے کی ولادت ہوئی وہ عقیل احمد صدیقی ہیں جن کی ادبی خدمات کے حوالے سے زیر نظر کتاب کا حصہ ہیں۔

عقیل احمد صدیقی کی تعلیم و تربیت اہتمام سے ہوئی۔ بی۔ اے اور ایل ایل بی (فرسٹ کلاس) کرنے کے بعد صوبے کے پبلک سروس کمیشن کے امتحان میں شریک ہوئے۔ اس مقابلے میں ۶۱۹ امیدواروں میں تیرہویں اور مسلمانوں میں دوسری پوزیشن حاصل کر کے ۱۹۳۶ء میں تحصیلدار مقرر ہوئے۔ تحصیلداری کے دوران قائم مقام ڈپٹی کلکٹر بھی رہے۔ بعد ازاں ہجرت کر کے ۱۹۵۲ء میں اپنے افراد خاندان کے ہمراہ پاکستان آئے اور کراچی کو مستقر بنایا۔ اسی سال حکومت سندھ نے آپ کا تقرر بطور مختار کار (تحصیلدار / مجسٹریٹ) حیدرآباد میں کیا۔ ۱۹۵۶ء میں حکومت پاکستان نے ڈپٹی کلیم کمشنر منٹگمری (ساہیوال) بنایا۔ دوران ملازمت ڈپٹی کسٹوڈین آف ایویکیو پراپرٹی پشاور اور ڈیرہ اسماعیل خان ڈویژنز رہے۔ لاہور میں ڈپٹی کلیم کمشنر کے فرائض سنبھالے۔ اس محکمے کے ختم ہونے کے بعد محکمہ کے ملازمین دوسرے اداروں میں بھیجے گئے۔ ۱۹۶۳ء میں صدیقی صاحب نے ادارہ ترقیات کراچی میں فرائض کی ذمہ داری قبول کی۔ اس ادارے میں ڈپٹی چیف ایڈمنسٹریٹو آفیسر، ڈائریکٹر لینڈ، ڈائریکٹر ہاؤسنگ مینجمنٹ اور آخر میں سیکریٹری رہے۔ ۱۹۸۶ء میں ریٹائر ہو کر گوشہ نشین ہو گئے۔ مطالعہ اور شعر گوئی مشاغل میں شامل ہیں۔ اولاد میں پانچ بیٹے اور چار بیٹیاں ہیں جو سب خوشحال زندگی گزار رہے ہیں۔

عقیل احمد صدیقی شہرت سے بے نیاز ہیں۔ مختلف اصناف میں شعر کہتے ہیں۔ آپ کے کلام میں اصلاحی پہلو نمایاں ہے۔ کبھی کبھی طنز و مزاح میں بھی جولانی طبع کے جوہر دکھاتے ہیں۔ نمونہ کلام [illegible]

روز ازل سے آج تک دیکھ رہا ہے یہ فلک　　حسن کی دل ربائیاں، عشق کی [illegible]

زندہ ہوں اس امید پہ رنگ بھی تو لائیں گی　　میری وفا شعاریاں، آپ کی [illegible]

تغافل نے ترے جو غم دیئے ہیں　　میری خوشیوں میں وہ مدغم نہ ہوں گے
اگر میں جاں بھی اپنی نذر کر دوں　　وہ میرے پھر بھی اے ہمدم نہ ہوں گے

رباعیات

غم و اندوہ سے گھبرا گیا ہوں　　میں سورج تھا مگر گہنا گیا ہوں
ہوائے گرم سے صحن چمن کی　　مثال غنچہ میں مرجھا گیا ہوں

دہر میں کوئی باوفا نہ ملا　　ہم نوا، درد آشنا نہ ملا
جھلملانے لگا ستارۂ جاں　　تجھ سے اے زیست کچھ صلا نہ ملا

مناجات

تیرے ذکر میں جو رہے سدا، اے خدا مجھے وہ زباں ملے
تیرا شکر ہو، تیری ہو ثنا، مجھے حب شاہ زماں ملے
کسی جا قیام و قعود ہو، کبھی تیرے آگے سجود ہوں
مجھے اے خدا وہ تڑپ ملے، مجھے ایسا درد نہاں ملے

ڈاکٹر رگھوویر شرن "متر"

ڈاکٹر رگھوویر شرن بہت سی صفات کے حامل ایک مقبول شخص تھے۔ انہوں نے کئی شعبوں میں انتھک محنت کر کے لوگوں کو متاثر کیا۔ رگھوویر شرن کی خدمات کے اعتراف میں بھارت کی مختلف صوبائی حکومتوں اور مرکزی حکومت نے اعزازات سے نواز کر ان کو خراج تحسین پیش کیا۔

ڈاکٹر رگھوویر شرن ۹ر ستمبر ۱۹۱۱ء کو میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد لالہ ناتک چند نے زندگی بھر اپنے دیش اور سماج کی توجہ کے ساتھ خدمت کی۔ رگھوویر شرن اپنے والد کے نقش قدم پر چلے۔ انہوں نے شہریوں کی خدمت کو اپنا معمول بنایا ہوا تھا مگر ان کی شہرت کا بڑا سبب ان کی ہندی شاعری تھی جس میں انہیں کمال حاصل تھا۔ وہ متر تخلص کرتے تھے جس کے معنی دوست ہیں۔ ابھے گپت نے اپنے مضمون میں ان کی ہندی شاعری کی خصوصیات پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کی شاعری میں وطن سے محبت، سماجی امور اور تاریخی حوالوں کے ساتھ انسانی جذبات و محسوسات کی گہرائی ملتی ہے۔ ڈاکٹر رام کمار ورما نے شعری حوالے سے بتایا ہے کہ ان کی شاعری میں زندگی کے خد و خال بہت نمایاں ہیں۔ انہوں نے مایوسی کے خلاف جد و جہد کی اور حوصلہ اور امید کے چراغ روشن کیے۔ ان کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہندی زبان و ادب کے حوالے سے اگر دوسرے لوگ کچھ نہ بھی لکھتے تو صرف ڈاکٹر رگھوویر شرن کا نام و کام ہی میرٹھ کے لیے بہت ہے جنہیں پورے ملک میں عزت و احترام حاصل تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے ناٹک بھی لکھے ہیں۔ ان کی تخلیقات چلتے تارے، آگ اور پانی، اوس کے آنسو، پرانے پیڑ نئے پتے، امر ہے یہ دیش، بھوی کے بھگوان، مہا پرش اور سنو بچو بہت مشہور ہیں۔

شری رگھوویر شرن کی اعلیٰ خدمات کے اعتراف میں آگرہ یونیورسٹی نے ڈاکٹریٹ کے اعزاز سے نوازا۔ حکومتِ ہند نے اپنا قومی اعزاز "پدم شری" بھی عطا کیا۔ ان کے علاوہ راجستھان ساہتیہ اکیڈمی نے بھارتیہ میرا ایوارڈ، حکومت اتر پردیش نے پریم چند ایوارڈ، حکومت مدھیہ پردیش نے دشنو ناتھ ایوارڈ اور ہریانہ حکومت نے بھارتیہ سر ایوارڈ سے ان کی حوصلہ افزائی کی۔

متر جی کی ایک اور اہم خدمت میرٹھ کے مشہور نوچندی میلہ کے موقع پر مجلّہ کی اشاعت کی جد و جہد تھی جو کامیاب ہوئی۔ انہیں کی ادارت میں میلہ نوچندی کا پہلا مجلّہ ۱۹۸۲ء میں منظر عام پر آیا۔ اس مجلّہ کی تقریب اجراء بھی بڑے اہتمام سے ہوئی۔ اس مجلّہ میں ایک گوشہ اردو میں بھی ہوتا ہے۔ مجلّہ میں میرٹھ کے بارے میں ممکنہ معلومات کے علاوہ وہاں کی ادبی، سماجی اور تفریحی سرگرمیوں پر بھی روشنی ڈالی جاتی ہے۔ یہ ہر سال میلہ کے موقع پر شائع ہوتا ہے۔

ڈاکٹر رگھوویر شرن ۲۶ر فروری ۱۹۹۳ء کو میرٹھ میں رخصت ہوئے۔ ان کی یاد میں منعقد ہونے والے متعدد اجتماعات میں انہیں خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ (مجلّہ میلہ نوچندی، ۱۹۹۳ء)

قاضی عقیل احمد

قاضی عقیل احمد

قاضی عقیل احمد خلف قاضی محمد احسان الحق بن قاضی وہاج الدین کا آبائی وطن میرٹھ ہے۔ آپ کے والد اپنی مصروفیات کی وجہ سے بجنور میں مقیم تھے، وہیں ۱۹۱۹ء میں قاضی عقیل احمد صاحب کی ولادت ہوئی۔ آپ نے تعلیمی مراحل بجنور، میرٹھ اور کاسگنج میں طے کرتے ہوئے ۱۹۳۰ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی۔اے کی سند حاصل کی۔ یہ دور تحریکوں کا تھا۔ آپ بھی ان سے الگ نہ رہ سکے اور مسلم لیگ کے لیے مقدور بھر کام کیا۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان کے قیام کے بعد سکونت ترک کر کے کراچی آئے اور اسی سال کنٹرولر ملٹری اکاؤنٹینٹ میں شمولیت اختیار کی۔ مختلف حیثیتوں میں فرائض انجام دیتے ہوئے ۱۹۸۰ء میں ریٹائر ہوئے۔ دوران ملازمت پاکستان کی پہلی قومی اسمبلی میں وزیر تعلیم کے مشیر رہنے کا اعزاز بھی آپ کو حاصل ہے۔

۱۹۸۰ء میں سرکاری امور سے فراغت حاصل کر کے لکھنے لکھانے کے مشغلے میں منہمک ہوئے۔ موصوف کی بیس سے زائد کتب شائع ہو چکی ہیں جن میں سے "عہد رسالت" کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ یہ کتاب محکمہ تعلیم سے منظور ہوئی اور پاکستان آرمی نے بھی خریدی۔ آپ کی کئی کتب حکومت سندھ کی لائبریریوں کے لیے بھی منظور ہوئیں۔

عقیل صاحب نے زندگی کی مختلف جہتوں میں دلچسپی لی۔ آپ کی مصروفیات میں سیاحت بھی شامل ہے۔ پاکستان کے شمالی علاقوں میں ہر سال جاتے ہیں۔ دو مرتبہ عمرے کے علاوہ برطانیہ، جرمنی، ترکی، ہالینڈ اور بلجیم کا سفر کر چکے ہیں۔ سادگی سے زندگی کے ایام گزار رہے ہیں۔

آپ کی ازدواجی زندگی بھی پُر سکون ہے۔ ۱۹۵۵ء میں میمونہ بنت قاضی محمد احمد صاحب سے آپ کی شادی ہوئی جن کے بطن سے راشد عقیل، شاہین جمال مسرت، ساجد عقیل، شہلا جمال مسرت اور قاضی محمد ماجد عقیل ہیں۔ راشد عقیل ایڈیشنل ڈائریکٹر ادارہ ترقیات کراچی اور ماجد عقیل بلڈنگ کنٹرول میں انسپکٹر ہیں۔ ساجد عقیل انتقال کر چکے ہیں۔ ۱۹۹۳ء میں عقیل احمد صاحب کی اہلیہ بھی مالک حقیقی سے جا ملیں۔

پنڈت گوری دت شرما

پنڈت گوری دت شرما میرٹھ کی ان شخصیات میں شامل ہیں جنہوں نے اپنی تمام زندگی خدمت میں گزاری۔ آج بھی ہندی زبان و ادب کے فروغ کے لیے ان کی کوششوں کو نہایت احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

شرما جی ۱۸۳۶ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۰۵ء میں پرلوک سدھارے۔ ہندی کے مشہور مورخ پنڈت رام چندر شکل نے اپنی مشہور تصنیف میں ان کی خدمات کو زبردست خراج تحسین پیش کیا ہے۔ پنڈت گوری دت شرما ہندی کے فروغ کے لیے کوششیں کرنے والوں کی اولین صف میں شامل ہیں۔ ''دیو ناگری'' کا پیغام پہنچانا ان کا مقصد حیات تھا۔ اپنے مشن کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے انہوں نے کئی تعلیمی ادارے قائم کیے جن میں سے ایک آج دیوناگری پوسٹ گریجویٹ کالج کی شکل میں موجود ہے۔ یہ ان کا بڑا کارنامہ قرار دیا جاتا ہے جس کے لیے شرما جی نے انتھک محنت کی تھی۔

پنڈت گوری دت شرما ادب سے بھی گہرا تعلق رکھتے تھے۔ وہ ایک اچھے ادیب اور جانے پہچانے شاعر بھی تھے۔ ان کی تخلیقات اپنے وقت کے مشہور رسائل میں اہتمام سے شائع ہوتی تھیں۔ اپنی قلمی کاوشوں کے ذریعے بھی انہوں نے اپنے مقصد کو حاصل کرنے کی جدوجہد کی۔ ان کی منظومات بڑے شوق و ذوق سے پڑھی جاتی تھیں۔

میرٹھ میں واقع سورج کنڈ میں ان کی سمادھی اور دیوناگری پوسٹ گریجویٹ کالج کے ایک حصہ میں موجود ان کی مورتی میرٹھ کے شہریوں کی طرف سے ان کی خدمات کے اعتراف کی نمایاں علامت ہیں جنہیں دیکھ کر شہری محسوس کرتے ہیں کہ خدمت میں ہی عظمت کا راز پوشیدہ ہے۔

میرٹھ مانس، ص ۱۰۷، ۱۰۸

ہری شرن شری واستو مرال

میرٹھ کے تاریخی اور ادبی منظر پر مرال جی کی شخصیت نمایاں ہے۔ ان کی نگاہ محدود نہیں تھی۔ انہیں ہندوستانی تاریخ کا بھی علم تھا اور خود انہوں نے ہندوستانی تاریخ کے کئی اہم دور بھی دیکھے تھے۔ دوراندیشی اور شعور کی پختگی ان کی تحریروں میں واضح نظر آتی ہے۔ وہ بڑے اخلاص کے ساتھ قوم کی خدمت کے لیے ہر وقت کمربستہ رہتے تھے۔

مرال جی کی ہندی شاعری ہندی ادب کا اثاثہ سمجھی جاتی ہے۔ میرٹھ اور اس کے نواح میں بولی جانے والی کھڑی بولی اور برج بھاشا دونوں میں ان کو کمال قدرت حاصل تھی۔ دونوں زبانوں کا امتزاج ان کی شعری تخلیقات کو اہم بناتا ہے۔ شری پربھودت سوامی نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ برج بھاشا اور کھڑی بولی میں اظہار پر ان کو مکمل دسترس حاصل تھی۔

شری ہری شرن مرال ۱۹۱۸ء سے ۱۹۳۰ء تک میرٹھ کے ادبی افق پر چھائے رہے۔ ملک گیر سطح پر بھی مرال جی کی نظموں کو شہرت ملی اور بے حد پسند کی گئیں۔ ۱۹۶۱ء میں دہلی میں منعقدہ ہندی ساہتیہ سمیلن میں انہیں اعزاز سے نوازا گیا۔ مرال جی کے لکھے ہوئے دوہے ملک کے بیشتر لوگوں کے حافظے میں محفوظ ہیں۔

مرال جی ایک مشہور اور کامیاب شاعر کے ساتھ ناٹک نویس بھی تھے۔ پرتھوی راج کے عنوان سے لکھا ہوا ان کا ناٹک بہت مشہور ہوا۔ تاریخ نویس کی حیثیت سے بھی انہیں امتیاز حاصل ہے۔ کاسمو جاتی کی لکھی ہوئی تاریخ سے ان کے وسیع مطالعے اور تنقیدی شعور کا پتہ چلتا ہے۔

اس ہمہ جہت شخصیت کی لکھی ہوئی کتب میں پانچ شائع ہو چکی ہیں اور چار غیر مطبوعہ ہیں۔ شائع ہونے والی کتابوں میں بال ونشو دیو ہیم، شویودھ، ہنگیری سندیش اور ہریش چندر چاروں گرنتھ ہیں۔ ناٹک بھی منظر عام پر آچکا ہے۔ شیویا پرارتھنا تھک اور چندر ناٹک بھی گرنتھ ہیں اور ابھی تشنہ طباعت ہیں۔

میرٹھ مانس، ص ۱۰۸

ڈاکٹر نزہت اکرام

ڈاکٹر نزہت اکرام

ڈاکٹر سلطان زماں نزہت اکرام نے جامعہ پنجاب، لاہور سے سوشل ورک اور اردو میں ایم۔اے اور پی۔ایچ۔ڈی کی تکمیل کی۔ صحافت اور شعروادب انہوں نے ورثہ میں پایا ہے۔ ان کے دادا مولانا احمد حسن شوکت میرٹھی ملک کے نامور شاعر وصحافی تھے۔ ان کے احسن المطابع میرٹھ سے اخبار شحنۂ ہند اور رسالہ پروانہ خدمت ادب اردو کے علاوہ انگریز سامراج اور قادیانیت کے خلاف نبرد آزما رہے۔ دیگر ہم عصر رسائل واخبارات میں بھی ان کے رشحات قلم کی بڑی طلب تھی۔ کلام غالب کی اولین شرح اور بیدل وخاقانی کے قصائد کی شروح بھی ان کے تبحر علمی پر دال ہیں۔

ڈاکٹر نزہت اکرام کے بڑے تایا مولانا شیث احمد جودت میرٹھی ملک کے جید عالم اور خطیب تھے۔ دوسرے تایا مولانا ندرت میرٹھی ممتاز شاعر اور آئینہ اخبار کے مدیر تھے۔ نزہت اکرام صاحب کے والد ہارون احمد جدت میرٹھی قادر الکلام شاعر ہونے کے علاوہ صحافی اور سماجی کارکن بھی تھے۔ انھوں نے کوئٹہ میں عیدالشعراء کی محفلوں کی خوب طرح ڈالی۔ بزم روح الادب راولپنڈی کے صدر ہے۔ مسلم لیگ میں بھی ان کی بڑی قدر ومنزلت تھی۔

ایسے علمی ماحول میں آنکھ کھول کر نزہت صاحبہ نے اگر چھ سال کی عمر میں قرآن شریف ناظرہ کی تعلیم اپنی دادی جان محترمہ سے مکمل کی، والد صاحب کی تربیت سے آٹھ سال کی عمر میں کہانیاں لکھیں، نو سال کی عمر سے شعر کہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ انھوں نے سولہ سال کی عمر میں ماہنامہ صبح درخشاں کی ادارت سنبھالی، ان کے مضامین، افسانے، غزلیات مسلسل، عفت، تعمیر، نئی قدریں اور دیگر ادبی رسائل میں شائع ہوتے رہے۔ برسوں روزنامہ کوہستان، مشرق، جاوداں نیز ہفت روزہ استقلال اور ثالث سے منسلک رہیں۔ اخبارات میں ان کی "خاتون کی ڈائری" اور "ہم نے دیکھا" کے عنوان سے کالموں میں ان کا قلم ملکی سماجی اور معاشرتی مسائل کی نشاندہی کرتا رہا۔ ساتھ ساتھ ڈاکٹر سلطان زماں کے نام سے ان کے دینی مقالات بھی شائع ہوتے رہے۔

ڈاکٹر نزہت اکرام کے پانچ اصلاحی معاشرتی ناول ساحل سے دور، سرد جہنم، کانٹوں بھری گود، انسان زندہ ہے اور دل اک ویرانہ، ایک شعری مجموعہ "تصویر گلستان"، سیرت پر دو کتب فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، تنقیدی مقالات کے مجموعے غالب کے طرفدار نہیں اور عورت اور اسلام، افسانوں کا مجموعہ "اشک وتبسم" کے علاوہ بچوں کے لئے دس ناول، متعدد کہانیاں اور نظمیں، مختلف کتب پر تبصرے شائع ہو کر قبول عام پا چکے ہیں۔ گزشتہ سال حج کی سعادت سے بہرہ اندوز ہونے کے بعد دعاؤں کا ذخیرہ مرتب کیا جس میں اپنا نعتیہ کلام میں شامل کیا۔

انسان زندہ ہے: ڈاکٹر نزہت اکرام

حج کی دعائیں اور اہمیت: ڈاکٹر نزہت اکرام

ابتداء سے ہی علم وادب کی خدمت کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر نزہت اکرام کی توجہ سماجی وفلاحی کاموں کی طرف بھی رہی۔ محترمہ چھ سال تک اپواکی آرگنائزنگ سیکریٹری رہیں۔ ملک کے طول وعرض میں دیہات کے دورے کئے۔ کونسل دیہی خواتین کی سیکریٹری، اتحاد پاکستان کی صدر اور سوشل ویلفیئر پنجاب بورڈ رہ کر مدارس، صنعتی مراکز، نونہال کلب قائم کئے۔ جامعۂ اکرام اور اکیڈیمی کے ذریعے دینی اور عمومی تعلیم کا اہتمام کیا۔ شوکت اکیڈیمی کے تحت اشاعت دین وادب میں سرگرم رہیں۔ جدت گرلز ہائی اسکول قائم کیا جو ایک مثالی ادارہ ہے۔ نزہت صاحبہ کی خدمات "لٹریسی اینڈ ماس ایجوکیشن کمیشن" سے برسوں وابستہ رہی ہیں، جہاں بطور ریسرچ آفیسر پھر اس کے ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ میں ماسٹر ٹرینرز بعد ازاں ڈائریکٹر کے طور پر انتھک کام کیا۔ نصاب سازی اور تربیتی کورس ترتیب دینے میں نمایاں کام کیا۔ اس سلسلے میں یونیسکو کے تحت مختلف ورکشاپ، سیمینار اور تربیتی کورس وغیرہ میں پاکستان کی نمائندگی کرتے ہوئے بیرونی ممالک کے دورے کئے جو ملک کے وقار میں اضافے کا سبب بنے۔

ڈاکٹر نزہت اکرام ایک باعمل خاتون ہیں۔ ان کی شادی ایک مثالی شادی تھی جس میں جہیز اور بری کا نام نہ تھا، سوائے قرآن مجید کے ایک نسخے اور ایک مصلے کے۔ یہی ان کی شادی کے لئے شرط تھی۔ اس ضمن میں موصوفہ کا ایک خط "بیٹی کا خط ماں کے نام" فرسودہ روایات اور نمود و نمائش کے خلاف، صبح درخشاں کے علاوہ ملک کے متعدد رسائل و اخبارات میں شائع ہو کر بہت مشہور ہوا تھا۔ جناب اکرام رانا نے وقت کے اس چیلنج کو قبول کر کے شادی کی تھی۔ وہ خود بھی نہایت دردمند انسان اور معروف صحافی تھے۔ فلسفہ، اردو اور صحافت میں ایم۔ اے کر کے صحافت سے ہی منسلک رہے۔ ان کی تحریر ہمیشہ جرات و بیباکی سے حقیقت کا اظہار کرتی تھی۔

ڈاکٹر نزہت اکرام کو قدرت نے چار مرتبہ ماں بننے کا شرف عطا کیا لیکن اب اولاد کے نام پر صرف ایک بیٹا احمد اکرام ہے، جسے رحمت خداوندی نے ایک بیٹی ازما مرحمت کی ہے۔ ڈاکٹر صاحبہ لاہور میں مقیم ہیں۔ نمونہ کلام پیش خدمت ہے۔ اختصار کو میری مجبوری سمجھئے چونکہ کوائف و کلام بہت تاخیر سے دستیاب ہوئے۔

نعت

اے ختم رسل ﷺ خاصۂ خاصانِ دوعالم — تو رونقِ کونین ہے تو جانِ دوعالم
ہے تجھ سے ہی تخلیقِ دوعالم کی حقیقت — ہے اسم مبارک ترا عنوانِ دوعالم
اے شانِ خدا، نورِ ہدیٰ، خلقِ مجسم — ہے بعد خدا تجھ پہ ہی ایمانِ دوعالم
اس درجہ دوعالم پہ ہوا افزونیٔ رحمت — کر تنگ ہو خود وسعتِ دامانِ دوعالم
نزہت مجھے محشر میں شفاعت کا یقیں ہے — میں بھی ہوں کنیزِ شہ شاہانِ دوعالم

غزل

اتنا اثر ہو کم سے کم میرے لبِ خموش میں — آئیں وہ اپنے ہوش میں، جو ہیں فریبِ ہوش میں
ہائے جہانِ شوق پر کیسا سکوت چھا گیا — آہ بھی گھٹ کر رہ گئی میرے دلِ خموش میں
میں بھی ہوں محوِ بے خودی دل بھی ہے وقفِ خامشی — میں بھی ہوں اپنے ہوش میں، دل بھی ہے اپنے ہوش میں
شوقِ جنوں نواز اب عقل و خرد کو خیر باد — ہم نے بھی ہوش کھو دیئے ہم بھی ہیں اپنے ہوش میں
نزہتِ غم سرشت کو لاکھ سکوتِ غم ملا — پھر بھی ہے جذبہ بیاں اس کے دلِ خموش میں

متفرق اشعار

بات میں بات تعلق ہے کوئی بات نہ پوچھ
سازِ ہستی سے نکلتے ہیں سسکتے نغمے
چشمِ حق بیں سے ذرا دیکھ لیا تھا نزہت

سن شکایات مگر وجہِ شکایات نہ پوچھ
مطربِ دہر کی بے کیفیٔ نغمات نہ پوچھ
کیسے اٹھے تھے حقیقت کے حجابات نہ پوچھ

کوئی آنکھ شعلہ کوئی دل پھپھولا
گلوں کے لبوں پہ فسردہ تبسم
عروجِ ہوا و ہوس پہ ہیں انساں

نیا دور رنگِ زماں دیکھتی ہوں
نہاں دیکھتی ہوں عیاں دیکھتی ہوں
میں پہنچیٔ اجل جہاں دیکھتی ہوں

اکرام احمد خاں

جی۔اے۔مدنی

خلیل الرحمٰن داؤدی

ڈاکٹر حسن منظر

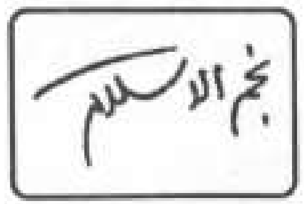

ڈاکٹر نجم الاسلام

خورشید وارثی میرٹھی

افضال منیف

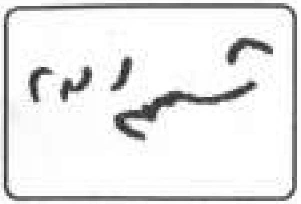

شمیم احمد

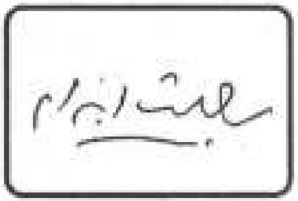

ڈاکٹر راحت ابرار

مقصود حسن

علی امام نقوی

مولف کی ادبی خدمات

مطبوعہ کتب

۱۔ اذکار وافکار (تذکرہ شعرائے لانڈھی کورنگی)
۲۔ نورِ سخن (غیر مسلم شعراء کے نعتیہ کلام کا انتخاب)
۳۔ صابر براری کی تخلیقات (شخصیت اور فن)
۴۔ بہر زماں بہر زباں ﷺ (غیر مسلم نعت گو شعراء کا عالمی تذکرہ)
۵۔ مشاہیر میرٹھ
۶۔ تذکرہ شعرائے میرٹھ
۷۔ شخصیاتِ میرٹھ

مرتبہ کتب

۱۔ مہر وماہ	:	انجم فوقی بدایونی
۲۔ فرازِ خودی	:	افتخار بدایونی
۳۔ جامِ طہور	:	صابر براری
۴۔ تاریخ رفتگاں	:	صابر براری
۵۔ اشکِ فروزاں	:	بدر فاروقی
۶۔ پانی پر نقوش	:	ڈاکٹر شریف طاہر
۷۔ چشمِ شوق	:	صابر براری

زیرِ ترتیب

۱۔ کراچی کے صاحبِ کتاب نعت گو شعراء
۲۔ غیر مسلم حمد گو شعراء
۳۔ عقیدت (غیر مسلم شعراء کا اہلِ بیت سے متعلق کلام)
۴۔ تذکرہ شعرائے طنز ومزاح

جانے والے کبھی نہیں آتے
جانے والوں کی یاد آتی ہے

تذکرہ شعرائے میرٹھ، مشاہیر میرٹھ اور شخصیاتِ میرٹھ کی تکمیل کے دوران کئی اہم شخصیات جہانِ فانی سے رخصت ہوگئیں۔ ان مقتدر صاحبانِ علم وفن میں ڈاکٹر نجم الاسلام، خلیل الرحمن داؤدی، پروفیسر کرار حسین، اختر حمید خاں، صلاح الدین، قدرت نقوی، نواب زادہ اکرام احمد خان، سید محمود حسن اشرف، حفیظ میرٹھی، مولانا حافظ فہیم الدین احمد، میر زاہد حسین، رابعہ نہاں، شمیم جے پوری، مظفر احمد ضیاء، مشتاق شارق، حشمت فضلی، سطوت میرٹھی، ادریس جمال، خالدہ ریاست، سید اختر الاسلام اور حافظ سرد هنوی صاحبان شامل ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہمارے ان تمام بزرگوں اور رفقاء کی کامل مغفرت فرمائے۔ آمین!

نور احمد میرٹھی

شخصیاتِ میرٹھ